تحقیق و مکالمہ پر مبنی علمی و فکری جریدہ

سالنامہ

خصوصی اشاعت

اسلام آباد

تحقیقات

TAHQIQAAT

2023

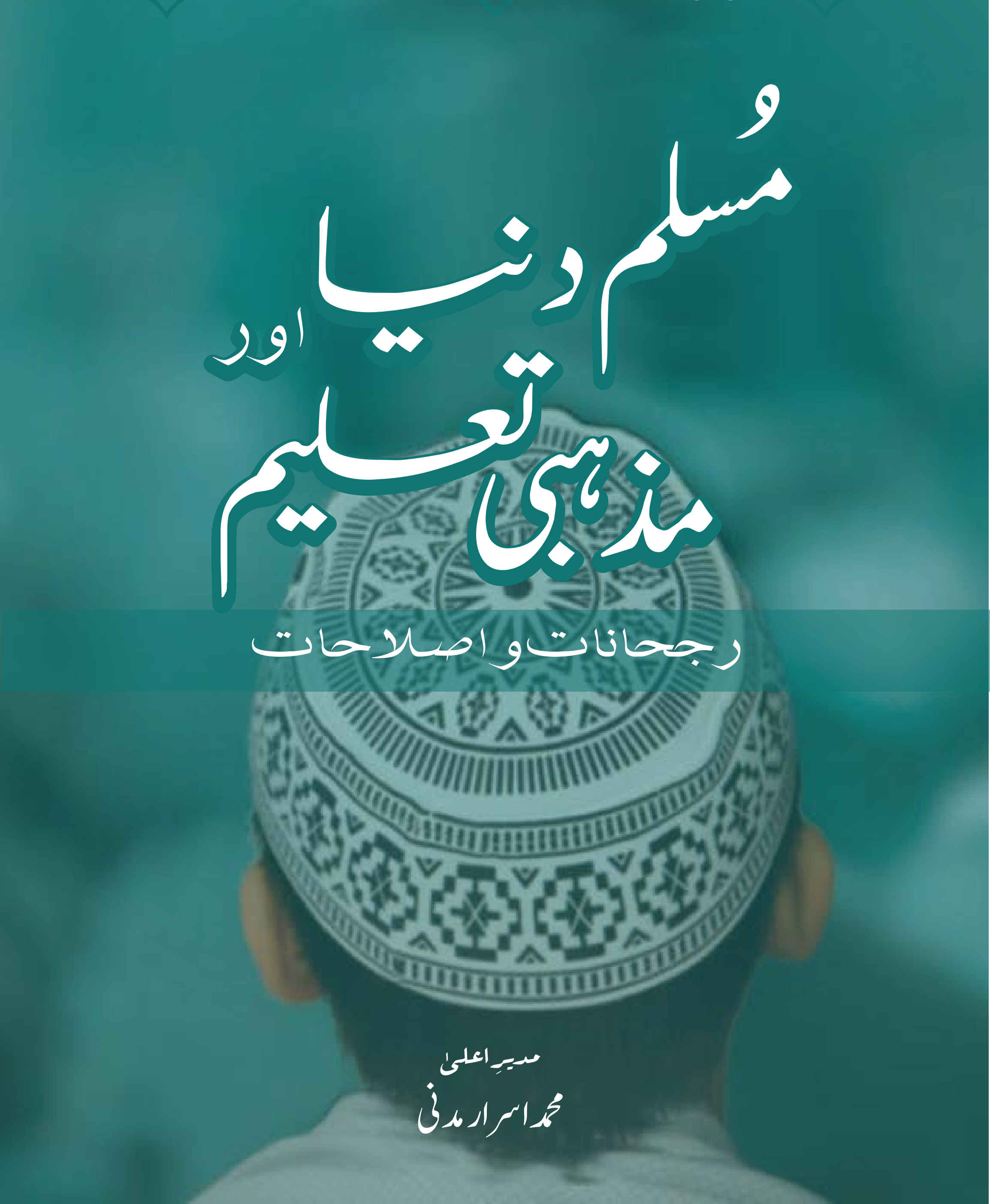

مُسلم دنیا اور مذہبی تعلیم

رجحانات و اصلاحات

مدیرِ اعلیٰ

محمد اسرار مدنی

گزشتہ شمارے

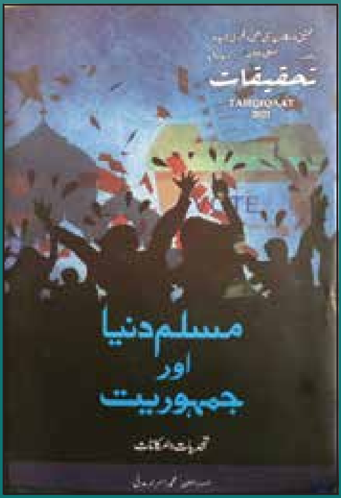

موجودہ شمارہ
ڈاؤن لوڈ کریں

تحقیق و مکالمہ پر مبنی علمی و فکری جریدہ

سالنامہ — اسلام آباد

تحقیقات

TAHQIQAAT

مسلم دُنیا اور مذہبی تعلیم

رُجحانات و اصلاحات

خصوصی اشاعت

2023

سرپرستِ اعلیٰ

پروفیسر ڈاکٹر قبلہ ایاز

مدیرِ اعلیٰ

محمد اسرار مدنی

مدیر

شفیق منصور

INTERNATIONAL RESEARCH COUNCIL FOR RELIGIOUS AFFAIRS
IRCRA
RELIGION FOR PEACE & DEVELOPMENT

انٹرنیشنل ریسرچ کونسل

برائے

مذہبی اُمور

اسلام آباد، پاکستان

+92 311 02 99 995

+92 51 27 26 805

اقرأ

ترتیب

پیش لفظ

پروفیسر ڈاکٹر قبلہ ایاز -------------- 7

مقدمہ

مسلم دنیا، اکیسویں صدی اور مذہبی تعلیم 11

مذہبی تعلیم: تعارف اور تاریخ

مسلم تاریخ میں مدارس دینیہ کا آغاز وارتقاء

ادارتی ٹیم --------------------- 19

برصغیر میں اسلامی تعلیم کی تاریخ

ڈاکٹر محمد قاسم زمان/ محمد جان اخونزادہ--- 30

استعماری عہد میں مسلم دنیا کا تعلیمی نظام اور اصلاحات کی شروعات

محمد اسرار مدنی-------------------- 37

'کالجز کا ظہور: اسلام اور مغرب میں تعلیم کے ادارے'

جارج مقدسی-------------------- 49

مسلم دُنیا میں مذہبی تعلیم

مسلم دُنیا میں مذہبی تعلیم اور ہم آہنگ نصاب: اقلیتی طبقات کے لیے حکومتی کاوشیں

محمد اسرار مدنی-------------------- 55

سعودی عرب: وژن 2030ء اور مذہبی تعلیم میں اصلاحات

ادارتی ٹیم --------------------- 71

جدید ترکی میں مذہبی تعلیم کی اُٹھان اور خصائص

ادارتی ٹیم --------------------- 82

جامعہ ازہر کے علمی تخصصات اور شعبے

حافظ غلام انور ازہری -------------- 91

تیونس اور مصر کے مذہبی ادارے اور تعلیم: ایک تقابلی جائزہ

شفیق منصور --------------------104

ایران کی دینی علمی روایت میں حوزوں کا کردار

مجتبی علی شجاعی------------------112

انڈونیشیا کے مذہبی ادارے اور قومی مرکزی دھارے میں ان کا کردار

ادارتی ٹیم ---------------------123

ملائشیا: ایک متنوع سماج میں مذہبی تعلیم کی نوعیت

رشاد بخاری --------------------129

مذہبی تعلیم کا بنگلہ دیشی ماڈل

تحمید جان ---------------------137

خواتین کی مذہبی تعلیم: رجحانات و تجربات

مسلم دُنیا میں خواتین کی تعلیم: شرح خواندگی اور معاشی ترقی کے تناظر میں

شفیق منصور --------------------147

خواتین کی تعلیم کے فروغ میں مدارس اور این جی اوز شانہ بشانہ: بنگلہ دیش کا منفرد ماڈل

رباب زینب--------------------155

ترکی میں خواتین کی دینی تعلیم: رجحانات اور خدمات

بشری علی --------------------160

انڈونیشیامیں مذہبی مدارس اور خواتین کی تعلیم: طالبان کے لیے سبق

محمد نیاز اسداللہ ------------------166

انڈونیشیامیں خواتین کی تعلیم: دورہ انڈونیشیا کے کچھ مشاہدات

حیا حریم ------------------------170

عصری اداروں میں مذہبی تعلیم

پاکستان کے مدارس اور عصری جامعات میں دینی علوم: بین الاقوامی اسلامی جامعات کے تناظر میں تقابل

مولانا ڈاکٹر نثار اختر ----------------179

تحریک پاکستان کی پہلی مسلم ایجوکیشن سکیم

ڈاکٹر اکرام الحق یاسین ------------187

عصری جامعات میں تقابل ادیان کے مروجہ کورسز اور ایک نئی کاوش

شمس الدین حسن شگری -----------237

اسکولوں میں اسلامیات کے نصاب اور طریقہ تدریس پر نظر ثانی کی ضرورت

ادارتی ٹیم ---------------------250

فروغِ امن کے لیے نصاب اور تعلیمی اصلاحات

ادارتی ٹیم ---------------------256

پاکستان میں مذہبی تعلیم کا نظام

مذہبی تعلیم سے وابستہ چند فکری پہلو

ڈاکٹر مولانا عمار خان ناصر ----------273

پاکستان میں دینی مدارس کے مسائل اور قابل اصلاح پہلو

سلیم منصور -------------------280

مدارس کے نصاب بارے مفکرین کی آراء

محمد اسرار مدنی------------------- 296

دینی تصورات اور سائنس کی تعلیم

ڈاکٹر سید محسن نقوی -------------- 305

مدارس میں سائنسی و عقلی علوم کی تدریس کے امکانات

محبوب احمد--------------------- 312

شاہ ولی اللہ اورینٹل کالج: مذہبی و عصری علوم کا ایک ماڈل ادارہ جس پر پابندی لگادی گئی

پروفیسر سید محمد سلیم -------------- 319

'مدرسہ ڈسکورسز' کا تعارف واہداف

حافظ محمد رشید------------------- 333

سال 2023ء کے چند نمایاں اقدامات 338

پیش لفظ

مسلم دنیا میں مذہبی تعلیم کا سلسلہ کوئی نیا نہیں ہے، یہ صدیوں پرانا نظام ہے جو ایک وقت میں شعور و ترقی پسندی کا معیار سمجھا جاتا تھا۔ مسلم دنیا کے مدارس نے انسانی تہذیب کو فروغ دینے میں جو کردار ادا کیا ہے اس کا مغرب کو بھی انکار نہیں ہے۔ البتہ پچھلے تین سو سالوں سے مسلم دنیا کے تعلیمی ادارے کہیں نہ کہیں تنزل کا شکار ہوئے ہیں جس کے اثرات مسلمانوں کے سیاسی، معاشرتی اور معاشی ڈھانچے پر بھی واضح نظر آتے ہیں۔ یہ جمود عمومی تعلیمی نظام کا خاصا تو ہے، مذہبی تعلیم بھی اس سے مستثنیٰ نہیں ہے۔ اس میں بھی شک نہیں کہ استعماری مرحلے میں مذہبی اداروں نے شاندار کام کیا اور ساری مسلم دنیا میں ایک تاریخ رقم کی۔ لیکن اس کے بعد وقت کے حساب سے جن اصلاحات کی ضرورت تھی اس میں ایک گونہ سستی رہی۔

مسلم دنیا کے کئی خطے ایسے ہیں جہاں مذہبی تعلیم کا کردار وقت کے ساتھ ارتقاپذیر ہوتا رہا۔ آج انڈونیشیا اور ملائشیا جیسے ممالک میں دینی اداروں کے فضلاء سیاست و سماج میں بڑا کام کر رہے ہیں۔ ترکی کا دینی نظام تعلیم بھی ایک بہت اچھا ماڈل ہے۔ بنگلہ دیش کے مدارس کئی پہلوؤں سے قابل تقلید ہیں۔ اسی طرح عرب دنیا میں مصر کے بعض مذہبی ادارے بھی نصاب اور طریقہ تدریس میں بہت عمدہ مثالیں ہیں۔ اس طرح کے ماڈل مدارس کے اندر زیر بحث آنے چاہیئں، تاکہ نظامِ تعلیم کے حوالے سے نئے اُفق کھل کر سامنے آئیں۔ مدارس کی نئی نسل میں کچھ کرنے کا بہت جنون ہے، انہیں راہیں دکھائی جائیں، رہنمائی کی جائے تو وہ وقت کے ساتھ بہترین مناہج پروان چڑھا سکتے ہیں۔

پاکستان میں دینی مدارس کا مسئلہ لمبے عرصے سے کئی حوالوں سے زیر بحث ہے۔ خصوصا پچھلی تین دہائیوں سے تو پوری دنیا میں اس پر بات ہو رہی ہے۔ خود مدارس کے اندر سے بعض اصلاحات کے لیے آوازیں سامنے آتی رہتی ہیں۔ پاکستان کے دینی مدارس مکمل طور پہ جمود کا شکار نہیں ہیں، جیسا کہ بعض حلقے تاثر دیتے ہیں۔ دینی مدارس کے نصاب میں ابتداء ہی سے از خود علماء مختلف ادوار میں وقت کی ضروت کے مطابق تبدیلیاں لاتے رہے ہیں۔ یوں یہ کہنا غلط نہ ہو گا کہ خود علماء میں احساس اور

ادراک ہے کہ حالات کے تناظر میں تبدیلیاں ناگزیر ہیں۔

بہت سی خوبیوں کے ہونے کے باوجود، ہر نظام میں مزید اصلاح کی گنجائش ہوتی ہے۔ایسے ہی پاکستان کے دینی مدارس اور عصری نظام تعلیم میں بھی باقی مسلم تجربات کو دیکھتے ہوئے، محسوس ہوتا ہے کہ کچھ اصلاحات ہونی چاہئیں۔ان میں سے بعض کا ذکر ضروری معلوم ہوتا ہے۔

تمام مدارس اور طلبہ کے لیے اگرچہ یہ ممکن نہ ہو مگر یہ لازم ہے کہ زیادہ تر مدارس میں تخصص کا کچھ سلسلہ شروع ہونا چاہیے۔اس کے لیے ضروری ہے کہ کچھ علماء حضرات اور خواتین عالمات کو جدید موضوعات کے بارے میں اس نقطہ نظر سے باقاعدہ تربیت دی جائے کہ عالمی مسائل، مطالبات اور تقاضوں کی روشنی میں وہ اپنے مؤقف کو مضبوط دلائل کے ساتھ اور مؤثر انداز میں پیش کرنے کے قابل ہوں۔بلاشبہ دینی مدارس، قرآن مجید اور حدیث کی تفہیم کا اہتمام بھی کرتے ہیں اور انہی کی وجہ سے نئی نسل اور دین کا تعلق برقرار ہے۔تاہم ضرورت اس امر کی ہے کہ قرآن کریم اور علوم اسلامیہ کو اصل عربی مآخذ کے ذریعے سمجھا جائے اور پھر علماء میں سے کچھ ایسے باصلاحیت لوگ ہوں جو انگریزی اور دوسری بین الاقوامی زبانوں میں یہ پیغام دنیا تک پہنچا سکیں۔اس ابلاغ میں عصری اور بین الاقوامی زبانوں کا محاورہ موجود ہونا وقت کا ایک اہم تقاضا ہے۔

اس پر بھی غور کرنے کی ضرورت ہے کہ جس طرح مغرب کے اندر استشراق ہے، ہمارے مدارس اور یونیورسٹیوں میں ایک چھوٹا سا مگر سنجیدہ شعبہ استغراب کا ہو، جس میں مغربی افکار، سوچ، مغربی تاریخ اور مغربی انسان کی نفسیات کا تحقیقی اور ناقدانہ مطالعہ کیا جاتا ہو۔اگرچہ اس وقت بھی ہم میں کچھ لوگ موجود ہیں جو اس نوعیت کا کام کرنا چاہتے ہیں۔ مرعوبیت کے مقابلہ میں ناقدانہ صلاحیت ہمارے لوگوں میں اب تک پیدا نہیں ہوئی، نہ اس طرف ہماری کوئی پیش رفت ہو رہی ہے۔اس لیے ضروری ہے کہ ہم اس طرف بھی متوجہ ہوں کہ مغرب نے مادی ترقی کیسے کی اور اس ضمن میں ان کے کیا افکار و حالات ہیں؟ ہمیں ان کی نفسیات اور افکار کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ یہ کوئی نئی چیز نہیں بلکہ میری رائے ہے کہ دینی مدارس میں اس کی جڑیں بہت گہری ہیں۔ مثلاً منطق کے علوم، ہیئت اور دیگر علوم، مثلاً اقلیدس اور ریاضی کے حوالہ سے ایک دور میں مغربی علوم سے دینی مدارس نے استفادہ کیا

اور ان کو سیکھا۔ امام غزالی اسی طرح علم فلسفہ کے ماہر بنے۔ گویا استغراب کی جڑیں دینی مدارس میں گہری ہیں۔ اس وقت ہمیں اس طرف متوجہ ہو جانا چاہیے۔

اسلامی تاریخ کے حوالے سے بھی ہماری مذہبی تعلیم میں کچھ کمی ہے۔ اسلامی تاریخ، بالخصوص سپین میں مسلمانوں کے عروج و زوال، صلیبی جنگیں، ہندوستان پر مسلمانوں کی حکومت اور زوال، نیز منگولوں کی آمد اور عباسی خلافت کا خاتمہ وغیرہ، سب بہت اہم موضوعات ہیں۔ جب تک ہمارے دینی سکالرز، علماء اور طلباء کو ان حالات کا پتا نہ ہو، وہ جدید دور میں اپنے راستے کا انتخاب نہیں کر سکتے۔ جب تک ہم اپنے ماضی کو صحیح طریقے سے اپنے سامنے نہ رکھیں اور عروج و زوال کے اسباب کا کھوج نہ لگائیں، غیر مسلموں کی کوششوں کا تحقیقی اور تنقیدی مطالعہ نہ کریں اور خود اپنے گریبان میں نہ جھانکیں، ہم اپنے لیے درست سمت کا تعین نہیں کر سکتے۔

ایک اور اہم بات جو اس وقت ہماری ضرورت ہے وہ یہ کہ مذہبی تعلیم میں اختلاف رائے اور تعبیری تنوع کو باقاعدہ ایک حصے کے طور پر نصاب میں شامل کیا جائے۔ دیگر فقہی مسالک کی امہات الکتب سے ایک خاص درجے کے بعد طلباء کو متعارف کروایا جائے۔ ظاہر ہے کہ ہر ایک کے لیے یہ ممکن نہیں مگر کچھ ادارے اور افراد ایسے ہونے چاہئیں۔ ایسے دلائل اور تعبیری، فقہی تنوع کی بھی ہمارے ہاں بہت گہری جڑیں ہیں۔ اختلافی اور تعبیری اختلاف امام ابو حنیفہؒ کی فقہ کی کتابوں میں دیکھا جا سکتا ہے۔ خود ان کے شاگرد امام ابو یوسفؒ، امام محمدؒ اور امام زفرؒ نے ان سے اختلاف کیا ہے اور نہ صرف اختلاف کیا ہے بلکہ بارہا امام ابو حنیفہؒ نے ان کی طرف رجوع کیا اور وہ رجوع ثابت ہے۔ یہ چیز ہماری بنیاد میں موجود ہے۔ ایسی صورت میں ہم ان بنیادوں کی طرف واپس کیوں نہ جائیں؟ اس طریقے سے جو سوچ سامنے آئے گی اس کا افق زیادہ وسیع ہو گا۔

مذاہب عالم کے مطالعہ کی ابتداء ہم نے کی ہے۔ امام ابن حزم کی الملل والنحل اور دیگر بہت سی کتب کی مثالیں بھی اس ضمن میں پیش کی جا سکتی ہیں۔ جدید اور قدیم مذاہب اور افکار اب ختم ہو گئے ہیں۔ ان کا تاریخی طور پر تو ہم مطالعہ کر سکتے ہیں مگر یہ نئے افکار کی قیمت پر نہیں ہونا چاہیے۔ ان تمام ضروریات کو سامنے رکھتے ہوئے موجودہ نصاب میں تھوڑی بہت تخفیف کی ضرورت ہے۔ بہت ساری کتابیں

ایسی ہیں جن میں تکرار اور اعادہ ہے۔ کوشش یہ ہونی چاہیں کہ انہیں کم کر دیا جائے اور انہیں ایک موبوط طریقے سے پڑھانے کی کوشش کی جائے۔ان کی زبان بہت مغلق ہے کیونکہ یہ دور وسطی میں لکھی ہوئی کتابیں ہیں۔ان میں بھی اصلاح اور کچھ زائد مواد شامل کرنے کی ضرورت ہے۔ مثلاًان میں کچھ مواد خارج کرنا ہے اور کچھ کو شامل کرنا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ یہ کوئی مشکل کام نہیں ہے۔اس کا انتظام کیا جاسکتا ہے۔

اسی طرح پاکستان کے تناظر میں یہ ضروری ہے کہ مدارس دیگر مسلم ممالک کے دینی تعلیم کے تجربات سے بھی استفادہ کریں۔ایسے کوسز کرائے جائیں جن میں باقی مسلم ممالک کے نظام تعلیم کا تعارف ہو۔اس طرح سیکھنے اور طریقہ تدریس کے علاوہ نصاب اور تعلیم سے فراغت کے بعد سماجی تحرک کے حوالے سے بھی نئے اُفق سامنے آئیں گے۔ حکومتوں کی بجائے اصلاحات کے یہ اقدامات اگر خود مدارس اپنی سطح پر کریں تو زیادہ مفید و مؤثر ہو گا۔

مجلہ تحقیقات کے تیسرے شمارے پر ادارتی ٹیم کو مبارکباد پیش کرتا ہوں اور اُمید رکھتا ہوں کہ قارئین اس سے استفادہ کریں گے۔

پروفیسر ڈاکٹر قبلہ ایاز

(چیئرمین اسلامی نظریاتی کونسل)

مقدمہ

مسلم دنیا، اکیسویں صدی اور مذہبی تعلیم

'مسلم دنیا میں مذہبی تعلیم'، یہ ایک ایسا موضوع ہے جو کم از کم پاکستان اور پڑوسی ممالک کے لیے نہایت متعلق اور مفید ہے۔ ہمارے ہاں مذہبی تعلیم کا کوئی ایک نمونہ ہے اور نہ ایسا ہے کہ اس پر کسی مکالمے کی ضرورت نہ ہو۔ پاکستان میں تو مذہبی تعلیم کے کئی سماجی و فلاحی پہلو بھی ہیں جن سے عموما صرف نظر کیا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی افادیت عام لوگوں کی نظر میں کبھی کم نہیں ہوئی۔ مگر ظاہر ہے کہ تعلیم نوجوانوں کی ذہن سازی بھی کرتی ہے اور ان کے سامنے معاشرے کا اور دنیا سے متعلق کوئی نہ کوئی نقطہ نظر بھی پروان چڑھاتی ہے۔ پھر اگر مذہبی تعلیم کا دائرہ صرف اخلاقیات کے ساتھ نہ جڑا ہو، بلکہ مذہبی اداروں سے وابستگی کا اظہار کرنے والی سیاسی و غیر سیاسی تنظیمیں بھی فعال ہوں، تو ایسے میں مذہبی تعلیم اور اس کے اداروں کی ذمہ داری مزید بڑھ جاتی ہے، کہ وہ عملی سطح پر کیا کردار ادا کر رہے ہیں اور ان کے کیا اثرات مرتب ہو رہے ہیں۔

مذہبی تعلیم کا اگر محدود دائرے میں بھی تجزیہ کیا جائے تب بھی اس کی نوعیت و ڈھانچے پر نظر ثانی یا اس کی تفہیم کی کوشش اس لیے ضروری ہے کہ اس کے ساتھ تقریبا تمام معاشرہ جڑا ہوا ہے۔ کیونکہ یہ ملک اسلامی جمہوریہ ہے، لہذا صرف طالب علم ہی نہیں، بلکہ معاشرے کی اکثریت مذہبی علوم و اداروں سے ایک تعلق رکھتی ہے۔

اصلاحات یا بحث و تمحیص کی متقاضی صرف مذہبی تعلیم نہیں ہے۔ ہمارے ہاں تعلیم اپنی عمومی حیثیت میں ہی مسائل کا شکار ہے۔ تعلیمی پالیسیوں میں جو دعوے کیے جاتے ہیں ان پر کماحقہ عمل نہیں کیا جاتا۔ بلکہ ملک میں کئی تعلیمی پالیسیاں تو ایسی بھی گزریں جن میں سرے سے مقاصدِ تعلیم کا ذکر ہی نہیں تھا۔ تعلیمی ابتری کے باوجود ملک کی سیاسی جماعتوں کے منشور میں تعلیمی اصلاحات کے

لیے کوئی منصوبہ پیش نہیں کیا جاتا، نہ ہی تعلیمی شعبے میں اصلاحات سے متعلق قومی سطح پر کسی قسم کی بامعنی گفتگو کا سلسلہ دیکھنے میں آتا ہے۔ ہمارے تعلیمی اداروں کا کلچر فرسودہ اور بے معنی ہو چکا ہے۔ عام آدمی کو تعلیم میں کوئی کشش نظر نہیں آتی، کیونکہ اس میں عملی زندگی کے ساتھ کوئی ربط نہیں ہوتا۔ ویسے تو قومی سطح پر ہر چند سال بعد تعلیمی اصلاحات کا راگ الاپا جاتا ہے، مگر کبھی نتائج برآمد نہیں ہوتے۔ یہ سوچنے کا مقام ہے۔ بہر حال اس موضوع پر تو بہت کتب لکھی گئی ہیں اور مسائل کی طرف توجہ دلائی گئی ہے، جن سے نمٹنے کے لیے ذمہ داران کو جلد یا بہ دیر اقدامات کرنے ہوں گے۔

اگر اصلاحات کی حد تک تھوڑا بہت تقابل کیا جائے تو مذہبی تعلیمی اداروں کا شعبہ اگرچہ الگ ہے، لیکن یہ بات تسلیم کرنی چاہیے کہ ان میں پچھلی دہائیوں کے دوران بہت تبدیلی آئی ہے، جو حیرت انگیز ہے۔ مدارس نے قانون، جدید معاشیات، صحافت اور آرٹ میں بہت سے شعبے قائم کیے ہیں۔ حتی کہ اب تو بعض بڑے مدارس نے یونیورسٹیاں بھی قائم کر لی ہیں جن کی طرف نوجوانوں کا رجحان توقع سے بڑھ کر ہے۔ یوں اپنے حلقے تک تعلیمی تبدیلیوں کے نتائج کو بھی دیکھا جائے تو اہل مدارس نے کافی کامیابیاں سمیٹی ہیں۔ جبکہ بعض حکومتی عصری ادارے وسائل کے باوجود زیادہ سست رفتار اور نتائج کے لحاظ سے بھی بہت پیچھے ہیں۔ پرائیویٹ سیکٹر کچھ نہ کچھ عصری ضروریات پوری کر رہا ہے لیکن بد قسمتی سے وہاں تعلیم صرف کاروبار کی شکل اختیار کر چکی ہے۔

تاریخی تجزیہ یہ بتاتا ہے کہ مسلم دنیا میں عوام کا رجحان مذہبی تعلیم کی طرف وقت کے ساتھ زیادہ ہوا ہے۔ یہی وجہ ہے مذہبی تعلیمات جو ماضی میں صرف دینی مدارس تک محدود تھیں، اب جدید یونیورسٹیوں کا بھی لازمی جزو بن گئی ہیں۔ اسی طرح مسلم دنیا میں کئی معیاری اسلامی یونیورسٹیوں کا قیام بھی عمل میں لایا گیا جیسا کہ اسلامی یونیورسٹی ام درمان (سوڈان)، مدینہ یونیورسٹی، امام محمد بن سعود یونیورسٹی ریاض، اور اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد۔ پچھلی ایک دہائی میں ترکی کے اندر دینی مدارس / سکولوں کی مانگ اور تعداد میں کئی گنا اضافہ ہوا ہے۔ یہی حال بنگلہ دیش کا ہے جہاں بعض سیاسی حلقوں کی مخالفت کے باوجود مدارس کی تعداد روز افزوں بڑھی ہے۔ انڈونیشیا، ملائشیا، تیونس، عراق

اور مصر بھی اس کی بڑی مثالیں ہیں۔ خود پاکستان میں مدارس میں طلبہ کی تعداد ہر سال بڑھ رہی رہے اور عصری جامعات کے اسلامیات کے شعبوں میں بھی داخلوں کی شرح اوپر جا رہی ہے۔ اگرچہ پاکستان میں اسلامی تعلیمات کے شعبے اعلی معیارات قائم کرنے اور برقرار رکھنے میں ناکام رہے ہیں۔ اگر ہماری عصری جامعات کے اسلامیات کے شعبوں کا موازنہ باقی مسلم دنیا کے ہم پلہ ممالک کی جامعات سے کیا جائے تو تحقیق کے حوالے ہم پاکستانی جامعات کے شعبے مایوس کن ہیں۔ اس کے باوجود طلبہ کا رجحان حیران کن ہے، اور یہ اس امر کا متقاضی بھی ہے کہ انہیں بہتر کیا جائے۔

حال ہی میں ایک دوست نے پاکستان کی عصری جامعات کے اسلامیات کے شعبوں میں پچھلے کچھ برسوں میں ہونے والے تحقیقی مقالات کا اشاریہ مرتب کیا تھا۔ اس اشاریے پر نظر ڈالتے ہیں آدمی کو محسوس ہوتا ہے کہ وہ بڑی تعداد میں موضوعات کا انتخاب ملتا جلتا ہے۔ اسی طرح منتخب موضوعات کی اکثریت ایسی ہے جو محض نظری مباحث سے متعلق ہے، جبکہ پاکستان میں کتنے ہی ایسے جدید مسائل ہیں جن مذہبی نوعیت کے ہیں اور ان پر تحقیق کی ضرورت ہے۔ قرآن کریم پر لکھے گئے زیادہ تر مقالات ایسے ہیں جو یا تو گرامر کی کسی بحث سے ہیں، یا پھر آسان سے کسی تفسیری پہلو پر مواد جمع کرنے سے متعلق۔ یہی حال حدیث کے شعبے میں بھی ہے۔ فقہ میں یا تو کسی پرانے مسئلے پر بحث اور اقوال کو جمع کر دیا جاتا ہے، یا پھر خالص نظری اختلافات کو ایک جگہ اکٹھا کر لیا گیا ہے۔ ہمیں عصری جامعات کے نظام کو وقت کے ساتھ اور عملی مسائل سے ہم آہنگ کرنے کی ضرورت ہے۔ مذہبی تعلیم کا جب ذکر آئے تو ظاہر ہے برصغیر میں مدارس ہی اولین مصداق ہوتے ہیں۔ مگر اب چونکہ عصری ادارے بھی مذہبی تعلیم سے وابستہ ہیں تو اس لیے بات کرنا ضروری ہے۔

جہاں تک دینی مدارس کی بات ہے تو پاکستان بلاشبہ مذہبی اداروں کا ایک بہت بڑا نیٹ ورک رکھتا ہے۔ لیکن اس میں بھی کوئی شبہ نہیں کہ اسے دیگر مسلم ممالک کے تجربات سے استفادے کی شدید ضرورت ہے۔ جو چھوٹے چھوٹے اقدامات یہاں کیے گئے، وہ بھی قابل ستائش ہیں، مگر اتنا بڑا نیٹ ورک اور عوام کی بڑی تعداد کا اس طرف رجحان، تقاضا کرتے ہیں کہ جس پر پیمانے پر اصلاحات اور سیکھنے کی ضرورت ہے اس سطح پر کام نہیں ہو رہا۔ ویسے تو جو موجود ہے وہی کافی لگتا ہے، لیکن جب

ایک نظر دیگر ممالک کے ماڈلز پر ڈالی جاتی ہے تو محسوس ہوتا ہے کہ بہت کچھ تشنہ ہے۔

مثال کے طور پہ، بنگلہ دیش کے دینی مدارس پر ہمارے ہاں جو کچھ معروف ہے وہ اس حد تک ہے کہ وہاں کا نصاب بہتر ہے، زبانیں سکھانے میں انہوں نے پیش رفت کی ہے، بعض مدارس ٹیکنکل ایجوکیشن بھی دے رہے ہیں اور یہ کہ کچھ مدارس حکومت کے ساتھ الحاق کیے ہوئے ہیں۔ مگر جب ہم نے مزید جھانکنے کی کوشش کی تو معلوم ہوا کہ وہاں کے دینی مدارس نے خواتین کی خواندگی کے حوالے سے جو کارنامہ سرانجام دیا ہے وہ کسی تعلیمی انقلاب سے کم نہیں ہے۔اسی طرح کئی مسلم ممالک میں اقلیتی طبقات کے لیے طلبہ میں مثبت ہم آہنگی تشکیل دینے کی خاطر مذہبی تعلیم کے نصاب میں جو کام کیا ہے وہ بہت قابل قدر ہے۔ایسے ہی شہری اقدار اور مرکزی دھارے کے ساتھ مل کر چلنے سے متعلق جو تعلیمی اقدامات ہیں، وہ لائق تقلید ہیں۔

اسی طرح ابھی افغانستان میں خواتین کی تعلیم کا مسئلہ چل رہا ہے۔ اگر وہ اس کے لیے غیر مخلوط نظام لاتے ہیں تو اس میں کوئی قباحت نہیں ہے۔ کئی مسلم ممالک میں خواتین کی تعلیم کے الگ ادارے قائم ہیں اور وہاں بحسن وخوبی ایسا انتظام چل رہا ہے۔ ہماری رائے کہ افغان حکومت کو ایسا نظام وضع کرنے میں وسائل وانتظام کے حوالے سے دنیا کو معاونت کرنی چاہیے۔اگر سنجیدہ کوششیں کی جائیں تو انہیں اس پر بہ آسانی قائل کیا جاسکتا ہے۔ کیونکہ خود طالبان کے اندر بہت سے ذمہ داران اس کے حق میں ہیں۔ شاید ان کے لیے ایک بڑا مسئلہ الگ سے نئے ادارے بنانے اور پورا ڈھانچہ وضع کرنے کا بھی ہے۔اسلام میں تعلیم نسواں کے بارے میں کبھی دورائے نہیں ہو سکتیں۔

اس وقت عالم اسلام کی آبادی لگ بھگ ایک ارب بیس کروڑ ہے جس کا نصف خواتین ہیں۔ مسلم معاشروں کی خواتین کو باقی دنیا بھر کی خواتین سے بالکل علیحدہ حیثیت میں پیش کیا جاتا ہے۔حالانکہ یہ ثقافتی مسئلہ ہے اور تعلیم کو متاثر کیے بغیر اسے چلایا جاسکتا ہے۔ مسلم معاشروں اور اسلامی حلقوں میں خواتین کا کردار اب ساری دنیا میں تیزی سے بدل رہا ہے۔ خواتین سرگرم سماجی اور تحریکی کردار ادا کرنے کے لیے آگے آرہی ہیں اور زندگی کے مختلف شعبوں میں گراں قدر خدمات بھی انجام دے رہی ہیں۔ خواتین اوران کے رول سے متعلق بعض رائج تصورات اور مقامی تہذیبی قدروں سے یہ رجحان

کہیں کہیں متصادم بھی سمجھا جاتا ہے۔اس پس منظر میں درست اور متوازن اسلامی نقطہ نظر کی وضاحت ایک اہم ضرورت ہے۔انڈونیشیا میں خواتین کی عالمات کی تنظیم KOPI نے ایک تحریک کی شکل اختیار کی ہے۔ان کے مطابق علماء خواتین بھی ہوسکتی ہیں،وہ صرف مردوں پر انحصار کی بجائے،خود دینی نصوص کی تشریح کریں گی۔اسی طرح تیونس کی جماعت النہضہ میں بھی خواتین کا کردار نمایاں ہے۔ہمارے نزدیک گھر اور خاندان سے متعلق امور عورت کی بنیادی ذمہ داریوں میں شامل ہیں لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اس کا کوئی سماجی کردار مطلوب نہیں ہے۔اسلام کی تفہیم میں عورت،سماج سے کٹی ہوئی نہیں ہے بلکہ اس کی ایک ذمہ دار رکن ہے۔

ملائیشیا نے تقریباً تین دہائیاں قبل ہی صنفی فرق کے مسئلے پر قابو پالیا تھا۔ بنگلہ دیش میں بھی ایسا ہی نمونہ نظر آتا ہے جہاں پرائمری اور سیکنڈری اسکولوں میں لڑکیوں کی تعداد لڑکوں سے زیادہ ہے۔اس مسلم اکثریتی ملک میں نہ تو مذہبی قدامت پسندی اور نہ ہی کوئی اور وجہ لڑکیوں کو اسکولوں سے دور رکھ سکی ہے۔'گلوبل جینڈر گیپ انڈیکس' میں بنگلہ دیش 75 نمبر پر، سعودی عرب 127 پر، ایران 130 اور پاکستان 135 ویں درجے پر آتا ہے۔اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ہم صنفی مساوات کے معاملے میں بنگاہ دیش سے کتنا نیچے ہیں۔

مذہبی تعلیم اپنے زمانے کی قدروں سے ہم آہنگ ہوتی ہے۔اگر خود سکالرز، دانشور، علماء اور دینی اداروں کے ذمہ داران اس بابت کوئی مستقبل کا لائحہ عمل تیار کریں،ایک کمیٹی تشکیل دیں جو مسلم دنیا کے مختلف ماڈلز اور تجربات کا تجزیہ کرے، پھر اپنے معاشرے کی ضرورتوں کے مطابق رفتہ رفتہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھائے جائیں تو یہ بہت مفید ہوگا۔بس ہمیں نظام تعلیم میں قدرے جدت طرازی کرکے طلبہ کو وسائل و مواقع فراہم کرنے کی ضرورت ہے۔

یہ خصوصی شمارہ ہمارے ادارے 'انٹرنیشنل ریسرچ کونسل برائے مذہبی امور' کا تیسرا سالنامہ تحقیقات ہے۔اس سے پہلے دو شمارے شائع کیے جاچکے ہیں جن کے عنوان یہ تھے: 'مسلم دنیا اور جمہوریت: تحدیات وامکانات'، 'مسلم دنیا اور مذہبی آزادی: تحدیات وامکانات'۔اب یہ تیسرا شمارہ 'مسلم دنیا اور مذہبی تعلیم' کے موضوع پر قارئین کی خدمت میں پیش ہے۔اس حساس اور اہم

موضوع پر اہل علم کی مستند آراء کو یکجا کرنے کی کوشش کی گئی ہے،اس خواہش کے ساتھ خود کو غیر جانبدار بھی رکھا جائے۔اپنی سعی اور خواہش کی تکمیل میں ہم کس حد تک کامیاب ہوئے ہیں اس کا فیصلہ قارئین کریں گے۔

محمد اسرار مدنی

(مدیرِاعلی تحقیقات وصدر نشین ادارہ)

مذہبی تعلیم: تعارف اور تاریخ

مسلم تاریخ میں مدارس دینیہ کا آغاز و ارتقاء

ادارتی ٹیم

اسلامی تہذیب میں دینی مدارس کو ریاستی و سماجی سطح پر بہت اہمیت حاصل رہی ہے۔اس کی وجہ یہ تھی کہ کارِریاست چلانے میں معاون پڑھے لکھے افراد مدارس فراہم کرتے تھے، اسی طرح مذہبی امور میں رہنمائی بھی انہی اداروں سے آتی تھی۔چونکہ دینی علوم کے ادارے شروع سے ہی مسلم سماج و ریاست کے لیے ایک ضرورت بن گئے تھے، اس لیےان کا ارتقاء بڑی تیزی کے ساتھ ہوا اور تھوڑے ہی عرصے میں جگہ جگہ مدارس کھل گئے۔ نہ صرف بغداد اور حجاز میں، بلکہ خراسان اور افریقی خطوں میں بھی تاریخی ادارے وجود میں آئے،اور ان کا تسلسل ابھی تک چل رہا ہے۔زیرنظر مضمون میں مدارس کے اسی تاریخی ارتقاء کا جائزہ لیا گیا ہے۔

مدارس کی ابتدائی شکل اور طریقہِ تدریس

قدیم مسلم تاریخ میں مدارس کی شکل بہت ہی مختلف تھی۔مدارس کی تعلیم انتہائی سادہ اور آزادانہ ماحول میں ہوتی تھی۔ تعلیم مفت تھی، کوئی فیس نہیں تھی، رہائش، خوراک سمیت سب ضروریات منتظمین مہیا کرتے تھے۔نہ عمر کی قید، نہ داخلہ اور حاضری کی پابندی تھی۔طالب علم جب تک چاہتے پڑھتے جب چاہتے چلے جاتے۔سب کچھ طالب علم کی مرضی پر منحصر ہوتا تھا۔ہر شخص اپنے ذاتی شوق سے پڑھتا تھا۔ مگر علم کا شوق بے حد و حساب تھا۔اساتذہ مسجدوں میں مختلف اوقات میں مختلف علوم و فنون کی تعلیم دیتے تھے۔ بعض روزانہ اور بعض ناغہ سے دیتے تھے،وہ نظم و ضبط سے بندھے ہوئے نہیں تھے۔ طلبہ زیادہ سے زیادہ اسباق میں شرکت کرنے کی غرض سے مسجدوں کے درمیان ایک طرح سے دوڑ لگاتے تھے۔امام احمد بن حنبلؒ کا قول ہے: ”اگر کوئی شخص بغداد کی گلیوں میں دوڑتا نظر آئے تو سمجھ لو یا تو وہ کوئی طالب علم ہے یا پھر پاگل شخص ہے“۔ نصاب تعلیم کا معاملہ بھی عجیب تھا۔ابتدائی سات صدیوں تک عالم اسلام کے مدارس میں تدریسی کتابوں کا رواج نہیں تھا۔ہر استاد ایک خاص مضمون کو بطریق لیکچر پڑھاتا تھا۔وہ کسی کتاب اور مصنف کے اقوال کا پابند نہیں ہوتا تھا۔

بعض نے اپنے لیکچر کتابی شکل میں مرتب کر لئے تھے۔ ہر سال وہ اسی کو پڑھاتے تھے۔ طریق تدریس قرات و سماع والا ہوتا تھا۔ استاد لیکچر دیتا تھا اور طلبہ اس کو سنتے تھے۔ دوسرا طریقہ املاء اور کتابت کا تھا۔ وہ ہمارے زمانے کے نوٹس سے مشابہ تھا۔ استاد اپنے حافظہ سے لکھواتا جاتا تھا اور طلبہ اس کو مرتب کر لیتے تھے۔ حدیث کے درس میں خاص طور پر مجمع بہت بڑا لگ جاتا تھا۔ اس لئے استاد کی آواز دور دور تک پہنچانے کے لئے بسا اوقات درمیان میں جگہ جگہ لوگ کھڑے ہو جاتے تھے، جو استاد کے جملوں کا اعادہ کرتے تھے اور ان کو مستملی کہا جاتا تھا۔

کسی کتاب کی مدد کے بغیر محض اپنے حافظہ سے قرات کرنے (لیکچر دینے) کا طریقہ تاتاری حملے تک جاری رہا۔ لیکن جب مشرق میں علماء کو تاتاریوں نے قتل کرنا شروع کیا، اور عالم مغرب میں اندلس میں فرانسیسی استعمار نے مسلمانوں کا قتل عام کیا، تو بعد کے ادوار میں علماء کی سابقہ روش جو بلاد اسلامیہ کا خاصہ تھی، باقی نہ رہی۔ پھر ہر شہر میں، ہر قسم کے علوم و فنون کی شاخوں پر لیکچر دینے والوں کا فقدان ہو گیا۔ ان حالات میں تدریسی کتب کا استعمال بڑھنے لگا۔ اسی دور میں ہلاکو خان کے وزیر نصیر الدین محقق طوسی (1274ء) نے تعلیم و تدریس کی از سر نو تدوین کی۔ یہ پہلا موقع ہے کہ عالم اسلام میں تدریسی کتابوں کا استعمال شروع ہوا۔ سید سلیمان ندویؒ نے درسی کتاب کے دو قدیم ترین حوالے دریافت کئے ہیں۔ صدر الشریعت عبید اللہ بخاری 747ھ (1346ء) نے شرح وقایہ کے دیباچے میں سبقاً سبقاً پڑھنے کا ذکر کیا ہے۔ تیموری دور میں جب اسلامی علوم و فنون کا احیاء ہوا تو مصنفین نے نصاب تدریس کی از سر نو تدوین کی اور اس کے لئے نصابی انداز میں کئی کتابیں لکھیں۔ یہ نصاب دراصل بعد میں آنے والے تمام نصابوں کی بنیاد ہے۔ برصغیر میں رائج "درس نظامی" بھی تیموری نصاب پر مبنی ہے۔ صرف میر، صرف نحو، مطول وغیرہ اس نصاب کی کتابیں ہیں۔ یہ ان دو بزرگوں کا عالم مشرق پر بڑا احسان ہے۔ سعد الدین تفتازانی (1391ء) اور میر شریف جرجانی (812ھ) اپنے دور کے بہت بڑے استاد تھے۔

مدارس کا باقاعدہ آغاز

یوں تو آغاز اسلام سے ہی درس و تدریس کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ اسلام کی ابتدائی چند صدیوں میں باقاعدہ مدارس کی بجائے مساجد کے صحن، خانقاہوں کے حجرے اور علماء کے مکانات ہی درس گاہیں تھیں اور یہیں سے عظیم قراء کرام، مفسر، محدث، فقیہ، مجتہد، ادباء، شعراء اور مؤرخ پیدا ہوئے جن کے نام علمی دنیا میں درخشندہ ہیں۔ یورپین مؤرخین کی تحقیق ہے کہ سب سے پہلے عباسی دور میں مامون نے خراسان میں باقاعدہ مدرسہ قائم کیا تھا چنانچہ انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا میں لکھا ہے کہ مامون نے اپنے ولی عہدی کے زمانہ میں خراسان میں کالج بنوایا تھا جس میں مختلف ممالک سے نہایت قابل اساتذہ بلا کر مقرر کیے۔[1]

اس اعتبار سے دوسری صدی میں مدارس کے قیام کا آغاز ہو گیا تھا۔ مگر عربی مصادر سے اس کی تصدیق نہیں ہوتی۔ عام مؤرخین مدارس کے قیام کا آغاز مدرسہ نظامیہ بغداد سے یعنی پانچویں صدی سے کرتے ہیں لیکن صحیح یہ ہے کہ چوتھی صدی میں نیشاپور میں متعدد مدارس قائم ہو چکے تھے۔ سب سے پہلے سلطان محمود غزنوی کے بھائی امیر نصر بن سبکتگین نے نیشاپور میں مدرسہ بیہقیہ اور مدرسہ سعیدیہ قائم کیے۔[2]

اسی زمانے میں نیشاپور میں ایک مدرسہ ابو سعد اسماعیل بن علی واعظ استر آبادی نے قائم کیا۔ ایک مدرسہ امام ابو اسحاق کے لیے کسی امیر نے بنوایا تھا۔[3] ایک مدرسہ اہل نیشاپور نے امام ابو بکر بن حسن المعروف بابن فورک (م406) کے لئے قائم کیا جس میں مختلف علوم کی تعلیم دی جاتی تھی۔[4] حاکم بامر اللہ فاطمی نے 400 ہجری میں قاہرہ میں ایک مدرسہ قائم کیا۔[5] نظام الملک نے ایک مدرسہ نیشا

---

[1]- انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا، آرٹیکل: المامون

[2]- حسن المحاضرہ، ج2، ص:151

[3]- حسن المحاضرہ، ج2، ص:151

[4]- ابن خلکان، ج3، ص:280

[5]- حسن المحاضرہ، ج2، ص:139

پور میں قائم کیا جو مدرسہ نظامیہ نیشاپور کے نام سے مشہور تھا۔

ملک شاہ سلجوقی کے وزیر نظام الملک طوسی نے بغداد میں ایک مدرسہ قائم کیا۔ مدرسہ کے ساتھ طلبہ کے لئے دار الاقامہ تعمیر کیا۔ سب طلبہ کو وظیفے ملتے تھے۔ اس دور کے نامور علماء درس وتدریس کے لئے مقرر کئے۔ نظامیہ بغداد کے علاوہ نظام الملک نے بلخ، ہرات، نیشاپور، اصفہان، بصرہ، مرو، موصل اور عراق کے تمام شہروں میں مدارس قائم کیے۔[6]

ابن اثیر کا بیان ہے کہ نظام الملک نے ممالک محروسہ کے تمام شہروں میں مدارس اور دار العلوم قائم کئے اور ان کے مصارف کے لئے بڑی بڑی رقمیں مقرر کیں تھیں۔[7]

نظامیہ بغداد کے قیام کے بعد شہر بغداد میں مدارس اور دار العلوم کی تعمیرات کا سلسلہ عام شروع ہو گیا۔ ابن جبیر اندلسی 850 میں بغداد پہنچا۔ وہ لکھتا ہے کہ یہاں تیس بڑے بڑے دار العلوم ہیں جن میں سے ہر ایک عمارت بڑے بڑے محلات کو شرماتی ہے۔[8] مستنصر باللہ نے 625 ہجری میں دار العلوم مستنصریہ کی بنیاد رکھی، سات برس میں یہ عمارت تعمیر ہو کر تیار ہوئی۔ مدرسہ کے مصارف کے لئے ایک بڑی جائیداد وقف تھی۔[9]

ابن واثل کا بیان ہے کہ روئے زمین پر اس سے بہتر مدرسہ کوئی نہ تھا اور نہ کسی مدرسے کا اتنا بڑا وقف تھا۔ اس میں چاروں مسالک کی تعلیم ہوتی تھی۔ مدرسہ سے ملحق ایک شفاء خانہ، مطبخ اور ٹھنڈے پانی کے لیے آبدار خانہ تھا۔ طلبہ کو چٹائیاں، فرش، تیل، کاغذ، قلم و دوات مفت اور کھانے کے علاوہ ہر طالب علم کو ایک اشرفی ماہانہ وظیفہ ملتا تھا۔ مدرسہ سے ملحق ایک عمدہ حمام بھی تھا۔[10]

فاطمی خلفاء کے عہد میں صرف چند مدارس کے قیام کا پتہ چلتا ہے۔ جامعۃ الازہر انہی کی یادگار ہے۔

---

[6]- طبقات الشفافعیہ، ج3، ص:137

[7]- ابن اثیر، ج10، ص:72

[8]- سفرنامہ ابن جبیر، ص:229

[9]- تاریخ الخلفاء، ص:473

[10]- تاریخ الخلفاء، ص:375

نورالدین محمود زنگی(541ھ-569ھ) نے حلب، حماۃ، بعلبک میں بڑے بڑے مدارس قائم کیے، دمشق میں ایک عظیم الشان مدرسہ بنایا۔ دنیائے اسلام میں جو پہلا دارالحدیث قائم ہوا اسی کے نام سے دارالحدیث نوریہ کے نام سے مشہور ہوا ہے۔ اس سے پہلے خاص علم حدیث اور درس کے لئے کوئی مدرسہ تعمیر نہیں ہوا تھا۔ 69-567 ہجری میں نورالدین کے کاتب عماد کے اہتمام سے مدرسہ عمادیہ قائم ہوا۔ سلطان صلاح الدین (م585ھ) اور اس کے متوسلین نے مصر، شام، فلسطین وغیرہ کے شہروں میں سینکڑوں مدارس قائم کیے۔ اسکندریہ میں بھی بڑے بڑے مدارس قائم کیے گئے۔ ابن جبیر نے سلطان کے عہد میں مصر اور شام کی سیاحت کی تھی۔ اسکندریہ کے حالات میں لکھا تھا کہ اس شہر کے مناقب اور مفاخر میں جس کا سہرا سلطان کے سر ہے اس کے مدارس اور اقامت گاہیں ہیں، جو اس نے طلبہ اور صوفیاء کے لئے بنوائیں۔ مصر میں مدرسہ قطبیہ ملک العادل کی بیٹی مونسہ خاتون نے قائم کیا۔ سلطان کی دوسری خاتون نے حلب میں مدرسہ فردوس کے نام سے قائم کیا۔

خاندان صلاحیہ کے بعد 923ھ تک مصر و عرب پر ترک و چراکسہ نے حکومت کی۔ اتراک نے 783ھ تک حکومت کی پھر چراکسہ کے ہاتھوں میں زمام حکومت آئی۔ یہ دونوں خاندان زرخرید غلام تھے۔ جو ترکی کے منصب حکومت تک پہنچے تھے۔ ملک منصور قلاؤن (689ھ) نے مدرسہ منصوریہ قائم کیا۔ ناصر محمود قلاؤن نے مدرسہ ناصریہ قائم کیا جس میں چاروں مسالک کا درس ہوتا تھا۔ امام فخر الدین انجیلی(579ھ) نے مکہ معظمہ میں بہت عمدہ مدرسے بنوائے۔ خلیفہ المستغنی باللہ کی کنیز طالب الزمان نے 570ھ میں ایک مدرسہ قائم کیا جس میں فقہاء شافعین مدرس تھے۔ 621ھ میں ایک مدرسہ قائم ہوا جس کا بانی الملک المنصور عمرو بن علی والئ یمن تھا۔ عبدالباسط جو سلطان ظاہر کی فوج کا ناظر تھا، اس نے مکہ معظمہ میں بہت عمدہ مدرسے بنوائے۔ ملک اشرف قاتیبائی نے جو خاندان چراکسہ سے تھا چاروں مذاہب کے لئے عظیم الشان مدرسہ بنوایا جس میں بہتر 72 کمرے تھے۔

بنگال کے خود مختار حکمران سلطان غیاث الدین نے مکہ معظمہ میں مدرسہ قائم کرنے کے لیے یاقوت نامی خادم کو حسن بن عجلان شریف مکہ کے پاس زر خطیر دے کر روانہ کیا۔ یاقوت نے باب امہانی کے قریب بارہ ہزار مثقال میں دو مکان خرید کر مدرسہ بنوایا۔ سلطان سلیمان نے 926ھ میں چار بڑے

بڑے مدرسے قائم کیے۔ تیونس میں ایک مدرسہ جامعہ زیتونہ کے نام سے قائم ہوا۔ یہ مدرسہ ساتویں صدی ہجری میں حکومت حفصیہ کے عہد میں افریقہ کی سب سے بڑی یونیورسٹی تھی۔ مراکش کے شہر فاس میں قزوین یونیورسٹی 245ھ میں قائم ہوئی۔ اس یونیورسٹی کو ایک خاتون فاطمہ بنت محمد الفسرس نے قائم کیا تھا۔

مغربی سوڈان میں 1240ء میں قبیلہ مزنگ نے سلطنت مالی کی بنیاد رکھی۔ تب تمبکتو اسلامی علوم کا مرکز تھا۔ اس شہر میں بہت بڑی یونیورسٹی قائم کی گئی۔ تلمسان پرانے زمانے میں مغرب متوسط کا دارالحکومت تھا۔ مدائن میں 740ھ میں مسجد سدی تعمیر ہوئی۔ اس مسجد کے اوقاف میں ایک مدرسہ تھا۔ جو 747ھ میں تعمیر ہوا۔ پانچویں صدی کے شروع میں ابو جعفر طوسی نے نجف میں ایک درس گاہ کی بنیاد رکھی تھی، یہی درسگاہ آج ''جامعہ نجف'' کے نام سے مشہور ہے۔ مدرسہ سلیمیہ، مدرسہ خلیلی اور مدرسہ بروجروی بھی مشہور ہیں۔ ایک درسگاہ جامعہ النجفہ ہے جس کی خوبصورت عمارت کی تعمیر پر اس دور میں تین لاکھ دینار صرف ہوئے۔

ترکوں نے اپنے عہد عروج میں بے شمار مدرسے قائم کیے۔ سب سے پہلے سلطان ارخان (726ھ- 760ھ) نے ازنیق کا مدرسہ قائم کیا۔ سلطان محمد فاتح نے 865ھ میں قسطنطنیہ میں ایک بڑی یونیورسٹی قائم کی، جس کے ماتحت آٹھ دارالعلوم تھے۔ سلطان نے ایک کالج مفتیوں اور قاضیوں کی فقہی تعلیم کے لیے قائم کیا۔ بقول ارکھاٹ ''ترکی میں کوئی سلطان ایسا نہیں ہے جس نے اپنے پیچھے ایک کالج نہ چھوڑا ہو اور اس پر کوئی جائیداد وقف نہ کی ہو''۔ علامہ شبلی نے اپنے مضمون 'مدرسے اور دارالعلوم' میں ترکی حکومت کے بہت سے مدارس اور ان کے نام لکھے ہیں۔ ان میں سلاطین کے ساتھ امراء اور خواتین کے نام بھی ہیں۔[11]

ترکوں کی تعلیمی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے کریسی لکھتا ہے ''محمد ثانی کے پیش رؤں خصوصاً اور خاں (Our Khan) کو سکولوں، کالجوں کے قائم کرنے کا بہت شوق تھا، لیکن محمد ان سب سے

[11]- مقالات شبلی، ج3، مقالہ ''مدرسے اور دارالعلوم''

بڑھ گیا۔ اس نے سلسلہ علماء قائم کیا اور سلطنت کے مفتیوں اور تاجروں کی تعلیم و ترقی کا ضابطہ مرتب کیا۔ حاکم قسطنطنیہ خوب جانتا تھا کہ ایک بہت بڑی سلطنت پیدا کرنے اور اس کو قائم کرنے کے لئے شجاعت اور فوجی قابلیت کے علاوہ کچھ اور بھی ضروری ہے۔ محمد نے جو خود بھی علوم میں ممتاز حیثیت رکھتا تھا، اپنی رعایا میں تعلیم پھیلانے کے لئے بڑی عالی حوصلگی سے کام لیا۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ عدالت کا نظام درست رکھنے کے لیے قاضیوں کا احترام ضروری ہے اور ان کا احترام قائم رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ وہ نہ صرف علم و دیانت سے آراستہ ہوں بلکہ سلطنت کے اونچے اور معزز عہدوں پر فائز کیے جائیں اور فکر معاش کی جانب سے ان کو مطمئن کر دیا جائے"۔

محمد نے ابتدائی مدارس کے علاوہ بہت سے بڑے بڑے مدرسے قائم کیے۔ ان میں مختلف علوم کی تعلیم دی جاتی تھی۔ قرآنی علوم، صرف و نحو، منطق، مابعد الطبیعات، تاریخ، زبان، فصاحت و بلاغت، اقلیدس، ہیئت، وغیرہ پڑھائے جاتے۔ یہ ایک ایسا نصاب تعلیم تھا جس کا موازنہ یقیناً پندرھویں صدی کے پیرس اور آکسفورڈ کے نصاب تعلیم سے کیا جا سکتا ہے۔ جو طلبہ ان سب علوم میں پوری دستگاہ حاصل کرتے تھے ان کو دانشمند کا لقب دیا جاتا تھا۔[12]

یہ دانشمند بغیر مزید تعلیم حاصل کیے کسی ابتدائی مدرسے کے اعلی مدرس ہونے کا حق ادا کر سکتا تھا، لیکن اس صورت میں بھی وہ علماء کی جماعت کا رکن نہیں بن سکتا تھا۔ جماعت علماء کا رکن بننے کے لیے فقہ کے ایک طویل نصاب کو پورا کرنا ضروری تھا اور یکے بعد دیگرے مختلف امتحانات میں کامیابی حاصل کر کے متعدد سندیں لینا پڑتی تھیں۔[13]

لارنپٹ لکھتا ہے، "1765ء میں سلطان مصطفےٰ ثالث کے عہد حکومت میں صرف حدود قسطنطنیہ کے اندر دو سو پچھتر مدرسے تھے اور انیسویں صدی کے وسط میں سلطان عبدالمجید کے زمانے میں یہ تعداد تین سو سے اوپر پہنچ گئی تھی۔ عبدالحمید کے زمانہ میں ہر شہر میں کم سے کم ایک مدرسہ موجود تھا۔

---

[12]- تاریخ دولت عثمانیہ، ج1، ص:71

[13]- تاریخ دولت عثمانیہ، ج1، ص:71

بڑے بڑے شہروں مثلاً ابغداد اور قاہرہ میں پچاس پچاس مدرسے تھے"۔[14]

اُس وقت کی تعلیم کی ترقی کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ 1892ء میں ہر قسم کے مدارس جو قسطنطنیہ میں تھے ان کی مجموعی تعداد پانچ سو تھی جن میں تیرہ بڑے کالج تھے۔ان کالجوں اور سکولوں میں سے یہ بہ طور نمایاں تھے:

1. "مکتب حربیہ شاہانہ" اس کو سلطان محمود ثانی نے فرانس کے فوجی کالج کے نمونہ پر 1830ء میں قائم کیا تھا۔
2. "مکتبہ سلطانی" یہ کالج مکتبہ حربیہ کے سوا تمام کالجوں میں ممتاز تھا۔
3. "مکتبہ ملکیہ سول سروس کالج" سلطان عبد الحمید خان ثانی کا قائم کردہ تھا۔
4. "مکتبہ الحقوق (قانونی کالج)" اس میں حسب ذیل مضامین پڑھائے جاتے تھے۔ "قرآنی علوم، فقہ، اصول فقہ، رومن لاء، قانون تجارت، اصول محاکمہ، تعزیرات، قانون بحری، علم سیاسیات، قوانین سلطنت ہائے یورپ، قانون کی ایجاد کی تاریخ اور اس کا عہد باعہد ارتقاء"۔
5. "مکتبہ الہندسہ" اس میں مدت تعلیم چھ برس تھی۔
6. "مکتبہ اللسان" جس میں جرمن، فرانسیسی، یونانی، ارمنی، لاطینی، اطالوی اور روسی زبانیں سکھائی جاتی تھیں۔
7. "مکتبہ الصناعتہ" (ٹیکنکل اسکول) اس میں حراوی اور نجاری وغیرہ سکھائی جاتی تھی۔
8. "مکتبہ نواب" اس کالج میں وہ طلبہ تعلیم حاصل کرتے تھے جو قاضی اور مفتی کے عہدوں کے امیدوار ہوتے تھے۔
9. "مکتبہ بحریہ" اس میں جہاز رانی کی تعلیم دی جاتی تھی۔
10. "مکتبہ الزراعہ" 1851ء میں قسطنطنیہ کے قریب سان اسٹیفانو کے مقام پر قائم کیا گیا اور اس میں زراعت، نباتات اور جانوروں کے متعلق نظری اور عملی تعلیم دی جاتی تھی۔

---

[14]- لارنپٹ، ج2، ص:143

11. ''مکتبہ طبیہ'' ایک ہسپتال اور حیوانات، نباتات اور طبیعات کا ادارہ بھی اس سے متعلق تھا۔[15]
12. ''فوجی انجینئروں کے لیے کالج'' یہ سلطان سلیم ثالث نے قائم کیا تھا۔
13. ''ٹرینگ کالج'' یہ اساتذہ کے لیے مخصوص تھا۔[16]

مذکورہ بالا مدارس میں دینی علوم کے ساتھ کئی دیگر علوم وفنون بھی پڑھائے جاتے تھے۔اب مسلم تاریخ کے چند مزید مدارس کا بہ طور خاص مختصر ذکر کیا جاتا ہے:

سپین کے مدارس

شعبہ تعلیم وتدریس میں اہل سپین نے بہت ترقی کی اور اس ترقی کا ورثہ یورپ کو ملا جس کی برکت سے یورپ نے علوم وفنون میں ترقی کی۔ سپین کی چند مشہور جامعات و مدارس کا ذکر حسب ذیل ہے:

سپین کے مشہور جامعات میں جامعہ قرطبہ، جامعہ اشبیلیہ، جامعہ غرناطہ اور جامعہ مالقہ کے نام آتے ہیں۔ جامعہ قرطبہ کا سنگ بنیاد عبدالرحمن الداخل نے رکھا تھا۔ بڑے بڑے علماء اس میں درس و تدریس کا فریضہ انجام دیتے تھے۔اور باقاعدہ اس کی طرف سے قلمی سائنسی اور تاریخی معلومات شائع ہوتی رہتی تھیں۔اشبیلیہ اور مالقہ کی جامعات دور امیہ میں قائم ہوئی تھیں اور ان کا عروج دورِ طوائف الملوکی میں ہوا تھا۔ غرناطہ کی جامع بنو نصیر کے ساتویں بادشاہ ابو الحجاج یوسف کے زمانہ میں قائم ہوئی تھی۔ لسان الدین ابن الخطیب نے اس جامعہ کو چار چاند لگائے۔ان کے علاوہ سرقسط اور بطلیموس کے مدارس بھی کافی شہرت یافتہ تھے۔ طلیطلہ کی یونیورسٹی مسلمانان اسپین کی باقیادت الصالحات کو محفوظ کرنے کا ایک اہم مرکز بن گئی تھی۔ایک مدرسہ ''دارالشفقہ'' یتیموں کے لیے مخصوص تھا۔

مصر کے مدارس

مصطفے کمال پاشا مصری نے ایک عظیم الشان مدرسہ مصر میں قائم کیا جس کا نام مدرسہ مصطفے کامل تھا۔ 7 مارچ 1899ء میں اس کا افتتاح ہوا۔ علاوہ ازیں مصر میں کثیر تعداد میں مدارس قائم کئے گئے تھے۔

---

[15] - تاریخ دولت عثمانیہ، ڈاکٹر محمد عزیز، ج2، ص:383-401
[16] - ایضاً

ثمر قند کے مدارس

امیر تیمور اور اس کے جانشینوں نے علم و ہنر کو ترقی دینے کے لیے مدارس قائم کیے۔ ہر مدرسے میں علماء اور مدرسین مقرر کیے۔ وہ علوم دینیہ کا درس مسلمانوں کو دیتے تھے۔ امیر تیمور اپنی تزک میں خود لکھتا ہے:

> ''میں نے دین حق کو پھیلانے کے لیے یہ طریقہ اختیار کیا کہ تمام مسلمانوں کا ایک صدر مقرر کر دیا جو کہ ان سے اوقات کی پابندی کراتا۔ متولین مساجد اور مؤذنین مقرر کیے۔ قاضیوں، مفتیوں اور محتسبوں کا تعین کیا اور علماء و مشائخ کے لیے جاگیریں اور وظیفے مقرر کیے''۔

امیر تیمور نے شہر میں مدارس کھولے جہاں قابل اور نامور اساتذہ مسلمانوں کو دینی علوم کی تعلیم دیا کرتے تھے۔ ہیرلڈیم لکھتا ہے:

> ''شہر ثمر قند امیر تیمور کے ہاتھوں میں آکر ایشیا کا روما بن گیا۔ ارباب علم و فضل کے لیے بڑے بڑے مدرسے اور کتب خانے قائم کیے۔ ثمر قند میں ایک قدیمی مدرسہ ''مدرسہ بی بی خانم'' تھا جسے تیمور کی چینی بیوی نے قائم کرایا تھا۔ تیمور کے بیٹے شاہ رخ اور اس کے پوتے الغ بیگ نے ہرات کو بھی علم و ہنر کا مرکز بنا دیا تھا۔ یہاں بڑے بڑے مدارس قائم ہوئے۔ مدرسہ نظامیہ اور مدرسہ عثمانیہ ان میں بہت مشہور تھے۔ ترک ملوک اور امراء نے ترکستان کو اسلامی علوم کا مرکز بنایا۔ ترکستان کے شہر بخارا، ثمر قند، مرو، ہرات، ترمذ، بلخ اور کاشغر اسلامی علوم کا سرچشمہ تھے۔ بخارا کے 'مدرسہ مردہرہ' میں پانچ ہزار کے قریب طلبہ تعلیم حاصل کر رہے تھے''۔[17] مدرسہ ''کوطلناس'' (قائم شدہ 1426ء) میں ایک سو پچاس کمرے تھے۔ مدرسہ ''میر عرب'' (قائم شدہ 1529ء) میں ایک سو کمرے تھے۔ بخارا کا یہ مدرسہ وسط ایشیا کے قدیم ترین مدرسوں میں سے ایک ہے۔

---

[17]- تاریخ دولت عثمانیہ، ڈاکٹر محمد عزیز، ص: 384-402

جزیرہ جاوا کے مدارس

انڈونیشیا کے جزیرہ جاوہ کے مدارس کے متعلق سر تھامسن ارنلڈ اپنی کتاب 'پریچنگ آف اسلام' میں لکھتا ہے کہ 1883ء میں جزیرہ جاوہ میں 10913 مدرسے تھے جن میں 6466 طالب علم دینیات پڑھتے تھے۔ 1882ء کے بعد تین سال کے عرصہ میں مدارس اسلامیہ کی تعداد میں 33 فیصد کا اضافہ ہو گیا اور 1885ء میں 16760 مدرسے ہو گئے جن میں 255148 طلبہ پڑھتے تھے۔

غزنی میں مدارس کا قیام

غزنوی خاندان نے علم و فن کے ترویج و اشاعت میں عالی شان درسگاہیں قائم کیں۔ سبکتگین کے تیسرے بیٹے ابو المظفر رضا نے نیشاپور میں مدرسہ سعیدیہ قائم کیا جس کو مؤرخین امہات المدارس میں شمار کرتے ہیں۔ سلطان محمود غزنوی (وفات:410ھ) نے اپنے دارالحکومت غزنی میں ایک عظیم الشان دارالعلوم قائم کیا جس میں اس دور کے عظیم علماء درس دیا کرتے تھے۔تاریخِ فرشتہ کے مطابق سلطان کے بیٹے شہاب الدین مسعود(422ھ- 432ھ) نے تمام شہروں میں اس قدر مدارس و مساجد تعمیر کروائیں کہ ان کی تعداد بیان کرنے سے قاصر تھے۔روضۃ الصفا کا مصنف لکھتا ہے کہ مسعود نے ممالک محروسہ کے مختلف حصوں میں اس کثرت سے مساجد اور مدارس تعمیر کروائے کہ ان کا شمار بھی مشکل ہے۔

ابراہیم بن مسعود(451ھ-492ھ) نے غزنی اور اطراف میں چار سو سے زیادہ مدارس اور مساجد تعمیر کروائیں۔[18] امین احمد رازی مصنف 'ہفت اقلیم' کے بیان کے مطابق غزنی میں مدرسوں اور مسجدوں کی تعداد بارہ ہزار کے قریب تھی۔ غزنوی خاندان کے بعد غوری خاندان کا عروج ہوا۔ سلطان محمود غوری نے صاحب تفسیر کبیر امام فخر الدین رازی کے لیے ہرات میں جامعہ مسجد کے قریب مدرسہ بنوایا۔

---

[18]- روضۃ الصفا

برصغیر میں اسلامی تعلیم کی تاریخ

ڈاکٹر محمد قاسم زمان/محمد جان اخونزادہ

برصغیر کا دینی مدارس کا نظام اور بالخصوص درسِ نظامی کا نصاب کئی اہم خصوصیات کا حامل ہے۔اگرچہ اس پر شروع سے ہی نقد بھی ہوتا رہا ہے اور اس میں اصلاحات بھی تجویز کی جاتی رہی ہیں۔ اس مضمو ن میں درسِ نظامی کے مختلف پہلوؤں پرروشنی ڈالی گئی ہے۔یہ مضمون دراصل ڈیل ایف آئکلمان (Dale F. Eicklman) کے اعزاز میں انگریزی میں مرتب کی گئی کتاب Knowledge Authority and Change in Islamic Societies: Essays in the Honor of Dale F کا دوسرا باب ہے، جسے ڈاکٹر محمد قاسم زمان نے تحریر کیا ہے۔ ڈاکٹرمحمد قاسم زمان پاکستانی امیریکن دانشور ہیں،جو امریکا میں پرنسٹن یونیورسٹی کے پروفیسر ہیں۔مضمون کا ترجمہ و تلخیص محمد جان اخونزادہ نے کیا ہے جو لیکچرر،مترجم اور اسلامی علوم کے ماہر ہیں۔

مدارس کے باضابطہ قیام کی روایت دسویں صدی میں خراسان سے شروع ہوئی، جو دیکھتے ہی دیکھتے گیارھویں صدی تک عالم اسلام کے شرق وغرب میں پھیل گئی۔ سلجوق وزیر نظام الملک (متوفی 1092ء) نے ایران و عراق کے دس شہروں میں 'نظامیہ' مدارس قائم کیے۔1234ء میں بغداد میں عباسی خلیفہ مستنصر باللہ (1226-1242ء) نے ایک ممتاز مدرسے 'مستنصریہ' کی بنیاد رکھی، جس میں پہلی بار بیک وقت چاروں فقہی مذاہب کی تعلیم دی جانے لگی۔ ایران میں ایل خانوں (1335-1260) اور تیموریوں (1370-1507) کے قائم کردہ مدارس بیک وقت تعلیمی و خیراتی مراکز تھے، جن میں مساجد کے ساتھ شفاخانے اور خانقاہیں بھی تھیں۔ان کی وسعت اور کارکردگی قرن اول کے شاندار ترین مدارس سے بھی فائق تھی۔

تاہم اس عہد میں تعلیم کسی انتظامی ڈھانچے یعنی عمارت، طلبہ واساتذہ کی متعین تعداد،انتظامیہ، داخلے یا کورس کے امتحانات، نصاب، چند مخصوص گھنٹوں پر مشتمل درس وغیرہ کے بجائے علم کی ترسیل کی ایسی سرگرمیوں سے عبارت تھی، جس میں اساسی کردار شیخ کا تھا۔ان سرگرمیوں میں متون اور ان

کے حواشی کا مطالعہ، زیر مطالعہ مواد کی پیچیدگیوں کو حل کرنا، ان پر اٹھنے والے سوالات پر بحث ومباحثہ کرنا، اور کسی متن کی تلخیص یا حاشیہ لکھنے کی مہارت حاصل کرنا شامل ہیں۔ اس کو ایک دل چسپ واقعے سے سمجھا جا سکتا ہے۔ حضرت شاہ عبد العزیز رحمہ اللہ کے پاس ایک قوال اپنی نومولود بیٹی کا نام رکھوانے کے لیے آیا۔ شاہ صاحب نے نام رکھنے کے بعد اس سے ہندی راگ دھناسری سنانے کی فرمائش کی۔ قوال نے کہا کہ اس ہندی راگ کے بجاے آپ کا عربی کلام سنا دیتا ہوں۔ شاہ صاحب نے ہندی راگ پر اصرار کرتے ہوئے فرمایا کہ یہ کوئی مدرسہ نہیں جہاں عربی کلام سنایا جائے۔ حالانکہ یہ وہی درس گاہ تھی، جہاں شاہ صاحب اپنے شاگردوں کو پڑھایا کرتے تھے۔ دراصل شاہ صاحب کا مطلب یہ تھا کہ جب تعلیم وتدریس کی مخصوص سرگرمیاں جاری ہوں، تو یہ مدرسہ ہوتا ہے، اس کے بعد نہیں۔

تعلیم و تصوف

اس عہد میں تعلیم اور تصوف دونوں لازم وملزوم تھے۔ تمام طلبہ علوم ظاہرہ کے ساتھ علوم باطنہ کی تعلیم بھی پورے اہتمام سے حاصل کرتے تھے۔ ان کی علمی اور عملی کاوشوں پر تصوف کے گہرے اثرات ہوتے تھے۔ مثلاً حضرت شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ (1762) نے فقہ، حدیث و تفسیر کے ساتھ نقش بندی سلسلے کی کتابوں کی باضابطہ تعلیم اپنے والد سے حاصل کی۔ انھوں نے تصوف پر کئی کتابیں لکھی، اور ان کی علمی کاوشوں پر اس کے گہرے اثرات ہیں۔ بحر العلوم علامہ عبد العلی لکھنوی (1810ء) نے علومِ ظاہرہ کے ساتھ شدید اشتغال کے باوجود مشہور صوفی عالم شیخ اکبر ابن العربی کی تعلیمات کی روشنی میں مولاناے روم (1273ء) کی مثنوی کی عمدہ شرح لکھی۔ شاہ صاحب کی طرح ان کی علمی و عملی زندگی پر بھی تصوف کا گہرا اثر تھا۔

سرکاری سرپرستی

تعلیم کے فروغ میں سرکاری سرپرستی کا کردار بھی بہت اہم تھا۔ اورنگ زیب عالم گیر طلبہ کے لیے ان کے درجے کے حساب سے (میزان منشعب کے طالب علم کو چار آنے اور شرح الوقایۃ کے طلبہ کو

آٹھ آنے) روزینہ مقرر کرتا تھا، تاکہ وہ پوری دل جمعی سے حصولِ علم میں مشغول رہیں۔ تعلیم سے فراغت پانے کے بعد امامت وخطابت اور تعلیم وتدریس کے لیے جاگیر اور حسبِ ضرورت روزینہ مقرر کر دیا جاتا تھا۔ تعلیم اور سرکاری سرپرستی کے درمیان تعلق کو ازالۃ الخفاء میں شاہ صاحب کے اس قیاس سے بھی اخذ کیا جا سکتا ہے۔ حضرات شیخین کے مقابلے میں سیدنا علی کی خلافت کو مرجوح ثابت کرنے کے لیے شاہ صاحب ایک فرضی مثال دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ فرض کرو ایک بادشاہ طلبہ کو حکم دے کہ فلاں استاذ سے پڑھو۔ لیکن عملاً تدریس نہیں ہو پاتی۔ اس کا مطلب یہ ہوگا کہ یا تو بادشاہ کا مقرر کردہ شخص حقیقت میں استاذ نہیں، یا یہ کہ کوئی ان سے کوئی پڑھنا نہیں چاہتا۔ اس سے تعلیم کی بابت بادشاہ کے کردار کا اندازہ ہوتا ہے۔ اور اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ تعلیم کے لیے صرف استاذ کا وجود بھی کافی نہیں، بلکہ یہ مخصوص قسم کی تعلیمی سرگرمیوں کے وجود میں آنے کا نام ہے۔ سرکاری سرپرستی کی ایک اور مثال بحر العلوم کی ہے۔ جب وہ لکھنو چھوڑ کر ہندوستان کے مختلف شہروں جیسے رام پور، شاہ جہان پور، بہار، بنگال، کرناٹک گئے، تو ان شہروں میں کئی حکومتی امرا نے ان کا استقبال کیا، اور ان کے لیے مدارس تعمیر کیے۔ کہا جاتا ہے کہ بنگال میں ان کے جانے میں کچھ کردار انگریزوں کی دعوت کا بھی تھا۔

نصابی کتابوں کا انتخاب

علما بسا اوقات حکومتی سرپرستی اور علاقوں کو بدلتے رہتے تھے۔ اس میں بنیادی کردار ان علاقوں میں رائج مخصوص تعلیمی سرگرمیوں اور درسی متون ہوتا تھا۔ مزید برآں نصاب میں شمولیت کے لیے کتاب کا صرف معیاری ہونا کافی نہ تھا، بلکہ اس کا بآسانی دست یاب ہونا بھی ضروری تھا۔ کتاب کی دست یابی اہل علم کے پاس اس کی موجودگی، اساتذہ کی طرف سے اس کی تدریس کی اجازت اور مقامی علمی ماحول اور مخاطبین کے ذوق سے اس کی ہم آہنگی کے مرہونِ منت تھی۔ یہی وجہ ہے کہ بعض فقہا نے مفتیوں کے لیے شرط قرار دیا ہے کہ وہ ایسے مصادر سے فتوے دیں جو وسیع پیمانے پر رائج ہوں۔ کسی علاقے میں رائج کتاب کا حوالہ ایسے علاقے میں دینا جہاں پر وہ رائج نہ ہو، مناسب نہیں۔

مشہور حنفی فقیہ علامہ ابن النجیم (م1563ء) نے شیخ عبد العزیز بخاری کی کتاب المحیط البرہانی کو فتوے کے لیے نا قابل اعتبار قرار دیا تھا۔ علامہ عبد الحہ لکھنوی (م1886) اس کی وجہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ابن النجیم کے دور میں المحیط کے نسخے اس قدر نادر ہو گئے تھے کہ یہ کتاب نا قابل رسائی بن گئی تھی۔ اس وجہ سے انھوں نے اسے فتوے کے لیے غیر معتمد قرار دے دیا، و گرنہ اپنی مشمولات کے اعتبار سے یہ ایک قابل اعتماد ماخذ ہے۔

کسی خاص متن پر شروح اور حواشی لکھنے کے کئی مقاصد تھے جن میں سے طلبہ اور قارئین کے لیے توضیح و تشریح، اپنی علمی حیثیت کا اظہار، طلبہ کو متعلقہ مضمون میں رہ نمائی فراہم کرنا اور حکومتی توجہ کا حصول تھا۔ ان سب سے ہٹ کر ایک بنیادی مقصد کتاب کو اپنے عہد اور مخاطبین کے لیے قابل فہم بنانا تھا۔ شاہ صاحب اپنے 'رسالۂ دانش مندی' میں تدریس کے اصول بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ استاذ کو چاہیے کہ اس کی تقریر قابل فہم ہو، مشکل اور نامانوس اصطلاحات کی وضاحت کرے، مختلف تصورات جن میں اشتباہ کا امکان ہو کو ایک دوسرے سے ممتاز کرے، اور اختلافی مسائل میں تطبیق کی راہ نکالے، طلبہ کی مقامی زبان میں زیر تدریس متن کا ترجمہ کرے، اور مصنف اور اپنے افکار کو ایک ہم آہنگ انداز میں پیش کرے۔ شاہ صاحب کے پیش کردہ یہ اصول جہاں تدریس کے لیے مفید ہیں، وہیں یہ بیرونی علمی روایت کو مقامی قالب میں ڈھالنے کے لیے بھی کار گر ہیں۔

بیرونی علم کو مقامیانے میں شاہ صاحب کا اپنا کردار بھی خاصا نمایاں ہے۔ آپ نے قرآن مجید کا فارسی ترجمہ کیا۔ مذاہب اربعہ، فقہ و تصوف اور مسالکِ تصوف کے اندرونی اختلافات میں تطبیق آپ کا وطیرہ رہا۔ پھر یہ کہ آپ کی تحریروں میں برصغیر کی مقامی تہذیب و ثقافت کی مثالوں کی بھرمار ہے۔ بیرونی علم کو مقامیانے (indigenize) کا ایک اور پہلو یہ تھا کہ نصاب میں معاصر مقامی علما کی کتابوں کو شامل کیا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ ملا نظام الدین سہالوی (م1748) نے درس نظامی اپنے معاصرین ملا محب اللہ بہاری (م 1707) اور ملا جیون امیٹھی (1717) کی کتابیں شامل کیں۔ بعد میں آنے والے علمانے ان کتابوں کو مقامیانے کے لیے ان پر شروح اور حواشی لکھیں۔

متوازی تعلیمی روایتیں

برصغیر میں اٹھارویں صدی کے آخر میں مدارس کی دو ممتاز روایتیں موجود تھیں: معقولی روایت (فرنگی محل/خیر آبادی مکتب) اور حدیثی روایت (ولی اللہی) مکتب۔ لیکن ایسا نہیں کہ فرنگی محل کے فضلا صرف معقولات میں دست گاہ رکھتے تھے، یا ولی اللہی نظام صرف حدیث کی تعلیم تھی، بلکہ ان دونوں روایات کے درمیان کافی مشترکات تھیں۔ مثلا ولی اللہی نصاب میں معقولات کی کئی کتابیں شامل تھیں۔اسی طرح شاہ عبد العزیزؒ معقولات میں ماہر تھے۔ طلبہ عموما دونوں روایتوں سے مستفید ہوتے۔ مثلاً مفتی صدر الدین آزردہ نے منقولات کی تعلیم ولی اللہی سلسلے کے اکابر اہل علم سے حاصل کی، جب کہ معقولات کی تحصیل میں خیر آبادی مکتب سے فیض یاب ہوئے۔اسی طرح عبد الرزاق جمال الدین (م 1889) جو فرنگی محل خاندان کے نامور صوفی تھے، نے حدیث کی تعلیم شاہ عبد العزیز کے تلامذہ سے حاصل کی۔

دونوں روایتوں میں کافی امتیازات بھی تھے۔ مثلا شاہ صاحب نے یونانی علوم، صرف و نحو اور معانی کے ساتھ کثرتِ اشتغال پر سخت تنقید کی ہے، اور انھیں دنیوی علوم قرار دیا ہے۔ایک مقام پر منطق و فلسفہ سے اشتغال رکھنے والوں کو کتوں سے بدتر قرار دیا ہے۔اس کے برعکس فرنگی محل کے نصاب میں تفسیر اور حدیثی متون کی شرح بے حد کم تھی۔ یہی وجہ ہے کہ مولانا ولی اللہ فرنگی محل خانوادے میں وہ پہلی شخصیت ہے جس نے قرآن کریم کی تفسیر لکھی۔ فرنگی محل خاندان کے مشہور صوفی شیخ مولانا انوار الحق جو بحر العلوم کے شاگرد تھے، نے بھی معقولات پر تنقید کی۔ اس خاندان میں علوم حدیث سے اشتغال رکھنے والے علامہ عبد الحی لکھنوی بھی خلاف القیاس ہیں۔ منطق و فلسفے پر شاہ صاحب کی تنقید سے یہ نہ سمجھا جائے کہ وہ معقولات سے اشتغال نہ رکھتے تھے، بلکہ شاہ صاحب کی سب سے اہم کتاب حجۃ اللہ البالغۃ کا مرکزی موضوع ہی عقائد واحکام کی عقلی توجیہات ہیں۔ ان کی تنقید ان لوگوں کے بارے میں ہے جو معقولات کی تعلیم میں غلو سے کام لیتے ہیں، اور دیگر علوم دینیہ کی تحصیل کو نظر انداز کرتے ہیں۔

ولی اللہ مکتب اور فرنگی محلیوں/خیر آبادیوں کے درمیان ایک اور اہم فرق طریقۂ تدریس کا تھا۔ فرنگی محلی نصابِ درس میں ہر فن کے لیے ایک مشکل اور دقیق متن کا انتخاب کیا گیا تھا۔ اس کی توجیہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ اسے پڑھنے سے طالب علم خود بخود دیگر کتابوں کے مطالعے کی استعداد حاصل کر لے گا۔ اس طریق تعلیم سے ایک متوسط طالب علم 16، 17 سال کی عمر میں فارغ ہو جاتا۔ اس عمر میں فراغت میں اچھے خاندانی پس منظر کا بھی کردار ہو گا۔ اس کے برعکس شاہ ولی اللہ کے طریق تدریس میں تقریر کی آسانی اور قابل تفہیم ہونے پر زیادہ زور تھا۔

جدید جنوبی ایشیا اور دنیا میں پھیلی اس کی مہاجر آبادی میں دینی نظامِ درس پر فرنگی محل کے اثرات بھی ہیں، لیکن شاہ ولی اللہ کے اثرات بہت زیادہ نمایاں اور دیرپا ہیں۔ ولی اللہی خان نے قرآن وحدیث سے براہ راست اشتغال رکھا۔ شاہ ولی اللہ کا اثر پھیلانے میں بنیادی کردار دارالعلوم دیوبند کا رہا۔ دیوبندی اکابران کے علمی شجرے سے براہ راست تعلق رکھتے تھے۔ شاہ ولی اللہ کے نظام درس میں سہولت وآسانی کا بھی اس میں کردار رہا ہو گا۔ اٹھارویں اور انیسویں صدی میں فرنگی محل ودیوبند دونوں میں کچھ ایسی شخصیات بھی تھیں، جو اپنی روایت کو جدید تقاضوں سے ہم آہنگ کرنا چاہتے تھے۔ مثلاً فرنگی محل کے آخری ممتاز عالم مولانا عبدالباری، جنھوں نے درس نظامی کی کئی کتابوں پر حواشی لکھے، نے 'سائنس وکلام' کے عنوان سے ایک ضخیم کتاب لکھی۔ اسی طرح دیوبند کے بانی مولانا قاسم نانوتوی، جو اپنے معاصرین کے برعکس معقولات سے اچھا خاصا اشتغال رکھتے تھے، نے انگریزی زبان کے سیکھنے کی خواہش ظاہر کی تھی۔ تاہم دیوبند میں فقہ وحدیث کو بنیادی مقام حاصل رہا۔ اس کی کئی وجوہات تھیں۔

ایک یہ کہ انیسویں صدی کے اواخر میں مغربی تعلیم کے زیر اثر جدید عقلیات نے اپنے لیے جگہ پیدا کر لی، اور اس کے نتیجے میں مدارس میں پڑھائی جانے والی معقولات اپنی حیثیت کھو بیٹھیں، لیکن دینی مصادر کی جگہ کوئی اور چیز نہیں لے سکی، بلکہ معقولات کے زوال سے قرآن وسنت کی گرفت نہ صرف مدرسہ میں بلکہ مدرسے سے باہر مغربی تعلیم یافتہ حلقوں پر بھی مضبوط ہو گئی۔ دوسری یہ کہ

فرنگی محل کے برعکس دیوبند کا انداز تحریکی تھا، جس سے بڑے پیمانے پر مدارس وجود میں آئے۔ اس کی وجہ سے دیوبند کا علمی و فکری سلسلہ پھلا پھولا اور فرنگی محل پس منظر میں چلا گیا۔ ایک اور اہم وجہ یہ تھی کہ فرنگی محل سے جُڑے اہلِ علم کا انحصار حکومت واَصحابِ ثَروت کے تعاون پر تھا۔ ہندوستان میں جب اسلامی حکومتوں اور مسلم اصحابِ ثروت کو زوال ہوا، تو ان پر انحصار کرنے والے اہل علم اور تعلیمی ادارے بھی زوال پذیر ہو گئے۔ اس کے برعکس دیوبند نے ایک نیا تنظیمی ماڈل پیش کیا جس میں مدارس کا بنیادی دار و مدار عوامی چندے پر تھا، اور اصحاب حکومت وثروت کا کردار ثانوی تھا۔ دیگر مسالک نے بھی اس ماڈل کو اختیار کیا۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے پورے استعماری ہندوستان میں مدارس کا جال بچھ گیا۔ دنیا کے دیگر خطوں میں استعماری ادوار میں دینی تعلیم کو زوال ہوا، لیکن ہندوستان میں بڑے پیمانے پر دینی تعلیم کو ترقی ہوئی۔

استعماری دور میں ہی مدارس ایک ماہر استاذ کے زیر نگرانی مخصوص تعلیمی سرگرمیوں کے بجاے ایک جدید ادارہ جاتی نظام میں بدل گئے۔ انیسویں صدی کے اواخر میں قائم ہونے والے مدارس انگریزوں کی متعارف کردہ پبلک ایجوکیشن کا متبادل تھے، اس کے باوجود انھیں پبلک سکولوں کے ماڈل پر استوار کیا گیا۔ درجہ بندی اور امتحانات، تقریب انعامات، سالانہ دستار بندی وغیرہ کا نظام متعارف ہوا۔ دیوبندی، بریلوی اور اہل حدیث مکاتب فکر اپنی مخصوص مسلکی شناخت کو قائم رکھتے ہوئے ایک مشترک نظام تعلیم میں بندھ گئے۔ جدید ادارہ بندی سے نصاب میں استحکام اور یکسانیت پیدا ہوئی، اور پورے برصغیر میں درس نظامی رائج ہو گیا۔ علما کی جانب سے تبدیلی کی مزاحمت کے باوجود مدارس کا نصاب و نظام ارتقا پذیر رہا۔

استعماری عہد میں مسلم دنیا کا تعلیمی نظام اور اصلاحات کی شروعات

محمد اسرار مدنی

محققین مدرسۂ نظامیہ بغداد کو "اسلامی نشأة ثانیہ" کا ادارہ قرار دیتے ہیں۔اسے عظیم سلجوق سلطنت کے وزیرنظام الملک ابو علی حسن ابن علی الطوسی نے گیارہویں صدی میں قائم کیا تھا۔ نظام الملک خود بھی اعلی علمی شخصیت تھے اور اہلِ علم کو اپنے قریب رکھتے تھے۔ ان کی دینی خدمات کی وجہ سے علما نے انھیں "قوام الدین " کا لقب عطا کیا۔ نظام الملک نے نیشا پور اور دوسرے شہروں کے مدرسہ نظامیہ کی طرز پر مدرسے قائم کیے۔ یہ مدارس اسلامی دنیا میں اعلی تعلیم کے منظم ادارے تھے۔بعد میں منگولوں نے جب حملے کیے تو انہوں نے مدرسوں کو بھی تباہ کیا۔ لیکن بعد میں عثمانی سلطنت نےنظامیہ مدارس کے ماڈل کو اپنا کر اسے جاری رکھا۔یہ تعلیمی ڈھانچہ کس طرح اونچ نیچ کا شکار ہوا،اور استعماری عہد میں بالخصوص اس میں کیا اصلاحات لانے کی کوشش کی گئی،اس مضمون میں اسی کو موضوع بنایا گیا ہے۔ مضمون نگار مجلہ تحقیقات کے مدیر اعلی اور 'انٹرنیشنل ریسرچ کونسل برائے مذہبی امور' کے سربراہ ہیں۔

بغداد کا مدرسہ نظامیہ مسلم تہذیب میں نمایاں حیثیت کا حامل رہا ہے،اور اس کے اثرات کافی وسیع رہے ہیں۔ یہ نظام تعلیم ایک ماڈل کے طور پہ طویل عرصے تک باقی رہا ہے۔استعماری عہد کی شروعات تک کے مرحلے میں مسلم دنیا کے اندر اسی سے ملتا جلتا تعلیمی نظام قائم رہا۔ سلطنت عثمانیہ نے اسی نظام کی سرپرستی کی اور انفرادی سطح پر بھی مسلم خطوں میں اس کو باقی رکھا گیا۔اگرچہ عثمانی سلطنت یورپ کی فکری بیداری اور اس کی علمی تحریکوں سے بہت پہلے واقف ہو چکی تھی لیکن وہ اس نئی اٹھان کے اثرات و افادیت کو تسلیم کرنے سے قاصر رہی۔ عثمانی سلطنت کے پاس وسائل بھی خوب تھے اور اگر حکمران چاہتے تو اس تعلیمی اصلاحات کو پوری مسلم دنیا میں متعارف کرا سکتے تھے۔ لیکن عملا ایسا ممکن نہیں ہوا۔ بلکہ عثمانی خلافت کے آخری ادوار میں جب سلاطین کو احساس ہوا کہ مغرب کی اٹھان کے پیچھے دراصل تعلیمی تحریک ہے تو سلاطین اس وقت تنازعات میں گھر چکے تھے

اور خارجہ سطح پر انہیں کئی چیلنج درپیش تھے۔ تب ان کے پاس وسائل کی محدودیت بھی ہو گئی تھی اور یکسوئی بھی باقی نہ تھی۔ اس لیے تعلیمی اصلاحات جو ممکن ہو سکیں وہ ترکی کے اندر تک رہیں جو عملی حیثیت میں زیادہ مؤثر بھی ثابت نہ ہو سکیں۔

مسلم دنیا میں تعلیمی اصلاحات کی انفرادی کوششیں

دیکھا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ استعماری عہد میں مسلم دنیا کے بعض خطوں میں انفرادی سطح پر ہی تعلیمی اصلاحات کی کوششیں شروع کر دی گئی تھیں۔ اگر اُس وقت کے مؤرخین و مفکرین کی تحریروں کا جائزہ لیا جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ بعض مسلم خطوں میں یہ تاثر قائم ہو گیا تھا کہ عثمانی سلاطین ان کی تعلیمی پسماندگی کا سبب تھے۔ بہر حال استعماری عہد میں انفرادی سطح پر جو تعلیمی تحریکیں شروع ہوئیں ان کے اثرات بہت وسیع رہے۔ اس میں عرب دنیا کے اندر مصر کی تعلیمی تحریک بہت مؤثر ثابت ہوئی اور اس نے پورے عرب خطے کو متاثر کیا۔

مصر میں میں تعلیمی اصلاحات کی سرگرمیاں

مسلم دنیا میں مصر وہ ملک ہے جہاں مذہبی تعلیم کے حوالے سے وسیع پیمانے پر اصلاحات کی کوششیں ہوئیں۔ اس میں مصر کے بڑے تعلیمی اداروں نے کوئی رکاوٹ نہیں ڈالی، بلکہ ان اصلاحات کو قبول کیا۔ مصر کے اند اُنیسویں صدی کی ابتداء میں جن شخصیات نے مذہبی تعلیم میں اصلاحات کے لیے ڈول ڈالا اور عملی کوششوں کی ابتداء کی ان میں جمال الدین افغانی، محمد عبدہ، خیر الدین پاشا اور رفاعہ طہطاوی کا نام لیا جاتا ہے۔ جبکہ ایک اور شخصیت علی پاشا مبارک کی بھی تھی جنہیں مصر میں اُس وقت 'ابو التعلیم' کا لقب ملا۔ جبکہ محمد عبدہ وہ شخصیت ہیں جنہوں نے جامعہ ازہر میں تعلیمی اصلاحات کو متعارف کرایا تھا اور انہی کے توسط سے جامعہ ازہر میں بہت سی تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ اُس وقت ملک کے دینی اداروں میں دیگر ادیان سے متعلق کتب شامل کی گئیں، تاکہ طلبہ میں اسلام کے علاوہ دیگر مذاہب کے بارے میں غیریت کے تصور کو ختم کیا جاسکے اور ہم آہنگی کا شعور پیدا کیا جائے۔ اسی شہریت اور حقوق کے موضوعات پر بھی اسلامی تعلیمات کی روشنی میں مواد شامل کیا گیا تھا۔ مدارس

سے ہٹ کر اگر انفرادی سطح پر دینی تعلیم میں اصلاحات سے متعلق لکھی گئی کتب کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ مسلم دنیا میں مصر اور شام وہ دو ممالک تھے جہاں اس طرح کا مواد کثرت کے ساتھ شائع ہوا۔ بلکہ مصر میں تو اُس وقت قرآن کریم کی متعدد سائنسی تفاسیر بھی لکھی گئیں۔ اخبارات میں بھی بہت سے مباحثے ہوئے اور مذہبی و لبرل مفکرین سب اس موضوع پر لکھتے تھے۔

ایشیائی مسلم ممالک میں تعلیمی اصلاحات

استعماری عہد میں جنوب مشرقی ایشیائی مسلم ممالک میں ملائیشیا کے اندر پہلے تعلیمی اصلاحات متعارف ہوئیں۔ ملائشیا میں اسلام کے ورود کے ساتھ ہی دینی تعلیم کا باقاعدہ نظام شروع ہو گیا تھا۔ بلکہ ملائیشیا اور اور انڈونیشیا میں جو سیاسی و سماجی سطح پر مذہبی عنصر کا رسوخ نظر آتا ہے، اس کی وجہ بھی یہی ہے کہ یہاں کے تعلیمی ڈھانچے میں مذہبی عنصر بہت پہلے سے موجود رہا ہے۔ ملائشیا میں انیسویں صدی میں ہی اقامتی مذہبی ادارے موجود تھے جہاں مصری دینی تعلیم کی طرز پہ مناہج کی تدریس ہوتی تھی۔ چونکہ ملائیشیا نے دینی تعلیم کے زمرے میں برصغیر کی بجائے مصر کے ساتھ ربط رکھا، اس لیے مصر کی طرح وہاں بھی دینی تعلیم میں اصلاحات شروع میں ہی ظاہر ہونے لگی تھیں۔ آج بھی ملائیشیا میں دینی سطح پر ازہر اور مصری مذہبی اداروں کا اثر و رسوخ زیادہ ہے۔ اس لیے وہاں جو مدارس قائم ہیں وہ برصغیر کے مدارس اور مناہج سے کافی مختلف ہیں۔

برصغیر میں تعلیمی تحریکیں

اس کے علاوہ برصغیر میں بھی استعماری عہد میں تعلیم کے بارے میں بہت زیادہ حساسیت ابھر سامنے آئی۔ چند ایک نصاب مرتب کیے گئے جن میں آراء کے اختلاف کی بنا پر فرق بھی تھا۔ مختلف مدارس وجود میں آئے۔ اس کے علاوہ سر سید کی تحریک اٹھی جس کے اپنے اثرات تھے۔ برصغیر کے تعلیمی نصاب پر الگ سے بات چند صفحات مخصوص ہیں۔ سر دست یہاں عثمانی عہد میں تعلیمی اصلاحات کا جائزہ پیش کیا جاتا ہے۔

سلطنت عثمانیہ میں جدید تعلیم کی ابتداء وارتقاء

سلطنت عثمانیہ میں دوسرے اسلامی ممالک کی طرح دینی تعلیم کو خاص اہمیت حاصل تھی۔ روایتی اسلامی مدارس میں بالغان کو دینی تعلیم دی جاتی تھی۔ ان روایتی مدارس کے علاوہ بعض مخیر حضرات نے بچوں کی تعلیم کے لیے شہروں، قصبوں اور گاؤں میں مدارس الصبیان/ الکتاتیب کے نام سے سکول کھولے ہوئے تھے۔ دونوں طرح کے تعلیمی اداروں میں تدریس کے فرائض علماء دین سرانجام دیتے تھے۔

سلطنت عثمانیہ کے اولین سلاطین اور امراء، عسکری اور انتظامی امور کے ساتھ ساتھ تعلیمی امور کا اہتمام بھی کرتے تھے۔ انہوں نے سلطنت کے مختلف حصوں میں روایتی اسلامی مدارس قائم کیے اور ان میں تدریس کے لیے پورے عالم اسلام سے علماء کو بلایا۔

1453ء میں فتح قسطنطنیہ کے بعد سلطان محمد فاتح نے استنبول میں جامع مسجد کے اطراف میں اعلی تعلیم کے آٹھ مدارس قائم کیے جن کو "صحن ثمان" کا نام دیا گیا۔ ان مدارس میں داخلے کے لیے اہل طلبہ کو تیار کرنے کے لیے ابتدائی تعلیم کے مدارس بھی کھولے گئے۔ سلطان محمد فاتح نے اعلی تعلیم کے ان آٹھ مدارس میں سے دو مدارس میں ایسا نصاب مختص کرنے کا حکم دیا تھا جو بچوں کے مدارس کے لیے اساتذہ تیار کرنے کے لیے موزوں ہو۔ انہوں نے بچوں کے مدارس میں ایسے لوگوں کو بطور معلم تعینات کرنے سے منع کر دیا تھا جنہوں نے عربی صرف و نحو، بلاغت، منطق حساب، اصول تدریس، علم الحال (علوم دینیہ) ریاضیات، ہندسہ اور علم ہیئت کے علوم نہ سیکھے ہوئے ہوں۔

سلطان سلیمان القانونی نے مدرسہ سلیمانیہ کھول کر سلطنت عثمانیہ کی تاریخ میں نئے باب کا اضافہ کیا۔ اس نے اپنی تعمیر کردہ مسجد کے قریب مدرسہ طب اور ہسپتال بنائے۔ مدرسہ سلیمانیہ اور مدرسہ طب فوج کے لیے درکار انجینئروں اور ڈاکٹروں کو تیار کرنے کے لیے بنائے گئے تھے۔ اس نے علم ریاضیات کے لیے چار مدارس اور ایک دار الحدیث بنایا۔ سلیمان نے استنبول کے علاوہ اناطولیہ کے بڑے مراکز میں بھی یہ مدارس قائم کیے۔

عہد عثمانی سے پہلے کے قائم کردہ مدارس کو نہ صرف بحال رکھا گیا بلکہ ان کی ترقی اور دوام کے لیے اوقات وقف کیے گئے۔ مختلف ولایتیں اپنی آمدن کے ذرائع میں سے کچھ مدارس کے لیے وقف کرتیں۔ سلاطین امراء اور اغنیاء بھی اپنی ملکیتوں میں سے کچھ حصہ مدارس کے لیے وقف کرنے سے نہیں کتراتے تھے۔

زوال

روایتی اسلامی مدارس کا سلطنت عثمانیہ کی ترقی اور نشوونما میں اہم کردار تھا۔ سترھویں صدی عیسوی تک یہ مدارس مطلوبہ توقعات کے مطابق اپنا کام کرتے رہے۔ لیکن اس کے بعد ان کے اوقاف اور نظام میں خلل و گراوٹ کے سبب ان مدارس کی معاشرے اور ملک کے لیے خدمات سست پڑ گئیں اور یہ معاملہ بھی ملک کے نظام سے مبراء نہیں تھا جو زوال اور پستی کا شکار تھا۔

سلطنت عثمانیہ کے بعد کے ادوار میں نظام تعلیم کی اصلاح کی اشد ضرورت رہی۔ خاص طور پر جب ملک کو عسکری اور معاشی میدانوں میں ہزیمت اٹھانی پڑی تو نظام تعلیم کی کمزوریوں کو دور کرنا حکام کی ذمہ داری تھی۔ مگر تعلیم کی اصلاح کے لیے جو کوششیں کی گئیں وہ ناکافی تھیں۔

آخری ادوار میں تعلیمی اصلاحات کی کوششیں

محمود ثانی کے دور حکومت (1808-1839ء) میں جب معاشرتی زندگی میں وسیع اصلاحات کی تحریک شروع ہوئی تو تعلیم کو ان اصلاحات میں خاص اہمیت دی گئی اور یہ محسوس کیا گیا کہ موجودہ حالت میں تعلیم ملکی ضروریات اور مطالبات کو پورا نہیں کر سکتی۔ لہذا تعلیم کو جدید خطوط پر استوار کرنے کے لیے مغربی طرز پر نئے تعلیمی ادارے کھولے گئے، تاکہ ان سے فارغ التحصیل طلبہ ملک کی معاشی، اجتماعی اور ادارتی اصلاح کے قابل ہوں۔ لیکن سلطان محمود ثانی اس سلسلے میں عملی قدم اٹھانے میں اپنی حکومت کے آخری دو سالوں میں کامیاب ہوئے۔ کیونکہ محمد علی پاشا کی مصر میں بغاوت نے ملک کو الجھائے رکھا۔ محمود ثانی نے تعلیم کے میدان میں "مجلس امور النافعہ" کے قیام کا

حکم دیا تاکہ ضروری تعلیمی اداروں کا لائحہ عمل اور مدارس الصبیان کی تنظیم کا خاکہ تیار کر سکے۔[1]

امور سلطنت کے ذمہ داران نے روایتی اسلامی مدارس کو نظر انداز نہیں کیا لیکن مدارس الصبیان کو تعلیم کی بنیاد ہونے کے سبب خصوصی توجہ دی گئی۔

مجلس نے 5 فروری 1839ء میں ایک لائحہ عمل پیش کیا۔ جس میں تعلیم کی اصلاح کی ضرورت پر زور دیا گیا اور ملک کو پستی سے نکالنے کے لیے تعلیم کی ترقی و توسیع کو ضروری قرار دیا گیا۔ ملک اور عسکری شعبہ کی ترقی کے لیے ایسے جدید تعلیمی اداروں کے قیام کو ضروری قرار دیا گیا جو عصری تقاضوں کو پورا کرنے کی صلاحیت رکھتے ہوں۔

محمد علی پاشا کی مصر میں بغاوت اس دور میں اپنے عروج کو پہنچی ہوئی تھی اور عثمانی عسکری قوتیں ان پر غلبہ پانے میں ناکام ثابت ہو رہی تھیں۔ ان حالات نے ملک کو اپنی صلاحیتوں کو بڑھانے کے لیے انتہائی کوششوں پر مجبور کر دیا۔ مجلس نے اپنے لائحہ عمل میں یورپ کی علمی ترقی اور اس کی بدولت جنگی میدانوں میں عسکری برتری کی طرف اشارہ کیا اور ساتھ یہ اعتراف بھی کیا کہ دولت عثمانیہ اپنے عروج کے زمانہ میں تعلیم اور علوم میں آگے تھی لیکن یہ سلسلہ برقرار نہیں رہ سکا۔ اور ان کا اہتمام بتدریج کم ہوتا گیا۔ اگرچہ ملک میں عسکری، انجینئرنگ اور طبّی شعبوں میں چند اعلیٰ ادارے قائم کیے گئے مگر یہ مدارس ناکافی تھے اور مطلوبہ حاجات کو پورا نہیں کرتے تھے۔ اس کے لیے ابتدائی تعلیم کی اصلاح کو ناگزیر قرار دیا گیا۔ اس کے لیے جو لائحہ تیار کیا گیا وہ یہ تھا:

- ابتدائی تعلیم کو لازمی قرار دیا گیا۔
- انفرادی تعلیم سے اجتماعی تعلیم کی طرف توجہ۔
- اساتذہ کو اپنی خواہشات کے مطابق پڑھانے کی اجازت نہیں ہو گی۔
- مدارس کے نصاب تعلیم کو انسپکٹرز اور نگرانوں کی مرضی کے ماتحت کرنا۔
- مدارس میں اساتذہ کو بہتر تعداد میں تعینات کرنا۔[2]

---

[1] - سالنامہ نظارت معارف عمومیہ، 1316ھ، 17

- ایسے بے گھر بچے جن کے سرپرست نہیں ان کے لیے اقامتی درس گاہیں قائم کرنے کی سفارش کی گئی۔

الباب العالی، دارالشوری اور دیوان الاحکام العدلیہ کی طرف سے بعض ترامیم کے بعد سلطان نے لائحہ عمل کی منظوری دے دی۔ اس کے فوری بعد "مدرسۃ المعارف العدلیۃ"[3] کی بنیاد رکھی گئی اور استنبول کے مختلف حصوں میں پانچ مدارس رشدیہ کھولے گئے۔

سلطان عبدالحمید کے عہد میں تعلیمی اصلاحات

سلطان عبدالحمید کے دور کو تنظیمات کا دور کہا جاتا ہے۔ صدر اعظم رشید پاشا نے 1839ء میں فرمان جاری کیا، اس فرمان میں ملک کے سیاسی اور اجتماعی نظام میں بعض اصلاحات جاری کی گئیں۔ سلطان عبدالحمید نے 1856ء میں ایک دوسرا فرمان "فرمان الاصلاحات" جاری کیا۔ اس میں تعلیم پر خصوصی توجہ دی گئی۔

1845ء کے فرمان میں تسلیم کیا گیا کہ تعلیم کے میدان میں اب تک جو تدابیر اختیار کی گئیں ان کے مثبت نتائج نہیں نکلے۔ سلطان نے اس پر افسوس کا اظہار کیا اور اس سلسلہ میں کچھ اقدامات کا اعلان کیا جیسے جہالت کا خاتمہ کرنا، تعلیم کو عام کرنا اور اسے عام زندگی سے ہم آہنگ بنانا اور پوری سلطنت میں مدارس کا جال بچھانا۔ اس کے بعد تعلیم سے متعلق اقدامات میں تیزی آگئی۔

1839ء میں مدارس رشدیہ کے معاملات کی نگرانی کے لیے "نظارۃ الدراسۃ الرشدیۃ" بنائی گئی۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ ریاست نے صرف مدارس کو کھولنے کی کوشش نہیں کی بلکہ ان مدارس کی تنظیم اور بہتری کی طرف بھی توجہ دی۔ لیکن ریاست کے اندر تمام مدارس حکومتی نگرانی میں نہیں

---

[2] - فاضل بیات، المؤسسات التعلیمیۃ فی المشرق العربی العثمانی، 17

[3] - مکتب معارف عدلیہ۔ یہ ایلیمنٹری سطح کا تعلیمی ادارہ 1837ء میں ریاستی اداروں کے ملازمین کی تعلیم کے لیے قائم کیا گیا۔ اس سکول میں عدلیہ کا لفظ عدل یا قانون کے معنوں میں استعمال نہیں کیا گیا بلکہ یہ سلطان محمود الثانی کے لقب "عدلی" کی نسبت سے استعمال ہوا۔ یہ مدرسہ 1862ء تک قائم رہا۔

تھے۔ 1840ء تک یہی صورت حال رہی۔ 1840ء میں ''مجلس المعارف الموقت'' قائم کی گئی۔ ایک سال بعد اس کو ''مجلس العارف العام'' میں تبدیل کر دیا گیا جو تعلیم کے بارے میں براہ راست جواب دہ ہو گی۔ اسی سال نظارۃ المدارس العمومیۃ بنائی گئی۔ تاکہ مجلس المعارف العام کی قرار دادوں کی تنقید کا جائزہ اور نظر رکھی جا سکے۔ مگر یہ ادارہ بھی سابقہ اداروں کی غیر موثر رہا۔ مدارس رشدیہ ان سے باہر رہے۔ 1849ء میں یہ مدارس نظامت کے ماتحت ہوئے۔ اس زمانے میں مدارس رشدیہ کی تعداد میں اضافہ ہوا لیکن اس میں اساتذہ علمی اور تربیتی لحاظ سے اہل نہیں تھے۔ 1848ء میں استنبول میں دار المعلمین کے نام سے اساتذہ کی تربیت کے لیے پہلا مدرسہ کھولا گیا۔

مدارس اور اس میں پڑھنے والے طلبہ کی کثرت نے درسی کتابوں کی مانگ بڑھا دی۔ اس لیے 1849ء میں یورپ سے پرنٹنگ پریس مشینری منگوائی گئی تاکہ کتابوں کی مانگ کو پورا کیا جا سکے۔ حکومت اب تک تمام مدارس کے لیے یکساں درسی کتابیں تجویز نہ کر سکی تھی۔ اس لیے 1851ء میں انجمن دانش کے نام سے انجمن بنائی گئی تاکہ یہ دولتِ عثمانیہ میں تعلیم کا سب سے اعلی وارفع ادارہ بنے۔ اس کے۔ اصل ممبران کی تعداد چالیس تھی جو ریاست کے بڑے بڑے عہدے دار تھے۔ جبکہ غیر اصل ممبران کی تعداد غیر متعین تھی۔ اس انجمن میں صدر اعظم، شیخ الاسلام، سپہ سالار، رئیس المجلس العالی، وزیر خارجہ اور وزیر تجارت شامل تھے۔ اس انجمن نے درسی کتابوں کی تالیف و ترجمہ کی ذمہ داری اپنے کندھوں پر لی۔[4]

17 مارچ 1857ء کو سلطنت عثمانیہ میں تعلیم کے میدان میں اہم پیش رفت ہوئی۔ اور وہ ''نظامت معارف عامہ'' کی تاسیس ہے۔[5]

محرم 1285ھ اپریل 1868ء میں غیر ملکی زبانوں کی تدریس کے لیے ''مدرسۃ السلطانیۃ'' کی تاسیس کا فرمان جاری کیا گیا۔ اس مدرسہ میں ملک کے مسلمان اور غیر مسلمان شہریوں کو بلا امتیاز

4- سالنامہ معارف عمومیۃ، 1317ھ، 25

5- ایضاً

داخلے کی اجازت دی گئی۔ اسی دور میں دار الشفعۃ اور مدرسۃ الطبیعۃ الملکیۃ کی بنیاد رکھی گئی۔ اسی سال ملک کی مجلس شوری وجود میں آئی جس نے قرار داد پاس کی کہ وزارۃ المعارف ایلیمنٹری اساتذہ کے لیے استنبول میں دارالمعلمین کی بنیاد رکھے اور ملک کی مختلف ولایتوں میں مدارس رشیدیہ کی تعداد بڑھائے اور استنبول میں لڑکیوں کے لیے مدارس رشیدیہ کھولے۔ ان قراردادوں پر مکمل عمل کیا گیا اور ملک کے مختلف مدارس میں تعلیم کے عمل کی تنظیم بھی کی[6]۔

1869ء میں ''نظام المعارف العام'' کے صدور تک تعلیم یا تعلیمی اداروں کے لیے ہمہ جہت نظام نہیں تھا۔ اس نظام میں ملک کے مختلف حصوں میں تعلیم امور کی تنظیم اور تعلیم کی ترقی و توسیع کو ہدف بنایا گیا۔ یہ نظام پانچ شعبوں پر مشتمل تھا جس میں کل 198 شقیں تھیں۔

پہلا شعبہ مدارس کی کل اقسام اور اس کے درجات سے متعلق تھا۔ مدارس کو پانچ درجات میں تقسیم کیا گیا جو درج ذیل ہیں:

صبیان، رشدیہ، اعدادیہ، سلطانیہ اور عالیہ۔ اعلی تعلیم میں دارالمعلمین، دار المعلمات اور دار الفنون/ یونیورسٹی شامل تھے۔

نظام کا دوسرا شعبہ ''معارف عامہ'' کی تشکیلات سے متعلق تھا۔ تیسرا شعبہ امتحانات کے نظام سے متعلق تھا۔ چوتھا شعبہ اساتذہ سے متعلق تھا اور پانچواں شعبہ المعارف کے مالی معاملات سے متعلق تھا۔ اس نظام میں دار الفنون کے لیے 51 شقیں مخصوص تھیں لیکن اس نے وزارت دفاع کے ماتحت مدارس حربیہ اور طبّی مدارس کے لیے کوئی شق مختص نہیں کی گئی۔ اس نظام میں ''مجلس معارف کبیر'' کے دو شعبے تھے، ایک علمی اور دوسرا اداراتی۔

علمی شعبے کی ذمہ داری درسی اور مختلف علمی کتابوں کی تالیف و ترجمہ اور یورپی یونیورسٹیوں کے ساتھ تعلقات قائم کرنا تھا۔

---

[6]- ایضاً

ادارتی شعبے میں مدارس، معارف کی کمیٹیوں، میوزیم، لائبریریوں، چھاپے خانوں کے ادارتی امور کی مدد کرنا اور تعلیم کے میدان میں کام کرنے والے افراد کے ذاتی معاملات میں مدد کرنا تھا۔

اس نظام نے مدارس کی تمام اقسام اور اس سے متعلقہ تمام امور کو اپنے دائرہ کار میں لیا لیکن روایتی اسلامی مدارس کی طرف توجہ نہ دی گئی۔ بعض محققین نے روایتی اسلامی مدارس سے بے توجہی کو عثمانی تعلیمی سیاست کی کوتاہی قرار دیا ہے۔ جبکہ بعض دوسرے محققین نے اس کا سبب ان مدارس کا وزارت تعلیم کے ماتحت نہ ہونے کو قرار دیا ہے۔

عملی اقدامات کی کمی

نظام المعارف کے تحت تعلیم کے میدان میں ریاست نے جو تجاویز دیں ان میں سے بیشتر پر عمل در آمد نہ ہو سکا۔ تعلیم کی ترقی کے لیے وزارت تعلیم کا کردار عموماً غیر موثر رہا۔ 1876ء میں جب عبدالحمید ثانی نے حکومت سنبھالی تو یہ وزارت ایک ادارتی ادارے سے زیادہ نہ تھی۔ دو ولایتوں کے علاوہ کسی ولایت میں تعلیمی معاملات کو دیکھنے کے لیے کل وقتی ذمہ دار موجود نہیں تھا۔ مالی وسائل اور اساتذہ کی کمی کے باعث تعلیم کی ترقی اور تعلیمی اداروں کے پھیلاؤ کی حکومتی کوششیں غیر مؤثر رہیں۔ 1869ء میں نظام المعارف کی منظوری کے باوجود 1876ء تک استنبول میں چند اور دار الحکومت سے باہر ایک مدرسہ اعدادیہ کی تاسیس ممکن ہوئی اور ریاست نے جو امیدیں باندھی تھیں وہ پوری نہ ہو سکیں۔

اصلاحات کا تیسرا مرحلہ

عبدالحمید ثانی نے 1876ء میں اقتدار سنبھالا تو اس نے مدارس الصنائع کے بانی مدحت پاشا کو صدر اعظم مقرر کیا۔ اس سے ترقی پسند عثمانیوں کی تمنائیں بر آئیں۔ اس نے پہلے سال نئے دستور کا اعلان کیا۔ اس سے اگلے سال سلطنت عثمانیہ کی تاریخ کی پہلی پارلیمان کا افتتاح ہوا جس کا نام "مجلس المبعوثان" تھا۔ لیکن اسی سال روس کے ساتھ جنگ شروع ہو گئی جس میں سلطنت کو شکست ہوئی۔ بلقان اور اناطولیہ کے علاقے کی بہت ساری زمین ہاتھ سے نکل گئی۔ سلطان نے پارلیمنٹ کو اس شکست کا ذمہ دار قرار دے کر مجلس کو برخاست کر دیا۔ اس دور میں تعلیم کے میدان میں کافی ترقی

ہوئی۔ بہت سے پیشہ ورانہ اور فنی تعلیم کے ادارے کھولے گئے۔ تعلیم کے عمل کو جدید طرز پر ڈھالا گیا۔ اور ابتدائی مدارس کو وزارت المعارف سے مربوط کیا گیا۔ اگرچہ مدارس الصبیان میں تدریس سے وابستہ افراد نے اس عمل کی مخالفت کی اور اس معاملے میں مملکت کے فرامین کی مزاحمت کرنے کی کوشش کی اور اس کے لیے مشکلات پیدا کیں۔ پہلی مرتبہ مختلف مدراج کے جدید تعلیمی ادارے قائم ہوئے جن میں اعلی تعلیم کے ادارے بھی تھے۔ اعلی تعلیم کے ادارے پورے ملک میں قائم کیے گئے جن میں عربی ولایات کا حصہ زیادہ تھا۔

جولائی 1879ء میں وزارت المعارف نے تنظیم نو کا اعلان کیا اور اپنے اداروں کو انتظامی لحاظ سے پانچ حصوں میں تقسیم کیا۔ تعلیمی اداروں کے معاملات کو آسان کرنے کے لیے اور اس کے کام کو مطلوبہ شکل میں پورا کرنے کے لیے ہر ادارتی وحدت کو مجلس المعارف کے ایک ممبر کی نگرانی میں دیا گیا۔ وزارت المعارف کے پانچ شعبے درج ذیل تھے:

- شعبہ مدارس عالیہ
- شعبہ مدارس رشدیہ
- شعبہ مدارس الصبیان
- شعبہ تالیف وترجمہ
- شعبہ پریس[7]

16 فروری 1882ء میں ہر ولایت کے مرکز میں مجلس المعارف کی تشکیل کی گئی اور اس میں ایک مدیرِ معارف تعینات کیا گیا تاکہ ولایات میں تعلیمی امور چلانے میں آسانی ہو۔ 1980ء میں سلطان عبدالحمید ثانی کے خلاف انقلاب کے بعد بھی تعلیم کی ترقی کا سلسلہ جاری رہا۔ 1913ء میں ابتدائی تعلیم کے لازمی ہونے کا قانون جاری ہوا جو سلطنت عثمانیہ کے خاتمے تک نافذ رہا۔ اس قانون کی بدولت سلطنت میں تعلیم مفت اور لازمی ہو گئی۔ مگر جب عثمانی خلافت کا سقوط ہو گیا تو ملک میں ایک

[7]- فاضل بیات۔ المؤسسات التعلیمیۃ فی المشرق العربی العثمانی۔ ص:21

ہر شعبے کے اندر تبدیلی رونما ہونے لگی۔ ہر شعبہ زندگی کو مغربی طرز میں ڈھالا جانے لگا اور ایک نیا سلسلہ شروع ہوا جو جدید قومی ریاست کے تناظر میں اس سے بالکل مختلف تھا جو عثمانیوں کے عہد کا خاصہ تھا۔

مذکورہ بالا ساری تفصیل سے یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ عثمانی عہد میں خلافت کے مقتدر ذمہ داروں نے تعلیمی اصلاحات کا کام بہت دیر سے شروع کیا تھا۔ اگر خلافت عثمانیہ کے تحت ترکی میں اور باقی مسلم دنیا میں باقاعدہ اور منظم انداز میں ایک تعلیمی تحریک شروع ہوتی تو آج مسلمان ممالک میں اس کے اثرات بھی نظر آتے اور معاملہ کافی مختلف ہو سکتا تھا۔

'کالجز کا ظہور: اسلام اور مغرب میں تعلیم کے ادارے'

جارج مقدسی

'کالجز کا ظہور: اسلام اور مغرب میں تعلیم کے ادارے' (The Rise of Colleges: Institutions of Learning in Islam and the West) جارج مقدسی کی کتاب ہے ۔اس میں انہوں نے بنیادی طور پہ اسلامی مغربی تاریخ میں ایک خاص تاریخی مرحلے کے دوران قائم ہونے والے تعلیمی اداروں کا جائزہ پیش کیا ہے۔ جارج مقدسی کے آباء و اجداد کا تعلق لبنان سے تھا،ان کے والدین پہلی جنگ عظیم سے کچھ عرصہ پہلے امریکا ہجرت کر گئے تھے۔ وہ خود امریکا میں پیدا ہوئے،وہیں پڑھے اور پڑھاتے رہے۔ماہر تعلیم تھے اور انہیں عربی و اسلامی علوم میں بہت زیادہ دلچسپی تھی۔ان کی یہ کتاب تعلیم کی تاریخ کے موضوع پر اہل علم اور محققین میں بہت مقبول و اہمیت کی حامل سمجھی جاتی ہے۔زیرنظر مضمون ان کی اسی کتاب کا تعارف ہے۔

اس کتاب میں جارج مقدسی نے چوتھی صدی ہجری (گیارھویں صدی عیسوی) کے دوران بغداد میں قائم ہونے والے مدارس اور تعلیمی اداروں کا جائزہ لیا ہے۔ یہ وہ زمانہ کہ جب مدارس کی روایتی شکل میں ارتقاء واقع ہو گیا تھا اور تعلیمی ادارے وسعت اختیار کر رہے تھے۔ یہ کتاب چار ابواب پر مشتمل ہے۔پہلے باب میں فقہی مسالک کی اٹھان اور ان کے مدارس کا جائزہ لیا گیا ہے۔ دوسرے باب میں تعلیم کے مختلف شعبوں اور اور اُس وقت کے نظام تعلیم اور مناہج پر گفتگو کی گئی ہے۔ تیسرے باب میں جارج مقدسی نے مدرسین، طلبہ، تدریس کے طریقوں اور تدریسی مناصب کو موضوع بنایا ہے، جبکہ آخری باب میں اسلامی تہذیب اور مسیحی تہذیب میں تعلیمی اداروں کے فرق اور مسلم تعلیمی رجحانات کے مسیحی دنیا پر اثرات پر بات کی گئی ہے۔

جارج مقدسی نے چوتھی صدی ہجری کے جن تعلیمی اداروں کا ذکر کیا ہے وہ بنیادی طور پہ اسلامی علوم کے مدارس ہیں جن میں فقہ سمیت دیگر علوم پڑھائے جاتے تھے۔ یہ وہ مرحلہ ہے کہ جب مسلمانوں کے ہاں تعلیمی ادارے ایک منظم شکل اختیار کر گئے تھے۔ان کے مخصوص نام ہوتے تھے، پڑھانے

والوں کا اختصاص بھی ہوتا تھا کہ کوئی فقیہ ہے، تو کوئی محدث یا مفسر یا پھر گرامر کا ماہر ہوتا تھا۔ اس میں اگرچہ زیادہ تر بغداد کے مدارس کو محور بنایا گیا ہے، لیکن ضمنی طور پہ مکہ مدینہ اور دیگر علاقوں کے تعلیمی اداروں کا بھی کیا گیا ہے اور ان سے متعلق کچھ تفصیلات بیان کی گئی ہیں۔ مصنف کے مطابق باقاعدہ ادارے کی شکل میں مدرسے کی بنیاد رکھنے والے اہلِ نیشاپور ہیں، جنہوں نے مدرسہ بیہقیہ کی بنیاد ڈالی۔ علامہ مقریزی نے اُس وقت مصر میں قائم 70 سے زائد مدارس کا تعارف کرایا ہے۔ چند دیگر مدارس بھی ہیں جن میں سلطان محمود غزنوی اور ان کے بیٹے سلطان مسعود کے قائم کردہ مدارس، اور مدرسہ نظامیہ، بغداد، دولتِ سلجوقیہ کے علم دوست وزیر نظام الدین طوسی کا قائم کردہ مدرسہ شامل ہیں، جو چوتھی صدی ہجری کے بعد منظم تعلیمی اداروں کی شکل میں وجود میں آئے تھے۔ ان اداروں کے فضلا میں مشہور نام امام محمد بن محمد غزالی رحمہ اللہ، ابو علی حسین بن عبد اللہ ابن سینا رحمہ اللہ، ابو ریحان محمد بن احمد البیرونی، امام ابو بکر احمد بن حسین بیہقی، اور یوسف بن عبد اللہ المعروف ابنِ عبد البر اندلسی رحمہ اللہ ہیں۔

مصنف نے اسلامی تہذیب کے مدارس و تعلیمی اداروں کے لیے Colleges کی اصطلاح استعمال کی ہے، جامعہ یا university کا لفظ استعمال نہیں کیا۔ اس کی وجہ وہ یہ بتاتے ہیں کہ اُس وقت تک مسلم تہذیب میں جو تعلیمی نظام تھا اس نے معروف مغربی مفہوم میں جامعہ کی شکل اختیار نہیں کی تھی۔ ان تعلیمی اداروں میں جتنے بھی علوم زیرِ درس ہوتے وہ بنیادی طور پہ اسلامی و دینی مقاصد کے تحت آتے تھے۔ جامعہ کے کچھ اپنے خصائص و امتیازات ہوتے ہیں جن پر اُس وقت کے تعلیمی ادارے پورا نہیں اترتے تھے۔ یہ منظم انداز کے روایتی تعلیمی مراکز تھے جن میں متعین دینی علوم پڑھے پڑھائے جاتے تھے۔

کتاب کے شروع میں جارج مقدسی اسلامی نظامِ تعلیم کے مراحل کو بیان کرتے ہیں، کہ کس طرح وہ مسجد میں وعظ و نصائح کی شکل سے شروع ہوا، پھر حلقات کی شکل اختیار کی، اور بعد ازاں علوم کا اختصاص ہوا، اور آخر میں منظم انداز کے باقاعدہ ادارے وجود میں آگئے۔ اس کے ساتھ ہی مقدسی اسلامی تہذیب کے ریاستی شعبے 'وقف' کی تفصیلات بھی بیان کرتے ہیں کہ وقف کے ادارے کا

اسلامی تعلیم و مدارس کے ساتھ بہت گہرا تعلق ہے، بلکہ وہ یہ کہتے ہیں کہ اگر مسلم تہذیب میں وقف کا ادارہ نہ ہوتا تو اسلامی مدارس کو بھی کبھی فروغ نہ مل سکتا۔ اُس وقت بازنطینی سلطنت کے تحت بھی وقف کا ایک ادارہ کام کر رہا تھا لیکن اس کی ترجیحات میں تعلیم اور تعلیمی ادارے نمایاں نہیں تھے۔ اس کے بعد اگلی ایک دو صدیوں میں جب مغرب میں تعلیم کو اہمیت ملنا شروع ہوئی تو اس میں بھی اسلامی تہذیب کی طرح وقف کے ادارے نے کردار ادا کیا، جس میں تعلیم کو فوقیت ملی اور مسیحی بادشاہوں نے یورپ میں تعلیم پر توجہ دینی شروع کی، اور بڑے بڑے ادارے قائم ہوئے۔

اس کے بعد جارج مقدسی نے اسلامی مدارس کے تعلیمی نظام کا حال بیان کیا ہے۔ اس میں پہلے علوم کی تقسیم کی گئی ہے جو اُس وقت پڑھائے جا رہے تھے۔ ان تعلیمی اداروں میں فقہ کو بہت زیادہ اہمیت حاصل ہو گئی تھی۔ فقہاء کو ریاست میں بھی بڑا مقام حاصل ہو گیا تھا۔ اس لیے مدارس میں مختلف فقہی مسالک کا مطالعہ کرایا جاتا تھا۔ اس کے ساتھ ہی مناظرہ اور مباحثہ کی تعلیم بھی دی جاتی تھی جو فقہی تناظر میں ہوتی تھی۔ یہ تعلیم صرف انہیں دی جاتی تھی جو طلبہ ابتدائی علوم مکمل کر چکے ہوتے اور انہیں متون و مسائل کی خوب آگہی ہوتی تھی۔

مصنف نے کتاب میں یہ بھی بیان کیا ہے کہ مسلمانوں میں جو تعلیمی ادارے قائم ہوئے ان کے اثرات مغرب میں بھی پڑے، اور اسی کا نتیجہ تھا کہ وہاں بادشاہوں اور امراء نے وقف کی طرز پہ تعلیمی کی افزائش کا کام شروع کیا۔ مغرب میں بارھویں اور تیرھویں صدی عیسوی میں ہی تعلیمی ادارے قائم ہونا شروع ہو گئے تھے، مگر مسلم دنیا سے ان کا یہ فرق تھا کہ یہ کالجز نہیں تھے، بلکہ جامعات اور یونیورسٹیز کی شکل پر بڑے بڑے ادارے وجود میں آنا شروع ہوئے۔ ان جامعات کو ریاست کی طرف سے سرپرستی حاصل تھی۔ ان کے باقاعدہ ہاسٹل ہوتے تھے جہاں دیگر علاقوں کے طلبہ آ کر قیام کرتے تھے۔

اس کتاب میں ایک اہم بحث یہ ہے کہ گیارھویں صدی عیسوی میں مسلم تہذیب میں قائم ہونے والے تعلیمی اداروں کا مغربی تعلیمی اداروں پر کوئی اثرات مرتب ہوئے تھے یا نہیں۔ مصنف نے دونوں قسم کی آراء کا احاطہ کیا ہے اور ہر دو اطراف کے دلائل بھی بیان کیے ہیں۔ ان کے ہاں ترجیح یہی

ہے کہ اندلس کے تعلیمی اداروں نے یورپ میں احیاءِ علم کی تحریک برپا کرنے میں بہت اہم کردار ادا کیا۔

چوتھی صدی ہجری میں اسلامی تعلیمی اداروں کی تنظیم و تشکیل میں ایک بنیادی سبب فقہ اور فقہی مذاہب کا تھا۔اُس وقت تک مسلم تہذیب ترقی میں اپنے عروج پر تھی، نئے نئے ادارے قائم ہورہے تھے، تجارت کا دائرہ دور دراز ممالک تک پھیل چکا تھا، داخلہ و خارجہ سطح پر ایسے اہل علم کی ضرورت محسوس کی گئی جو ریاستی امور میں رہنمائی کر سکیں۔یوں سلطنت میں فقہاء کی مانگ بڑھ گئی تھی۔اسی طرح ایسے اُمراء ورؤسا پیدا ہوئے جو اُصولی عقائد کے مباحثوں اور علم کلام کے مناظروں سے دلچسپی لینے لگے۔اس لیے اہل علم بھی علم کلام ہی میں مصروف رہنے لگے۔کتابیں تصنیف کی جانے لگیں۔ مناظروں اور مباحثوں کے فنون اور طریقے مرتب ہونے لگے تاکہ اسلام وسنت کا دفاع اور بدعات کا استیصال کیا جاسکے۔یوں، مختلف اسلامی علوم کو سیکھنے سکھانے کی طرف عام لوگوں کا رجحان بڑھا تو مدارس کی شکل میں مستقل ادارے بھی وجود میں آنے لگے۔اسی دور میں ہی علوم میں اجازت کا سلسلہ بھی جاری ہوگیا، سند کی اہمیت مزید بڑھ گئی۔اگرچہ زبانی روایت کرنے کا رجحان کم ہوگیا اور کتب پڑھائی جانے لگ تھیں، اس کے باوجود علمی سلاسل کی اہمیت کم نہیں ہوئی۔

مجموعی طور پہ جارج مقدسی کی یہ کتاب چوتھی صدی ہجری میں ظہور پذیر ہونے والے اسلامی تعلیمی اداروں کی تاریخ و تشکیل کے حوالے سے ایک عمدہ دستاویز ہے، جس میں اُس وقت کے مدارس میں کے ڈھانچے کی جزئیاتی تفصیلات درج کی گئی ہیں، کہ ان مدارس کو کس طرح چلایا جاتا تھا۔اساتذہ کے کیا عہدے ہوتے، طلبہ کی درجہ بندی کیسے کی جاتی تھی، مختلف علوم کس طرح پڑھائے جاتے تھے، اوقات کار کیا ہوتے ،اساتذہ کو تنخواہیں کتنی ملتی تھیں، طلبہ کو وظائف کیا دیے جاتے، غرض کہ اسلامی تعلیمی اداروں کی تشکیل کے اولین مراحل کا بہترین انداز میں جائزہ لیا گیا ہے۔

مسلم دُنیا میں مذہبی تعلیم

مسلم دُنیا میں مذہبی تعلیم اور ہم آہنگ نصاب: اقلیتی طبقات کے لیے حکومتی کاوشیں

محمد اسرار مدنی

تعلیم،معاشروں کی مربوط تشکیل، افہام و تفہیم کو فروغ دینے اور متنوع طبقات کے درمیان ہم آہنگی پیدا کرنے میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔ایک عرصے سے مسلم دنیا پر یہ الزام عائد کیا جاتا ہے کہ ان کے ہاں اقلیتوں کو تعلیمی سطح پر کم درجہ یا غیراہم دکھایا جاتا ہے۔اسے گویا حکومتوں کی تعلیمی پالیسی بنا کر پیش کیا جاتا ہے۔ اگر اب بھی بجا طور پہ کئی مسلم ممالک میں اقلیتوں کو مسائل کا سامنا ہے،مگر اس کی وجہ مذہب یا مذہبی تعلیم نہیں ہے۔مزید یہ کہ اب کچھ سالوں سے مسلم دنیا میں تعلیمی ڈھانچے کے اندر مذہبی اقلیتوں کے لیے رواداری کو فروغ دینے کی عمدہ کوششیں ہو رہی ہیں۔ متعدد مسلم اکثریتی ممالک میں، تعلیمی نصاب میں رواداری اور تنوع پسندی کو فروغ دینے کی کوششیں کی جا رہی ہیں۔اس میں مذہبی اقلیتوں کی اہمیت و حقوق کو تسلیم کرنے کے لیے بھی کئی اقدامات سامنے آئے ہیں۔زیرنظر مضمون میں ایسی ہی کچھ مثالوں کا تجزیہ کیا گیا ہے۔

اِس وقت مسلم دنیا میں کئی ممالک ایسے موجود ہیں جو مذہبی اقلیتوں اور دیگر پسماندہ طبقات کے حوالے سے تعلیمی سطح پر عمدہ اقدامات کر رہے ہیں۔ذیل میں کچھ مثبت مثالیں پیش کرتے ہوئے، یہ جاننے کی کوشش کی جائے گی کہ کس طرح کچھ قومیں اپنے تعلیمی فریم ورک میں تنوع کو اپنا رہی ہیں، رواداری کو فروغ دے رہی ہیں۔ مسلم ممالک سے یہ چند مثبت مثالیں واضح کرتی ہیں کہ مسلم اکثریتی ممالک کے لیے اپنے تعلیمی نظام میں مذہبی تنوع کو جگہ دینا ممکن ہے اور اس کے فوائد بھی بہت ہیں۔ ہم آہنگ نصاب کو شامل کرکے، بین المذاہب مکالمے کو فروغ دے کر،اور مشترکہ اقدار پر زور دے کر، یہ قومیں ایسا ماحول بنانے کی کوشش کرتی ہیں جہاں طلباء نہ صرف اپنی مذہبی روایات کے بارے میں بلکہ مذہبی اقلیتوں کے ساتھ تعاون اور بقائے باہمی کے بارے میں بھی سیکھ سکیں۔

اگرچہ ان ممالک میں بھی چیلنجز موجود ہیں، مگر یہ مثالیں ظاہر کرتی ہیں کہ ان اقوام میں افہام و تفہیم اور رواداری کو فروغ دینے کا عزم موجود ہے۔ جیسے جیسے یہ قومیں ترقی کرتی جا رہی ہیں، ان کے تجربات پرامن بقائے باہمی کی قدر بارے قیمتی نتائج پیش کرتے ہیں کہ کس طرح تعلیم ایسے معاشروں کی تعمیر میں اہم کردار ادا کر سکتی ہے جو تنوع کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں اور ہم آہنگی کو فروغ دیتے ہیں۔

انڈونیشیا

انڈونیشیا، دنیا کا سب سے بڑا مسلم اکثریتی ملک ہے، اور یہ اپنے ثقافتی اور مذہبی تنوع کے لیے مشہور ہے۔ مختلف نسلوں، زبانوں اور مذاہب پر مشتمل آبادی کے ساتھ، انڈونیشیا نے اپنے تعلیمی نظام میں بھی اس تنوع کو ظاہر کرنے کے لیے کاوشیں کی ہیں۔

انڈونیشیا میں ہر سطح پر اسکول کے بچوں کے لیے مذہب ہمیشہ سے ایک لازمی مضمون رہا ہے۔ زیادہ تر اسکولوں میں، عام طور پر ہفتے میں دو کلاسیں مذہبی تعلیم کی ہوتی ہیں۔ اس کا مطلب ہے کہ ملک کے تعلیمی نظام میں مذہب کو کافی اہمیت حاصل ہے۔ مگر جو نصاب شامل درس ہے اس میں تمام ادیان کی توصیف کی گئی ہے۔ اسی لیے سماجی سطح پر بھی عوام میں تمام طبقات میں ہم آہنگی نظر آتی ہے۔ 2003 میں پاس ہونے والے نئے تعلیمی قانون میں کہا گیا کہ ہر اسکول پر لازم ہے کہ ہر مذہب کے بچوں کے لیے مذہبی تعلیم کی متعلقہ کتاب کی تدریس کے لیے اسی مذہب کا استاد مقرر کرے۔ مسلم طلبہ کے لیے مسلم اساتذہ، ہندو طلبہ کے لیے ہندو اساتذہ، وغیرہ۔ حتی کہ نجی تعلیمی ادارے بھی اس قانون کے پابند ہیں کہ متعلقہ مذہبی کتاب کے لیے اسی مذہب کا استاد مقرر کریں۔ نجی کیتھولک اسکول کو اپنے مسلمان طلبہ کے لیے ان کی مذہبی تعلیم کی کتاب پڑھانے کے لیے مسلم استاد فراہم کرنا ہوگا۔ یہ ایک عمدہ قانون سازی ہے تاکہ ہر مذہب کے بچے اپنے دین کی صحیح تعلیم حاصل کر سکیں۔

مذہبی تعلیم کی حساسیت صرف نچلے تعلیمی اداروں میں ہی نظر نہیں آتی بلکہ اعلی تعلیمی اداروں میں بھی اس بارے عمدہ اقدامات کیے جاتے ہیں۔ یوگیکارتا میں گاجا ماڈا یونیورسٹی میں پوسٹ گریجویٹ طلباء

کے لیے بین المذاہب مطالعات کا ایک شعبہ قائم ہے۔ یہ ایک فعال تحقیقی مرکز ہے جو اس موضوع پر سیمینارز اور کانفرنسوں کی میزبانی کرتا ہے اور اس موضوع پر تحقیق کو اسپانسر بھی کرتا ہے۔ دیگر اسلامی یونیورسٹیوں میں بھی اسی طرح کا ماحول نظر آتا ہے۔ طلبہ مذاہب کی سماجیات پر بھی تحقیقات کرتے ہیں۔ خاص طور پر جکارتہ اور یوگیکارتا کی اسلامی جامعات میں، بین المذاہب تعلقات پر طویل عرصے سے کام جاری ہے۔ سنن کلیجاگا اسلامی یونیورسٹی نے پوسٹ گریجویٹ تھیالوجی کے طلباء کے لیے، یوگیکارتا میں ڈوٹا واکانا کرسچن یونیورسٹی کے ساتھ مشترکہ تحقیقات کا ایک شعبہ قائم کر رکھا ہے۔ تحقیق کے دوران طلباء (اور دیگر دلچسپی رکھنے والے افراد) ایک دوسرے کی عبادت گاہوں کا دورہ کرتے ہیں، مذہبی تہواروں میں شرکت کرتے ہیں۔

دلچسپ امر یہ بھی ہے کہ اعلی تعلیمی اداروں میں تقابل ادیان کی بجائے، مذاہب کی سماجیات پر کام کیا جاتا ہے۔ تاکہ طلبہ میں یہ تصور پختہ کیا جاسکے کہ مذاہب انسانیت اور پر امن بقائے باہمی کی تعلیم دیتے ہیں اور یہ ایک دوسرے کے مدمقابل نہیں ہیں۔

جامع نصاب: انڈونیشیا کا تعلیمی نصاب جامع ہے، اس میں متعدد مذہبی اور نسلی گروہوں کی اہمیت کو تسلیم کرنے اور ان کا احترام کرنے کی حوصلہ افزائی کرنے والی تعلیمات موجود ہیں۔

نصابی کتب اور تدریسی مواد میں تسلیم کیا گیا ہے کہ انڈونیشین قوم کی تاریخ، ثقافت اور ترقی میں مذہبی اقلیتوں کا بڑا حصہ رہا ہے۔ مثال کے طور پر، نصاب میں ہندو اور بودھ سلطنتوں کا احاطہ بھی کیا گیا ہے جو کبھی انڈونیشی جزیرے پر پروان چڑھی تھیں۔ اسلام کی آمد اور غلبے کے باوجود بھی ماضی میں ان دیگر مذاہب کی موجودگی، اثرات اور ان کے کردار کو مسترد نہیں کیا گیا۔ وہ اسے اپنی تاریخ کا اہم حصہ سمجھتے ہیں۔

بین المذاہب ہم آہنگی کی تعلیم: انڈونیشیا بین المذاہب ہم آہنگی کی تعلیم پر بھی زور دیتا ہے، جس کا مقصد بچوں میں ابتدائی عمر سے ہی رواداری اور افہام و تفہیم کی اقدار کو فروغ دینا ہے۔ طلباء کو ایسی تعلیمات سے روشناس کرایا جاتا ہے جو مختلف مذہبی روایات کے احترام کو فروغ دیتی ہیں، اور متنوع

کمیونٹیز کے درمیان اتحاد کے احساس کو پختہ کرتی ہیں۔

مذہبی ہم آہنگی کی کلاسز: انڈونیشیا کے اندر کچھ تعلیمی ادارے ایسے ہیں جو اسکول میں مذہبی ہم آہنگی سے متعلق باقاعدہ الگ سے کلاسز کا اہتمام کرتے ہیں، اور طلبا میں مختلف عقائد بارے گہری تفہیم پیدا کرتے ہیں۔ ان کلاسوں میں اکثر مختلف مذہبی پس منظر سے تعلق رکھنے والے مہمان مقرر ہوتے ہیں، جو طلباء کے درمیان براہ راست بات چیت اور مکالمے کو یقینی بناتے ہیں۔

لبنان

1989 کے طائف معاہدے کے بعد، لبنان میں 15 سال کی خانہ جنگی کا خاتمہ ہوا۔ اس معاہدے نے ملک میں بڑی تعلیمی اصلاحات کی بنیاد رکھی اور ایک نیا نصاب تشکیل دینے کی ضرورت محسوس کی گئی جو ملک میں مختلف مذہبی اور سیاسی گروہوں کے درمیان قومی اتحاد کو فروغ دے۔ نتیجے کے طور پر، لبنانی وزارت تعلیم نے ایک نیا نصاب تیار کیا، جسے 1997 میں لاگو کیا گیا۔ نئے نصاب کے دو اہم اہداف یہ ذکر کیے گئے تھے: "فرد کی شخصیت کی تعمیر اور شہری مساوات کو قائم کرنا"۔

1997 میں تشکیل دیے گئے نئے نصاب میں شہریت کی تعلیم اور آپسی مفاہمت پر زور دیا گیا۔ وزارت تعلیم نے قومی اور شہری تعلیم کے تحت ایک نئے لازمی مضمون کے لیے ایک نصاب بھی تیار کیا جسے گریڈ 1 سے 12 تک کے تمام سرکاری اسکولوں میں ہفتے میں ایک گھنٹہ پڑھایا جاتا ہے۔ اس مضمون کو گریڈ 9 اور 12 کے سرکاری امتحانات میں بھی شامل کیا گیا۔ اس کے علاوہ وزارت تعلیم نے نصابی کتب کا ایک نیا مجموعہ تیار کیا جو 12 کتابوں پر مشتمل ہے اور بارھویں تک ہر جماعت میں ایک کتاب زیر درس ہے۔ اسی طرح تاریخ کی نصابی کتب کو تیار کرنے کے دوران بھی اس امر کی رعایت رکھی گئی کہ کسی قسم کا ایسا اشارہ موجود نہ ہو کہ جس سے کسی مسلک یا طبقے کی تحقیر ہوتی ہو۔

2010 میں لبنان نے ایک مرتبہ پھر تعلیمی اصلاحات کا آغاز کیا جس میں شہریت کے نصاب اور کتب پر نظر ثانی کی گئی۔ نئے نصاب میں پچھلی تعلیمی اصلاحات کے فوائد اثرات اور اس کے نتائج پر بھی تبصرہ شامل ہے۔ نئے نصاب میں ترکی سمیت خطے کے چند مسلم اکثریتی ممالک میں پائی جانے والی مذہبی ہم

آہنگی کو بھی موضوع بنایا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ اس طرح کی ہم آہنگی اور رواداری قوموں کی ترقی میں اہم کردار ادا کرتی ہیں۔

فرقہ وارانہ ہم آہنگی: لبنان، ایک ایسا ملک ہے جو اپنے مذہبی تنوع اور مختلف فرقوں کے مابین تاریخی بقائے باہمی کے لیے جانا جاتا ہے۔ اگرچہ پچھلی چار دہائیوں سے وہاں مسالک کے درمیان ایک طرح کے صورت کی صورت رہی ہے اور اس بنا پر بہت سے فسادات بھی ہوئے۔ یہ مگر تنظیموں کی سطح پر ہے اور انہی کی وجہ سے کئی مسائل پیدا ہوئے ہیں۔ لیکن تعلیمی حوالے سے دیکھا جائے تو لبنان کا تعلیمی نظام ہم آہنگی اور افہام و تفہیم کو فروغ دینے کی بھرپور کوشش کرتا ہے۔

جامع نصابی کتب: لبنان میں نصابی کتب اکثر مختلف مذہبی برادریوں کے درمیان باہمی احترام اور حقوق کو تسلیم کرتے ہوئے ایک متوازن تصویر کشی کرتی ہیں۔ ایسے تعصبات سے بچنے کی کوشش کی جاتی ہے جو فرقہ وارانہ کشیدگی کو بڑھاوا دیں۔ یہ ملک مسلم دنیا میں مذہبی تعلیم کے اعتدال کے ضمن میں ایک عمدہ مثال ہے۔

شہری تعلیم: لبنان کے تعلیمی نصاب میں شہری اقدار، رواداری، تنوع اور بقائے باہمی کی اہمیت کے باقاعدہ اسباق اور ابواب شامل ہیں۔ اس سے طلبہ میں طلباء مشترکہ شہریت کے احساس کو فروغ دینے، اور قوم کی تشکیل میں مختلف مذہبی گروہوں کے کردار کے بارے میں سیکھتے ہیں۔

مشترکہ اقدار پر زور: لبنانی اسکول اکثر مختلف مذہبی برادریوں کے درمیان مشترکہ اقدار پر زور دیتے ہیں، جس سے اس خیال کو تقویت ملتی ہے کہ مذہبی اختلافات کے باوجود، ایسے اعلیٰ اصول موجود ہیں جو قوم کو متحد کرتے ہیں۔

لبنان میں نہ صرف مسلم مسالک کا تنوع ہے اور ان کے درمیان سیاسی کشاکش ہے، بلکہ ایک بڑی تعداد میں وہاں پر مسیحی آبادی بھی موجود ہے۔ مگر ثقافتی لحاظ سے وہاں سب ایک ہی رنگ میں گندھے ہوئے ہیں۔ اس کی بنیادی وجہ ظاہر ہے کہ تعلیم اور تعلیمی نصاب ہے۔ لبنان کے مسیحی ادیبوں نے

عربی زبان وادب کی بہت خدمت کی ہے۔لبنانی مفکرین بلا تفریق مذہب و مسلک قومی نمائندے تھے۔ان کی فکری وادابی تحریروں میں اسلامی ثقافت کا بہت احترام پایا جاتا ہے۔مثال کے طور پہ مارون عبود پچھلی صدی میں لبنان میں مختلف مذاہب و فرقوں سامراجی سازشوں کے عہد میں پیدا ہونے والا ایسا مسیحی مفکر تھا جو خود فرقہ واریت کے خلاف بردبار سوچ کا حامل تھا۔وہ مذاہب کے مابین نفرتوں کے لئے کھلے دل سے باغی تھا۔مارون عبود فرقہ پرستی کے خلاف وہ پہلا مسیحی تھا جس نے اپنے بیٹے کا نام محمد رکھا۔لوگوں کے نزدیک ''محمد مارون''ایک انوکھا نام تھا۔نہ صرف اس نے اپنے بیٹے کا نام ''محمد''رکھا بلکہ اپنی بیٹی کا نام ''فاطمہ''رکھا۔یہ وقت تھا جب سیاسی سطح پر فرقہ وارانہ جنگ کی نوعیت غالب تھی، مگر لبنانی مفکرین عوام میں اس تناؤ کو کم کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔مارون عبود کی بیٹی فاطمہ کو لبنان میں مذہبی شناخت اور فرقہ واریت کی بنیاد پر قتل تک کر دیا گیا تھا۔مگر اس نے یہ قربانی دی اور کبھی بھی اس امر کی اجازت نہیں دی کہ مذہب یا مسلک کی وجہ سے ملک میں تناؤ اور بدمزگی پیدا ہو۔

ملائیشیا

ملائیشیا بھی مسلم اکثریتی ملک ہے،جو اپنے تعلیمی نظام میں تکثیریت پسندی پر بہت زیادہ زور دیتا ہے۔ملک کے تعلیمی اداروں کے نصاب میں مختلف نسلی اور مذہبی برادریوں کی اہمیت کو تسلیم کیا گیا ہے۔1956 سے ہی ملائشیا حکومت کی طرف سے مختلف اوقات میں مرتب کی جانے والی تعلیمی پالیسیاں قومی یکجہتی کو محور بناتی ہیں۔حالیہ برسوں کے دوران تعلیم میں انسانیت پسندی (Humanizing of education) کے عنصر کو خاص توجہ دی گئی ہے۔اس کا اظہار قومی فلسفہ تعلیم (NPE) میں واضح طور پر کیا گیا ہے۔ملائیشیا کے تناظر میں تعلیم کو انسانیت پسندی پر مبنی بنانے سے مراد ایسے افراد پیدا کرنے کے لیے تعلیمی نظام میں سماجی و ثقافتی پہلوؤں کو شامل کرنا ہے جو فکری،روحانی،جذباتی،جسمانی اور معاشرتی طور پر متوازن اور ہم آہنگ ہوں۔

تعلیم سے متعلق کی جانے والی نئی قانون سازی میں وضح کیا گیا ہے ملائشیا تعلیم کو اس نہج پر استوار کرنا

چاہتا ہے کہ اس کے شہری نہ صرف قومی ترقی میں کارگر ثابت ہو سکیں، بلکہ وہ آپسی تعلقات میں بھی صحت مندانہ رویہ رکھتے ہوں۔ ملائیشیا کی آزادی کے بعد سے پر امن اور ہم آہنگ انداز میں زندگی گزارنے کی تربیت حکومتوں کی ہمیشہ سے بنیادی ترجیح رہی ہے۔ اس کا اندازہ تمام تعلیمی رپورٹس اور قانون سازیوں سے کیا جا سکتا ہے۔

کثیر الثقافتی نصابی کتب: ملائیشیا میں نصابی کتب میں ایسا مواد شامل ہے جو قوم کے کثیر الثقافتی تانے بانے کی عکاسی کرتا ہے۔ طلباء مختلف مذہبی اور نسلی گروہوں کے رسوم و رواج اور روایات کے بارے میں سیکھتے ہیں، جس سے نوجوانوں کے اندر ملائیشیا کی متنوع ثقافتوں سے متعلق فخر کا احساس پیدا ہوتا ہے۔

بین المذاہب مکالمے: ملائیشیا کے اسکولوں میں بین المذاہب مکالموں کی بھرپور حوصلہ افزائی کی جاتی ہے۔ طلباء مباحثوں میں حصہ لیتے ہیں جو باہمی احترام اور افہام و تفہیم کو فروغ دینے کا باعث ہیں، انہیں موقع ملتا ہے کہ وہ مختلف مذہبی پس منظر کے حامل ساتھیوں کے ساتھ عملا روابط قائم اور مضبوط کریں۔

اتحاد کا فروغ: ملائیشیا کا تعلیمی فلسفہ 'قومی اتحاد' کو فروغ دینے پر بہت زیادہ زور دیتا ہے۔ اس بیانیے کا مقصد ظاہر ہے کہ مذہبی اور نسلی گروہوں کے درمیان محبت اور احترام کو پیدا کرنا ہے۔ ملائشیا مختلف گروہوں کے مابین آپسی کشمکش کا شدید تجربہ کر چکا ہے، اس لیے اب تعلیمی سطح پر کوشش کی جاتی ہے کہ ان میں باہمی رواداری کو فروغ دیا جائے۔

ترکی

ترکی مشرق اور مغرب کے مابین پل کے طور پر ایک منفرد تاریخ ہے۔ حالیہ برسوں میں، ترکی نے ہم آہنگی اور تکثیریت پسندی پر زور دیتے ہوئے اپنے نصاب کو جدید بنانے کے لیے تعلیمی اصلاحات کی ہیں۔

ترکی کی مذہبی تعلیم خلافت عثمانیہ کے سقوط کے بعد کئی مراحل سے گزری ہے۔ 1927 میں مذہبی

تعلیم کو ترکی کے دیہی اسکولوں سے ختم کر دیا گیا تھا، اور 1936 میں ملک کے تمام اسکولوں سے ہٹا دیا گیا تھا۔ تاہم، غیر نصابی شکل میں ترکی کے دیہی ابتدائی اسکولوں میں مذہبی تعلیم 1938 تک جاری رہی۔ 1939 میں، ایک نئے ضابطے کے تحت نصاب سے مذہبی تعلیم کو مکمل طور پر حذف کر دیا گیا تھا۔ امام حاطب اسکول ترکی میں مذہبی تعلیم کے لیے سب سے نمایاں ادارے سمجھے جاتے تھے۔ جب مذہبی تعلیم کو ختم کرنے کا فیصلہ کیا گیا تو، 1929 میں امام حاطب اسکولوں کو بھی بند کر دیا گیا، اور 1933 میں استنبول یونیورسٹی کی فیکلٹی آف تھیالوجی کو بند کر دیا گیا۔ اس کے بعد کے سالوں میں ترکی کے اندر کوئی ادارہ مذہبی تعلیم کے لیے کام نہیں کر سکتا تھا۔

مگر، 1980 کے بعد سے رفتہ رفتہ ترکی میں مذہبی تعلیم کی واپسی ہونے لگی۔ اکیسویں صدی کے شروع سے، جب سے رجب طیب ارگان کی جماعت حکومت میں آئی ہے، تب سے ترکی میں مذہبی تعلیمی اداروں کو بحال کیا جانے لگا۔ امام حاطب اسکول پہلے سے بہتر طور پہ پورے ملک میں پھیل گئے ہیں۔ 2012 سے امام حاطب کے ثانوی اسکول بھی بحال کر دیے گئے تھے، جبکہ یہ پہلے کچھ سالوں سے صرف پرائمری تک چل رہے تھے۔

اگرچہ امام حاطب سرکاری اسکول ہیں، مگر یہ ترکی کے دیگر سرکاری اسکولوں سے مختلف ہیں، کیونکہ ان کے نصاب کا تقریباً 40 فیصد اسلامی کورسز، جیسے کہ عربی، قرآنی تفسیر اور اسلامی فقہ کے لیے وقف ہے۔ باقی تعلیمی نصاب ریاضی، سائنس، ترک تاریخ اور جغرافیہ وغیرہ کے لیے وقف ہے۔ ان اسکولوں کو روایتی اور جدید تعلیم کا مرکب سمجھا جاتا ہے۔

ترکی میں امام حاطب اسکول ایسے تعلیمی ادارے ہیں جن پر ملک کا بایاں بازو اور مغربی ادارے کافی تنقید کرتے ہیں کہ یہ ادارے سخت گیر مذہبی خیالات کو فروغ دے رہے ہیں۔ لیکن، اگر امام حاطب اسکولوں کے نصاب کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ ادارے اگرچہ اسلامی تعلیم کو ترجیح دیتے ہیں، لیکن اس کے ساتھ ہی یہ جدید تعلیم دیتے ہیں اور جو مذہبی تعلیم دی جاتی ہے وہ سخت گیر خیالات پر مبنی نہیں ہے۔ ان اسکولوں کو نگرانی خود وزارت تعلیم کرتی ہے، اس لحاظ سے وہ سلطنت عثمانیہ کے روایتی مدارس سے مختلف ہیں۔

ان اسکولوں میں سماجی ہم آہنگی اور معاشرتی آداب جیسے مضامین بھی پڑھائے جاتے ہیں۔اس کے علاوہ دیگر مذاہب کے بارے میں مثبت اور توصیفی انداز میں معلومات فراہم کی جاتی ہیں،تاکہ طلبہ کی دیگرادیان کے ماننے والوں کے خلاف ذہن سازی نہ ہو۔

خلافت عثمانیہ کے سقوط کے بعد ترکی کی مذہبی تعلیم میں شروع سے ہی تین اہم عناصر جڑے ہوئے ہیں۔ایک توروایتی تفہیم کا عنصر ہے۔دوسرا کمالی نظریہ (کمال اتاترک) جو لبرل نوعیت کا ہے اور جو مذہب میں انفرادی آزادی اور عقلی نقطہ نظر کو ترجیح دیتا ہے۔اور تیسرا عنصر ہے مذہب کی جدید تفہیم جو عصر حاضر کے حالات کو پیش نظر رکھ کر سمجھی جاتی ہے۔اگرچہ ان تینوں عناصر میں بہ ظاہر تضادات محسوس ہوتے ہیں، لیکن ترکی میں ان کی عملی تشکیل واضح نظر آتی ہے، جہاں غیر ملکی افراد جو مختلف مذاہب و نسلوں سے ہوتے ہیں، سیاحت کے لیے آتے ہیں، اور یہ سماج ان کے لیے انتہائی پرامن اور محفوظ ہے۔وہاں مذہبی عنصر بھی کھلے عام نظر آتا ہے اور لبرل عنصر بھی کسی سے ڈھکا چھپا نہیں ہے۔

ترکی میں ایک طویل عرصے تک علوی مسلک کے لوگوں کو مسائل کا سامنا رہا ہے۔لیکن اب ترکی کی مذہبی تعلیم میں علوی مسلک بارے مواد شامل ہے اور اس کی توصیف کی گئی ہے۔مثال کے طور پر، گریڈ 7 کے لیے مذہبی تعلیم کی نصابی کتاب میں علوی مسلک کو قرآن کریم کی صوفیانہ تشریحات میں سے ایک کے طور پر متعارف کرایا گیا ہے۔صرف تعارف ہی نہیں، بلکہ اس مسلک کی مذہبی عبادات اور تہواروں کا بھی تفصیل سے ذکر کیا گیا ہے۔اس کا مقصد ظاہر ہے کہ ترکی میں علوی مسلک کے ماننے والوں کے خلاف تاریخی تناؤ کو کم کرنا ہے اور بچوں کو بتانا ہے کہ یہ دین اسلام ہی کا نمائندہ ہے۔

ان کے علاوہ، اسکولوں کے نصاب میں گریڈ 6، 8 اور 12 میں دیگر مذاہب کے بارے میں بھی معلومات شامل ہیں۔ گریڈ 6 کی نصابی کتاب میں قرآن، انجیل، تورات اور زبور سمیت مقدس کتابوں کے بارے میں معلومات پیش کی گئی ہیں، ان کے بارے میں بتایا گیا ہے کہ وہ اسلام کے مطابق اللہ کی طرف سے نازل ہوئی ہیں۔عام طور پہ غیر آسمانی مذاہب (جیسے ہندومت، بدھ مت،) بارے مسلم ممالک میں کچھ نہیں پڑھایا جاتا، لیکن ترکی میں ان کے متعلق بھی تعارف موجود ہے۔اسی طرح

آسمانی مذاہب میں عقائد، عبادت، اور اخلاقیات کے لحاظ سے پائی جانے والی کچھ مماثلتوں کو بھی واضح کیا گیا ہے۔

ترکی میں اگرچہ ہر اسکول مذہبی تعلیم کی نصابی کتب کا انتخاب کر سکتا ہے، لیکن انہیں وزارت تعلیم سے منظور شدہ ہونا ضروری ہے۔ چوتھی جماعت سے لے کر آٹھویں جماعت تک، کو ہفتے میں دو گھنٹے مذہبی مضمون پڑھایا جاتا ہے۔، جبکہ ہائی اسکول کے طلبہ اس لازمی مضمون کو ہفتے میں صرف ایک گھنٹے کے لیے پڑھتے ہیں۔

شہری تعلیم: ترکی کے نظام تعلیم میں شہری تعلیم شامل ہے جو جمہوری اقدار، انسانی حقوق اور مساوات پر زور دیتی ہے۔ اس جامع نقطہ نظر کا مقصد متنوع کمیونٹیز کے درمیان اتحاد کا احساس پیدا کرنا اور مشترکہ قومی شناخت کو فروغ دینا ہے۔

بین المذاہب مکالمہ: ترکی نے اپنے تعلیمی نظام میں بین المذاہب مکالمے کے اقدامات کو فعال طور پر فروغ دیا ہے۔ تعلیمی اداروں میں طلباء کی حوصلہ افزائی کی جاتی ہے کہ وہ ایسی مساعی و مباحث کا حصہ بنیں جو مذہبی حدود سے بالاتر ہوں، اور مختلف عقائد کے ماننے والوں میں باہمی احترام کو فروغ دیں۔

اُردن

مسلم ممالک میں اردن ایک ایسا ملک ہے جو بین المذاہب آہم آہنگی کے فروغ کے لیے دنیا میں بہت سی کوششیں بروئے کار لا رہا ہے۔ خلیج عرب میں موجود یہ چھوٹا سا ملک مذہبی حوالے سے بھی دنیا میں خاص شہرت رکھتا ہے۔ دنیا میں اسلام کی مثبت تصویر پیش کرنے میں آگے آگے رہتا ہے۔ اسلام اور قرآن سے اس کی محبت کا کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ 2016 میں، ریاست عمان نے قرآن کی فاصلاتی تعلیم کے لیے ایک آن لائن نظام کا آغاز کیا تھا جس کا نام ہے 'برنامج الکترونی لتعلیم القرآن' (قرآن پاک سیکھنے کے لیے الیکٹرانک پروگرام) پوری دنیا سے لوگ قرآن کریم کی ناظرہ و

حفظ کی تعلیم حاصل کرنے، اور تلاوت کے آن لائن کورسز میں داخلہ لینے کے لیے اس میں حصہ لے سکتے ہیں۔ یہاں تک کہ عمان کی وزارت اوقاف اور مذہبی امور کے ذریعے تصدیق شدہ حفظ (حفظ) کا سرٹیفکیٹ بھی دیا جاتا ہے۔

دین سے ان کی قدر والہانہ عقیدت کے باوجود وہاں کے حکام نے ہمیشہ یہ کوشش بھی کی ہے، مذہب کی جو بھی تصویر پیش کی جائے اور اس ضمن میں جو خدمات بھی انجام دی جائیں، ان میں کوئی سخت گیر عنصر موجود نہ ہو۔ عمان کے تعلیمی اداروں میں ایسے کئی سروے کیے گئے جن میں مذہب سے متعلق اساتذہ اور طلبہ کے خیالات معلوم کیے گئے تھے۔ نتائج سے ظاہر ہوا کہ طلباء عمان کے معاشرے اور دنیا بھر میں مذہبی اور ثقافتی رواداری کی اہمیت پر زور دیتے ہیں۔ وہ کسی قسم کی جارحیت، مذہبی اور ثقافتی علامتوں درمیان اختلاف کو ہوا دینے کے حق میں نہیں ہیں۔ سروے کے نتائج سے یہ بھی معلوم ہوا کہ خواتین طالبات مردوں کے مقابلے میں زیادہ روادارانہ خیالات کی حامل ہیں۔

عمان کے تعلیمی اددراوں میں 'عالمی انسانی شہریت' بارے بھی معلومات دی جاتی ہے، جس کے پانچ بڑے اصول ہیں: امن، انسانی حقوق و تنوع، ماحولیاتی تحفظ، سماجی انصاف، جمہوریت و مساوات۔ یہ پانچ اصول عمان کے تعلیمی اداروں کے نصاب میں باقاعدہ پڑھائے جاتے ہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ عمان عالمی شہریت کے لیے تعلیم کی اہمیت کو سمجھتا ہے اور حکام اپنے بچوں کو ایک بہتر تعلیم سے ہم آہنگ کر رہے ہیں۔

اس کے علاوہ، عمان کے تعلیمی اداروں میں انسانی حقوق، امن و تنازعات اور ماحولیات سے جڑے مسائل و خدشات سے متعلق اسلامی اصولوں اور اقدار پر بھی انحصار کیا جاتا ہے اور ان مسائل پر دینی نقطہ نظر سے ذہن سازی کی جاتی ہے، بایں طور کہ اسلام ان اصولوں کی حوصلہ افزائی کرتا ہے۔ ان اقدار کو مختلف ذرائع جیسے خاندانی مجالس، مسجد کے اجتماعات، میڈیا اور تقاریر اور سماجی اداروں کے ذریعے بھی پروان چڑھایا جاتا ہے۔

سعودی عرب

سعودی عرب میں ہمیشہ سے مذہبی تعلیم کا عنصر تمام تعلیمی مراحل (پرائمری اسکول، انٹر میڈیٹ اسکول، ہائی اسکول، اعلیٰ تعلیم) میں حاوی رہا ہے۔ مثال کے طور پر، فی ہفتہ پرائمری اسکول کے تقریباً ایک تہائی اسباق مذہبی تعلیم کے موضوعات پر مبنی ہوتے ہیں، اور مذہبی کورس یونیورسٹی کے تمام طلباء کے لیے بھی لازمی ہیں، ان کا شعبہ چاہے جو بھی ہو۔ اس لیے سعودی عرب کی تعلیمی پالیسیوں میں مذہبی اہداف نمایاں رہے ہیں۔ سعودی عرب کی تعلیمی پالیسی(1969 میں وزراء کی کونسل کی طرف سے جاری کردہ ایک دستاویز) نے مملکت میں تعلیم کے لیے یہ بنیادی اصول وضع کیا تھا کہ اسلامی ثقافت کو اعلیٰ تعلیم کے تمام مراحل میں مرکزی حیثیت حاصل ہو گی۔

تعلیمی شعبے میں مذہبی عنصر پر بہت زیادہ اصرار اور انحصار کی بنیادی وجہ ایک تو 1979 کا انقلاب ایران تھا جس کے بعد مشرق وسطی میں فرقہ وارانہ گھما گھمی غالب آگئی۔ اس کے علاوہ اسی دہائی میں مسلم دنیا میں مسلح عسکریت پسندی کا رجحان بھی بڑھ گیا۔ اسی دوران سعودی عرب میں ایک بڑی تعداد غیر ملکی اساتذہ کی آئی، جن میں سے بہت سے اخوان المسلمین کے لوگ تھے جو مصر اور شام سے سعودی عرب میں جلاوطن ہو کر آئے تھے۔ انہوں نے مملکت میں تعلیم کی تشکیلِ نو کی۔ خصوصا مذہبی نصاب کو سیاسی بنایا گیا پر سیاست کی، اور خاموش وہابی عنصر کو بھی سیاسی سرگرمی کا حصہ بنادیا۔

اساتذہ کا یہ نیا حلقہ، "پوشیدہ نصاب"(the hidden curriculum) کے نام سے مشہور ہوا۔ ماہرین کا اندازہ ہے کہ 2001 میں سعودی اسکولوں میں پرائمری اور انٹر میڈیٹ کلاسوں میں مذہبی علوم کا دورانیہ ہفتہ وار کلاس روم کے اوقات کا تقریباً ایک تہائی حصہ تھا۔

مگر 11/9 کے واقعے میں 15 سعودیوں کے ملوث ہونے کے بعد سعودی عرب نے نصابی کتب پر نظر ثانی شروع کر دی۔ مذہبی کتب میں عدم برداشت کے تصورات کو ہٹا دیا گیا جانے لگا۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ طلبہ کے ذہن سے یہ چیز نکال دی جائے کہ جو مسلم نہیں ہے وہ آپ کا دشمن ہے۔ جیسے کہ 2005-06 میں پانچویں جماعت کی ایک کتاب سے اس عبارت کو ہٹا دیا گیا کہ ”جو شخص خدا کی

مخالفت کرتا ہے، چاہے وہ خاندانی تعلق میں آپ کا بھائی ہی کیوں نہ ہو، وہ آپ کا دشمن ہے"۔ توحید کی پہلی جماعت کی نصابی کتاب کا 08-2007 ایڈیشن کہتا ہے: "اسلام کے علاوہ ہر مذہب باطل ہے"، اسے بھی ہٹادیا گیا، تاکہ دیگر اقلیات بھی پڑھ سکیں اور انہیں مسئلہ نہ ہو۔

2011 میں، شاہ عبداللہ نے 2000 اساتذہ کو معطل کر کے "پوشیدہ نصاب" (the hidden curriculum) کو ختم کرنے کی طرف ایک بڑا قدم اٹھایا، جو سعودی عرب میں اساتذہ کی کل تعداد کے 2 فیصد کے برابر بنتا ہے۔

اگرچہ سعودی عرب میں مذہبی اقلیتیں موجود نہیں ہیں، اس کے باوجود اب نئے نصاب میں مذہبی اقلیتوں کے حوالے سے نرم گوشہ شامل کیا گیا ہے۔ خصوصاان کے خلاف جو دشمنی کا عنصر اور پہلو تھا وہ ختم کر دیا گیا ہے۔

نئے سعودی نصاب کے خصائص

سخت مواد حذف: اب سعودی عرب نے عدم برداشت، یا امتیازی سلوک کو فروغ دینے والے مواد کی تشخیص کرنے اور اسے ختم کرنے کے لیے اپنی نصابی کتابوں کا جامع جائزہ لیا ہے۔ ایسے سارے مواد کو ختم کرنے کی کوششیں کی گئی ہیں جو فرقہ واریت اور مذہبی عدم برداشت کو جنم دے سکتے ہیں۔

اعتدال پر زور: نصاب پر نظر ثانی میں اسلام کے اندر اعتدال، رواداری اور بقائے باہمی کے اصولوں پر زور دینے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس کا مقصد مذہب کے بارے میں زیادہ متوازن تفہیم پیش کرنا ہے جو تنقیدی سوچ کی حوصلہ افزائی کرے۔

نئے مضامین کا اضافہ:

1. شہریت اور قومی شناخت: سعودی عرب نے نئے مضامین متعارف کرائے ہیں جو شہریت، قومی شناخت اور ثقافتی بیداری پر مشتمل ہیں۔ ان مضامین کا مقصد طلباء میں قومی فخر اور اتحاد کا احساس پیدا

کرنا،اور ذمہ دار شہری ہونے کی اہمیت پر زور دینا ہے۔

2. تنقیدی سوچ اور تجزیاتی صلاحیت: تنقیدی سوچ اور تجزیاتی صلاحیتوں کو بہتر کرنے کے لیے بھی نیا مواد شامل کیا ہے۔اس کا مقصد یہ ہے کہ طالب علموں میں آزادانہ سوچنے، تنقیدی سوال کرنے،اور مختلف مسائل پر مربوط نقطہ نظر تشکیل دینے کی صلاحیت پیدا کی جاسکے۔

اساتذہ کی تربیت:

1- پیشہ ورانہ ترقی کے پروگرام: سعودی عرب نے اساتذہ کے لیے پیشہ ورانہ ترقی کے پروگرام شروع کیے ہیں،انہیں اصلاح شدہ نصاب کو مؤثر طریقے سے سمجھانے کے لیے ضروری مہارتوں اور علم سے آراستہ کیا گیا ہے۔ اس میں جدید تدریسی مناہج کی تربیت اور طلباء کی متنوع علمی فکری ضروریات کو پورا کرنے کی صلاحیت پیدا کرنا شامل ہے۔

2- مثبت تدریس پر زور: اساتذہ کی حوصلہ افزائی کی جاتی ہے کہ وہ مثبت تدریسی انداز اپنائیں،اور کھلے مکالمے، تنوع کا احترام،اور طلباء کے درمیان رواداری کی ذہنیت کو فروغ دیں۔

بین الاقوامی تنظیموں کے ساتھ تعاون:

1-یونیسکو کے ساتھ شراکت: سعودی عرب نے تعلیمی اصلاحات میں عالمی تجربات سے فائدہ اٹھانے کے لیے یونیسکو سمیت بین الاقوامی اداروں کے ساتھ تربیتی معاہدے کیے ہیں۔اس طرح کی شراکت داریوں کا مقصد سعودی عرب کے تعلیمی طریقوں کو بین الاقوامی معیارات اور بہترین مناہج سے ہم آہنگ کرنا ہے۔

2-عالمی تناظر: نصاب میں عالمی انسانی تناظر کو متعارف کرانے کی کوششیں کی گئی ہیں، جس سے طلباء کو بین الاقوامی مسائل، ثقافتی تنوع،اور عالمی تعاون کی اہمیت کے بارے میں سمجھنے میں مدد ملے گی۔

صنفی مساوات:

نظرِ ثانی شدہ نصاب میں معاشرے کے اندر خواتین کے کردار کی زیادہ جامع تصویر کشی کے ذریعے صنفی مساوات کے مسئلے کو حل کرنے کی کوششیں شامل ہیں۔ یہ اقدام وسیع تر سماجی تبدیلیوں کا حصہ ہے جس کا مقصد خواتین کو بااختیار بنانا اور صنفی حرکیات کے بارے میں مزید ترقی پسند تفہیم کو فروغ دینا ہے۔

سعودی عرب میں اصلاحات کی کوششیں تعلیمی نظام کو جدید بنانے اور زیادہ کھلے اور روادار معاشرے کو فروغ دینے کے عزم کی عکاسی کرتی ہیں۔ مملکت کا مقصد دراصل انتہا پسندی کی بنیادی وجوہات کو حل کرنے اور اسلام کی متوازن تفہیم کو فروغ دینے کے ذریعے، بنیاد پرستی کا مقابلہ کرنے اور بہتر مستقبل کی تعمیر کے لیے عالمی کوششوں میں حصہ ڈالنا ہے۔

پاکستان

پاکستان میں اقلیتوں کو ایک عرصے سے یہ شکایت تھی کہ جس طرح مسلمان طلبہ کے لیے نصاب میں اسلامیات کی کتاب شامل ہوتی ہے، اسی طرح باقی مذاہب کے طلبہ کے لیے بھی ان کے مذہب کی کتاب زیرِ تدریس ہونی چاہیے۔ یہ اقلیتوں کا ایک دیرینہ مطالبہ تھا، جسے اب پورا کر دیا گیا ہے۔ اقلیتی رہنما کہتے آئے ہیں کہ مسلمان بچوں کو اسلامی علوم ضرور پڑھائے جائیں تاہم دیگر مذاہب سے تعلق رکھنے والے بچوں کو اسلامی نصاب پڑھانا پاکستان کے آئین کی خلاف ورزی ہے۔ پاکستان میں نئے 'یکساں قومی نصاب' میں اقلیتوں کے لیے الگ سے ان کے مذہب کی کتب شامل کی گئی ہیں۔ قبل ازیں اقلیتی طلبہ کو تعلیمی اداروں میں رائج اسلامیات کے بجائے اخلاقیات کی درسی کتب پڑھائی جارہی تھیں۔ مگر اب پہلی جماعت سے لے کر بارہویں جماعت تک اقلیتی طلبہ کو ان کے اپنے مذاہب کی درسی کتابیں پڑھائی جانے لگیں گی۔ نئے لاگو ہونے والے نصاب میں ان سات مذاہب کی کتب تیار کی گئی ہیں: ہندو، مسیحی، بدھ، سکھ، بہائی، کیلاش اور زرتشت مذاہب۔ یہ تمام کتب ہر مذہب کے نمائندہ رہنماؤں کی مشاورت اور زیرِ سرپرستی تیار کی گئی ہیں۔ یہ قومی تعلیمی نصاب برائے

مذہبی تعلیم کے مطابق ہیں اور ہر قسم کے ثقافتی، لسانی یا نسلی تعصبات سے بالاتر ہو کر جاری کی جارہی ہیں۔ان درسی کتابوں میں کسی بھی مذہب یا پھر پاکستان اور ریاست کی مخالفت میں کوئی مواد شامل نہیں کیا جائے گا، مقدس کتابوں کے تمام مستند حوالے کتابوں میں شامل ہوں گے جبکہ ان میں شامل کیے جانے والے تمام نقشے سروے آف پاکستان کے مطابق ہوں گے۔

پاکستان کی یہ کوشش اس بات کو یقینی بنانے کے لیے جاری عمل کا حصہ ہے کہ مختلف مذاہب سے تعلق رکھنے والے بچوں کو اسکول میں اپنی نصابی کتب کے ذریعے ہی اپنے مذہب کا مطالعہ کرنے کا موقع ملے۔ تمام سات مذاہب کے ماہرین اس بات کو یقینی بنانے کے لیے سرگرم عمل ہیں کہ نصاب ان کے عقائد اور اقدار کا عکاس ہو۔ ہر طالب علم کا حق ہے کہ اسے برابری کے اصول پر تعلیم و تربیت کے مواقع فراہم کیے جائیں۔ جو عقائد و افکار اس کے مذہب سے مناسبت نہ رکھیں، اُسے اُنہیں پڑھنے پر مجبور نہ کیا جائے۔ پاکستان کی طرف سے یہ اقدام بہت مؤثر اور مفید ثابت ہو گا۔

سعودی عرب: وژن 2030ء اور مذہبی تعلیم میں اصلاحات

ادارتی ٹیم

ایک وقت تھا کہ سعودی عرب کے تعلیمی نظام کو ایک مذہبی نظام کے طور پہ دیکھا جاتا تھا۔ مسلم ممالک میں بھی تعلیم کی سطح پر صرف وہ جامعات معروف تھیں جو مذہبی تعلیمی ڈگریوں کے حوالے سے مشہور تھیں۔ لیکن اب ملک کا نقطہ نظر تبدیل ہوا ہے۔اکتوبر 2017 میں ولی عہد شہزادہ محمد بن سلمان نے اعلان کیا وہ اپنی ریاست کو جدید اسلام کی جانب موڑنے کا ارادہ رکھتے ہیں لہذا عالمی دنیا ان کے اس اقدام میں ان کا ساتھ دے اور ایک سخت گیر معاشرے کو بدل کر سماج کو آزادانہ بناتے ہوئے شہریوں کو بااختیار بنانے اور سرمایہ کاروں کی دلچسپی بڑھانے کے لئے ان کی کوششوں کی حمایت کرے۔اس ضمن میں تعلیم اور خصوصا مذہبی تعلیم میں خوب اصلاحات کا سلسلہ جاری ہے۔ اس مضمون میں سعودی عرب کے مذہبی تعلیمی ڈھانچے اور اصلاحات پر نظر ڈالی گئی ہے۔

سعودی عرب کے دستور میں تعلیم کے مقاصد اور مذہب کی اہمیت

سعودی عرب میں مذہب کو ایک ہمیشہ ایک خاص مقام حاصل رہا ہے۔اس کی وجہ اس کا ایسی سرزمین ہونا ہے جہاں مسلمانوں کے لیے مقدس ہے۔اور سعودی عرب میں بھی انفرادی واجتماعی زندگی کے تمام شعبوں میں مذہب کو مرکزی حیثیت حاصل رہی۔یوں تعلیم بھی منطقی طور پہ اس سے متاثر رہی۔ سعودی عرب کے آئین میں تعلیم کے مقاصد میں بھی مذہب شامل ہے۔

آئین کی دفعہ 13 میں مقاصد تعلیم اس طرح درج ہیں:

> "نئی نسل کے دلوں میں اسلامی عقدے کی تزکیز و آبیادی، اسے علوم و فنون میں مہارت حاصل کرنے کے لیے امداد مہیا کرنا اور اسے اس طرح تیار کرنا کہ وہ اپنے معاشرے کی تعمیر میں نفع بخش ثابت ہو، اپنے وطن سے محبت اور اپنی تاریخ پر فخر کرے۔"

ایسے ہی آئین کی دفعہ 23 میں حکومت کی ذمہ داری بتائی گئی ہے کہ وہ مذہب اور مذہبی اقدار کا سماجی

سطح پر تحفظ کرے گی:

''حکومت، عقیدہ اسلام کی حفاظت اور شریعت اسلامیہ کو نافذ کرے گی، امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا فریضہ سر انجام دے گی اور دعوت الی اللہ کا اہتمام کرے گی۔''

دفعہ 11 میں معاشرت کو اسلامی اقدار پر قائم کرنے پر زور دیا گیا ہے:

> ''سعودی معاشرے کا قیام اس اساس پر ہو گا کہ اس کے تمام افراد اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھام لیں، نیکی اور پرہیز گاری کے اصولوں پر ایک دوسرے سے تعاون کریں، باہم ایک دوسرے کا سہارا بنیں اور تفرقہ سے اجتناب کریں۔''

جدید سعودی عرب میں تعلیم

1932ء میں مملکت سعودی عرب کے قیام کے وقت ہر باشندے کی تعلیم تک رسائی نہیں تھی اور شہری علاقوں میں مساجد سے ملحق مدارس میں تعلیم کی محدود اور انفرادی کوششیں ہو رہی تھیں۔ ان مدارس میں اسلامی اور دینی تعلیم سکھائی جاتی تھی تاہم گذشتہ صدی کے اختتام تک سعودی عرب ایک قومی تعلیمی نظام کا حامل ملک بن گیا تھا جس میں تمام شہریوں کو اسکول سے قبل سے لے کر جامعہ کی سطح تک مفت تعلیم فراہم کی جاتی ہے۔ جدید سعودی تعلیمی نظام جدید اور روایتی شعبہ جات میں معیاری تعلیم فراہم کرتا ہے۔ اسلام کی تعلیم سعودی نظام تعلیم کا بنیادی خاصہ ہے۔ سعودی عرب کا مذہبی تعلیمی نصاب دنیا بھر کے مدارس اور اسکولوں میں بھی پڑھایا جاتا ہے۔

جدید سعودی عرب میں باقاعدہ بنیادی تعلیم کا آغاز 1930 کی دہائی میں ہوا۔ 1945 میں شاہ عبدالعزیز السعود نے مملکت میں اسکولوں کے قیام کے لیے ایک جامع پروگرام کا آغاز کیا۔ 6 سال بعد 1951 میں مملکت کے 226 اسکولوں میں 29 ہزار 887 طالب علم زیر تعلیم تھے۔ 1954 میں وزارت تعلیم کا قیام عمل میں آیا جس کے پہلے وزیر شہزادہ مہروز بن عزیز بنے۔ سعودی عرب کی پہلی جامعہ شاہ سعود یونیورسٹی 1957 میں ریاض میں قائم ہوئی۔

آج سعودی عرب کا قومی سرکاری تعلیمی نظام، 24 ہزار سے زائد اسکولوں اور ہزاروں کالجوں اور دیگر

تعلیمی و تربیتی اداروں پر مشتمل ہے۔اس نظام کے تحت ہر طالب علم کو مفت تعلیم، کتب اور صحت کی سہولیات فراہم کی جاتی ہیں۔ مملکت کے سرکاری میزانیہ کا 24 فیصد سے زائد تعلیم کے لیے مختص ہے۔ سعودی عرب میں طالب علموں کو اسکالرشپ پروگرام کے تحت بیرون ملک بھی بھیجا جاتا ہے جن میں امریکا، کینیڈا، برطانیہ، آسٹریلیا، جاپان، ملائیشیا جرمنی اور دیگر ممالک شامل ہیں۔

سعودی عرب میں 1956 تک خواتین کو تعلیم حاصل کرنے کی اجازت نہیں تھی۔ مگر اب انہیں خلا میں بھیجا جارہا ہے۔دلچسپ بات یہ ہے کہ سعودی عرب میں تعلیم سے خواتین کی محرومی کا دور 1950 کی دہائی تک جاری تھا لیکن جس کا سبب مذہب نہیں تھا بلکہ ثقافت تھی۔ یہ اس وقت ختم ہونا شروع ہوا جب پڑھے لکھے متوسط طبقے کے مردوں کے ایک گروپ نے شاہی خاندان سے لڑکیوں کے لیے اسکول قائم کرنے کی درخواست کی۔ ان مردوں کا خیال تھا کہ تعلیم یافتہ بیویاں خاندان اور ازدواجی زندگی کو ہم آہنگی کو بہتر طریقے سے بڑھاتی ہیں۔ خواتین کے لیے پہلا سرکاری فنڈ سے چلنے والا اسکول 1960 میں کھولا گیا تھا۔

اب صورتحال کتنی بدل چکی ہے اس کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ 2022 میں سعودی عرب میں خواتین کارکنان کی افرادی قوت میں شرکت 37 فی صد تک پہنچ گئی تھی، جو ظاہر ہے کہ تعلیمی انقلاب کا نتیجہ ہے۔جب 2009 میں شاہ عبداللہ نے ملک کی پہلی خاتون وزیر کو چنا اور نورہ بنت عبد اللہ الفایز کو نائب وزیر برائے تعلیم نسواں مقرر کیا تو پہلی بار ٹھوس قدم کا اشارہ ملا تھا۔اسی طرح، ڈاکٹر لیلیک الصفدی کو سعودی الیکٹرونک یونیورسٹی کی وائس چانسلر مقرر کیا گیا تو اس بات کا پیغام تھا کہ سعودی عرب میں اب سب کچھ بدل رہا ہے۔ڈاکٹر لیلیک الصفدی پہلی خاتون ہیں جو سعودی عرب کی ایسی یونیورسٹی کی صدر نشین بنی ہیں جہاں طلبہ وطالبات دونوں زیر تعلیم ہیں۔انہیں شاہی فرمان کے ذریعے یونیورسٹی کا سربراہ مقرر کیا گیا۔ڈاکٹر لیلیک الصفدی امتیازی تعلیمی قابلیت کی حامل شخصیت ہیں۔

وژن 2030 اور تعلیمی انقلاب

سعودی عرب کے تعلیمی منہج میں ایک طویل عرصے تک مذہب کا اثر ورسوخ بہت زیادہ رہا ہے۔ بلکہ مسلکی اعتبار سے وہابیت کو فروغ ملا۔ لیکن اب سعودی عرب تبدیل ہو رہا ہے۔ ولی عہد محمد بن سلمان نے ایک انٹرویو میں 1979 میں ایران میں انقلاب کو تنقید بناتے ہوئے کہا تھا کہ اس کی وجہ سے ان کی ریاست میں سخت گیر وہابیت کا نفاذ ہوا اور پچھلی تین دہائیوں سے ان کا ملک ایک 'نارمل' معاشرہ نہیں رہا۔ ان کا یہ بھی کہنا تھا کہ سابقہ سعودی حکمرانوں کو اندازہ ہی نہیں تھا کہ اس صورتحال سے کیسے نمٹا جائے۔

موجودہ حکومت نے تعلیم پر خاطر خواہ توجہ دی ہے۔ سعودی عرب کا تعلیمی بجٹ 53.4 بلین ڈالر ہے جو مسلمان ممالک میں سب سے زیادہ ہے۔ اس وقت سعودی عرب میں خواندگی کا تناسب 99 فیصد ہے جس میں مردوں کا تناسب 96 فیصد اور خواتین کا تناسب 91.73 فیصد ہے۔ سعودی عرب کے شعبہ تعلیم کے بارے میں دستیاب اعداد و شمار سے ظاہر ہوتا ہے کہ پرائمری اسکول میں جانے والے بچوں کی تعداد 3.8 ملین، سیکنڈری اسکولوں میں زیر تعلیم طلبہ کی تعداد 1.8 ملین اور اعلیٰ تعلیم کے مختلف شعبوں میں زیرِ تعلیم طلبہ کی تعداد 3.6 ملین ہے۔

سعودی عرب کی چودہ جامعات کو 2022 کی عالمی بہترین جامعات کی فہرست میں شامل کیا گیا ہے جبکہ اس سے پہلے سال کی فہرست میں اس کی صرف 10 جامعات ٹائمز کی درجہ بندی میں شامل تھیں۔

جامعہ شاہ عبدالعزیز سعودی عرب کے ساحلی شہر جدہ میں 1967 میں قائم کی گئی تھی۔ اس کو ٹائمز کی دنیا کی بہترین یونیورسٹیوں کی فہرست میں 190 ویں نمبر پر رکھا گیا ہے اور یہ مشرقِ اوسط کے خطے کی تمام جامعات میں سب سے آگے ہے۔

سعودی عرب نے 160 ممالک کے طلبہ کی سہولت کے لیے 'ادرس فی السعودیہ' (سعودی عرب میں تعلیم حاصل کریں) کے عنوان سے پلیٹ فارم متعارف کرایا ہے۔ وزارت تعلیم اس کے تحت

مختصر اور طویل المدتی تعلیمی ویزے جاری کرتی ہے۔

اسی طرح کنگ عبداللہ یونیورسٹی فار سائنس اینڈ ٹکنالوجی قائم کی گئی ہے۔ جس میں امریکہ، برطانیہ اور ملائیشیا کے اساتذہ کی خدمات حاصل کی گئی ہیں جنہیں بہت بڑی رقم ادا کی جارہی ہے۔

تعلیم اور انتہا پسندانہ نظریات

سعودی عرب نے نائن الیون کے بعد سے کئی مرتبہ اس امر کا اظہار کیا ہے کہ وہ تعلیم سے متشدد افکار کو ختم کر رہا ہے۔ سعودی عرب کے سابق وزیر تعلیم احمد العیسیٰ نے 2018 میں اپنے ایک پیغام میں کہا تھا ''وزارت تعلیم انتہاء پسندانہ نظریات سے لڑنے کے لیے نصابی کتب میں تبدیلیاں لانے پر کام کر رہی ہے۔ اس بات کو یقینی بنایا جائے گا کہ تعلیمی نصاب پر کالعدم اخوان المسلمون کا اثر ختم کیا جائے۔''

انہوں نے مزید کہا تھا، ''یونیورسٹیوں اور اسکولوں میں اس طرح کی تمام کتب پر پابندی عائد کر دی جائے گی اور اس گروپ سے ہمدردی رکھنے والوں کو ان کے عہدوں سے بھی برطرف کر دیا جائے گا''۔ تمام سرکاری یونیورسٹیوں میں اعلان کیا گیا تھا کہ اخوان المسلمون سے رابطے رکھنے والے تمام مشتبہ اہلکاروں کو برطرف کر دیا جائے گا۔ مزید یہ بھی کہا گیا تھا کہ حکومتی ناقدین کے خلاف یونیورسٹیوں میں بھی آپریشن کیا جائے گا۔

بہت سے تجزیہ نگاروں کی رائے ہے کہ سعودی عرب میں آنے والی تبدیلیاں اس کی خارجہ پالیسی میں بھی جھلکتی ہیں۔ افغانستان میں طالبان حکومت کے بارے میں سعودی عرب کی عدم دلچسپی اس کی بدلتی ہوئی اسی پالیسی کی طرف اشارہ ہے۔ حالانکہ 1996 میں سعودی عرب ان تین ملکوں میں سر فہرست تھا، جنہوں نے طالبان کی حکومت کو تسلیم کیا تھا۔ سعودی حکومت کو اس سلسلے میں نہ فقط عالمی سطح پر اخوان المسلمین اور دیگر مزاحمتی قوتوں کی تنقید کا سامنا ہے بلکہ داخلی طور پر بھی بہت سے سلفی علماء اس پر تنقید کر رہے ہیں۔

شہزادہ ترکی الفیصل جو نائن الیون کے وقت امریکا میں سعودی عرب کے سفیر تھے انہوں نے اُس

وقت کہا تھا کہ ''سعودی مملکت نے اپنی تعلیمی سرگرمیوں اور مواد پر نظرثانی کی ہے اور ایسے عنصر کو نصاب سے خارج کر دیا ہے جو جدید تعلیم کے تقاضوں سے میل نہیں کھاتے تھے۔ انہوں نے مختلف امریکی شہروں کے تقریری دوروں پر یہ بات کہی تھی کہ ''نہ صرف یہ کہ ہم نے اپنے نظام تعلیم کے سابقہ نصابی کتابوں سے ان چیزوں کو خارج کر دیا ہے جسے عدم برداشت کی علامت خیال کیا جاتا تھا۔ بلکہ ہم نے داخلی سطح پر نظرثانی اور تجدید کا ایک جامع منصوبہ نافذ کیا ہے۔''

سعودی حکومت نے گزشتہ دسمبر میں ''نیو ریپبلک'' اخبار میں ایک مکمل صفحے کا یہ اشتہار دیا تاکہ اپنی کامیابی کی تشہیر کر سکے:

> ''ہم نے اپنے اسکول نصاب کو جدید خطوط پر مرتب کیا ہے تاکہ ہمارے بچے مستقبل کے چیلنجوں کا سامنا کرنے کے لیے بہتر طور پر تیار ہو سکیں''۔

گزشتہ برس حکومت کے ایک ترجمان نے یہ اعلان کیا کہ:

> ''ہم نے اپنے تعلیمی نصاب پر نظرثانی کی ہے اور ایسے مواد کو جو دوسروں کے عقائد کے حوالے سے بھڑکانے اور عدم تحمل سے کام لینے کی جانب راغب کرنے کا کام کرتے تھے، نصاب سے خارج کر دیا ہے۔''

مغربی ممالک میں سعودی عرب اپنی معتدل شکل کو اجاگر کرنے کے لیے اپنی نصابی اصلاحات بارے معلومات عام کر رہا ہے۔ امریکا میں سعودی سفارت خانے نے ۴۷ صفحات پر مبنی نصاب کی اصلاحات سے متعلق جائزہ رپورٹ تقسیم کی ہے تاکہ یہ ظاہر کیا جا سکے کہ نصابی کتابوں کو متعدل بنا دیا گیا ہے۔ اسی طرح بین المذاہب ہم آہنگی کو فروغ دینے کے لیے بین الاقوامی معیار کا ادارہ KAICIID بھی بنایا گیا ہے۔

نصاب میں تبدیلیاں

Institute for Monitoring Peace and Cultural Tolerance in School Education ایک ایسا تحقیقی ادارہ ہے جو اقوام متحدہ کے ذیلی ادارہ یونیسکو کی بتائی ہوئی تعلیمی ہدایات کی روشنی میں دنیا بھر کے تعلیمی اداروں میں پڑھائی جانے والی ٹیکسٹ بکس اور تعلیمی و

درسی نصابوں کا گاہے بگاہے جائزہ لے کر اپنی رپورٹ اور سفارشات شائع کرتا ہے۔ دسمبر 2020 میں اسی ادارہ نے سعودی عرب کی درسی کتب اور تعلیمی نصاب کے بارے میں رپورٹ شائع کی جس میں بتایا گیا ہے کہ سعودی عرب نے اپنے ہاں پڑھائی جانے والی درسی کتابوں میں چند اہم تبدیلیاں کی ہیں۔

ان تبدیلیوں کے نتیجے میں نئی درسی کتابوں میں سے یہود مخالف اور جہادی مواد، نیز ارتداد اور ہم جنس پرستی کی سزاؤں کا ذکر حذف کر دیا گیا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ سعودی نصاب میں کی جانے والی تبدیلیاں سعودی عرب کے نئے معاشی و ثقافتی پروگرام (ویژن 2030) کا حصہ ہیں۔ رپورٹ کے مطابق درسی کتب میں تاحال مندرجہ ذیل قابل ذکر اور نمایاں تبدیلیاں کی گئی ہیں:

1- یہ جملہ کہ 'اللہ کی راہ میں جہاد کرنا اسلام کی معراج ہے' حذف کر دیا گیا ہے۔

2- جہاد سے متعلق سورۃ التوبہ کی آیات 41 تا 68 اور ان کی تفصیلی تشریح اور تفسیر پر مبنی ایک پورا باب نئی کتاب سے خارج کر دیا گیا ہے۔

3- ایک پورا پیراگراف جو اس تعلیم پر مشتمل تھا کہ ''منکرین اسلام کے ساتھ دشمنی ایمان کا جزو لاینفک ہے''، حذف کر دیا گیا ہے۔

4- ایک ایسی حدیث کو بھی حذف کر دیا گیا ہے جو ایک پیشگوئی پر مشتمل ہے جس کے مطابق آئندہ زمانہ میں ایک ایسی ناگزیر جنگ ہوگی جس میں مسلمان دنیا میں موجود سارے یہودیوں کو قتل کر دیں گے۔ رپورٹ کے مطابق اس حدیث کی وجہ سے مسلمان طلباء کے دلوں میں یہودیوں کے خلاف غصہ اور جارحیت کے ہیجان انگیز جذبات پروان چڑھتے تھے۔ رپورٹ میں دعویٰ کیا گیا ہے کہ یہ ایک ایسی حدیث ہے جو ہمیشہ سے مسلمانوں کے دلوں میں یہودیوں کے خلاف سخت نفرت، دشمنی و عناد پیدا کرنے کا سبب بن رہی تھی اس لیئے اس حدیث کو نئے سعودی نصاب میں سے حذف کر دیئے جانے کا اقدام بہت ہی بڑی اہمیت کا حامل ہے۔

5- ایک ایسا پورا باب ہٹا دیا گیا ہے جو کہ سورۃ البقرہ کی ایک ایسی آیت کی تفسیر اور تشریح پر مبنی تھا جس میں مسلمانوں کو تنبیہ کی گئی ہے کہ وہ یہود کے نقش قدم پر مت چلیں اور ان کی مشابہت مت اختیار کریں۔

6- پڑھایا جاتا تھا کہ چونکہ یہود پیغمبر اسلام حضرت محمد ﷺ کے منکر ہیں اس لئے ان کا مذہب یا تاریخ سے کوئی تعلق باقی نہیں رہا۔ نئے نصاب سے یہ جملہ بھی حذف کر دیا گیا ہے۔

7- یہ جملہ بھی حذف کر دیا گیا ہے کہ صیہونی قوتیں اور ان کے ایجنٹ اپنے مذموم مقاصد کے حصول کے لئے پیسوں، عورتوں اور منشیات کو استعمال میں لاتے ہیں۔

8- اسی طرح یہ نظریہ کہ قیامت کے روز سب سے پہلے یہودیوں کو موت کے گھاٹ اتارا جائے گا، بھی نصاب سے خارج کر دیا گیا ہے۔

9- ایک ایسے پیراگراف کو بھی نئے نصاب میں شامل نہیں کیا گیا جس میں درج تھا کہ دنیا میں مرتد کی سزا قتل ہے اور آخرت میں جہنم۔

10- اسی طرح سے ایک اور تفصیلی پیراگراف کو بھی نئے نصاب سے خارج کر دیا گیا ہے جس میں قوم لوط کے حوالے سے ثابت کیا گیا تھا کہ لواطت اور ہم جنس پرستی ایک گھناؤنا جرم ہے جس کی سزا موت ہے۔ یہ بھی پڑھایا جاتا تھا کہ ہم جنس پرستی کی وجہ سے دنیا میں قدرتی آفات بھی آتی ہیں اور وبائیں بھی پھیلتی ہیں۔

11- اسرائیل سے متعلق نفرت پر مبنی بہت سارے مواد کو بھی نئے نصاب میں سے حذف کر دیا گیا ہے۔ چنانچہ ''صیہونی خطرہ'' کے عنوان سے نصاب میں موجود ایک پورا باب حذف کر دیا گیا ہے جس میں بتایا گیا تھا کہ یہودی صیہونی لابی کس طرح پوری دنیا کو اکٹوپس کی طرح اپنے شکنجے میں جکڑنے کے لئے منظم طور پر سرگرم عمل ہے اور باقاعدہ پلاننگ کے ساتھ اس پر کام کرتی ہے۔

جدید اسلامیات کورس

سعودی وزارت تعلیم نے تمام اسکولوں، چائلڈ کیئر سنٹر، مدارس اور تعلیمی مراکز سے کہا ہے کہ وہ پرانے نصاب چھوڑ کر نئے اسلامیات اور قرآنی کورس کا پڑھانے کا انتظام کریں۔ اب پرایمری لیول میں اسلامیات اور قرآنی نصاب کو ایکدوسرے میں ضم کر دیا گیا ہے اور ایک نیا کورس 'قرآن و اسلامک اسٹڈیز' کے عنوان سے ترتیب دیا گیا ہے۔ اس نئے نصاب کو ہائی اسکولوں میں 34 کلاسز کی بجایے پندرہ کلاسز میں پڑھایا جاسکتا ہے اور پرائمری لیول میں ان کلاسز کو 38 کی بجائے تیس کلاسز تک محدود کر دیا گیا ہے۔ سعودی وزارت تعلیم نے قرآنی کورس بشمول تجوید، فقہ، حدیث و تفسیر کو بھی نئے انداز میں ترتیب دیا ہے اور اس کو یکساں طور پر پڑھانے کا حکم دیا ہے۔

التوعیۃ پروگرام کا اختتام

سعودی عرب میں تعلیمی اداروں میں اسلامی بیداری پروگرام 1969 میں رائج کیا گیا تھا۔ اسلامی بیداری پروگرام کے تحت گرمیوں کی تعطیلات میں کورسز کرائے جاتے تھے۔ ان پروگراموں میں اسلامی بیداری اور اسلامی دعوتی سرگرمیوں کے بارے میں طلباء طالبات کو آگاہی مہیا کی جاتی تھی۔ نصف صدی کے بعد یہ پہلا موقع ہے جب مملکت میں اسلامی بیداری پروگرام ختم کیے گئے ہیں۔ اس طرح کا ایک اور اقدام یہ کیا گیا ہے کہ سعودی عرب کے قیام کے سال کو 1744ء سے تبدیل کر کے 1727ء کرنے کا اعلان کیا گیا ہے۔ اس سے پہلے اس کے قیام کی تاریخ سعودی عرب کے شاہی خاندان اور عالم دین محمد ابن عبدالوہاب کے مابین 1744ء میں طے پانے والے ایک معاہدے پر مبنی تھی۔ اس معاہدے میں سعودی شاہی خاندان نے وہابیت کی مالی معاونت اور اسے تعلیم اور عوامی اخلاقیات کے امور کا اختیار دینے کا وعدہ کیا تھا۔ اس کے بدلے میں محمد ابن عبدالوہاب نے سعودی عرب میں شاہی خاندان کی حکمرانی کو مذہبی نقطہ نظر سے منظوری دینے کا وعدہ کیا تھا۔ جبکہ 1727ء میں محمد بن سعود نے ریاست کا کنٹرول حاصل کرنے کے بعد پہلی سعودی ریاست کے بانی کے طور پر اقتدار سنبھالا تھا۔

مذہبی تعلیم پر توجہ

سعودی عرب میں مذہبی تعلیم کو بالکلیہ کمزور نہیں کیا جارہا، البتہ اسے محدود کیا جارہا ہے اور عمومی حیثیت میں تعلیمی ڈھانچے پر اس کے غالب اثرات کو کم کیا جارہا ہے۔ جہاں تک مذہبی تعلیم کا تعلق ہے تو اس کو کو پہلے سے منظم کر کے مخصوص اداروں تک محدود کیا جارہا ہے۔ اس کے لیے بھی حکومت کی طرف مالی معاونت اور توجہ موجود ہے۔ مساجد کے اندر اور شہروں کے مخصوص احاطوں میں مذہبی تعلیم دی جارہی ہے۔اس ضمن میں مسجد نبوی اور مسجد الحرام میں خصوص کاوشیں کی جارہی ہیں۔

مسجد نبوی میں حفظ قرآن مجید کے لئے 406 اساتذہ کی نگرانی میں طلبہ کے حلقات کی تعداد 803 ہے جن سے 9182 طلبہ مستفید ہورہے ہیں۔اسی طرح 434 معلمات کی نگرانی میں 573 حلقات سے 11209 طالبات قرآن کی تعلیم حاصل کررہی ہیں۔ یہ تو وہ اعداد وشمار ہیں جو براہ راست ان حلقات میں شامل ہو کر استفادہ کرتے ہیں۔ آج کے اس فاصلاتی تعلیم کے دور میں فاصلاتی تعلیم سے مستفید ہونے والوں کا تعلق دنیا کے 124 ممالک سے ہے جن کی مجموعی تعداد 65818 ہے۔ قرآن مجید کے حفظ کے علاوہ دیگر علوم وفنون کے متون کا یاد کرنا ایک اچھے عالم کے لئے ضروری ہے اسی کی خاطر مسجد نبوی میں مختلف علوم وفنون کے متون بھی یاد کروائے جاتے ہیں، جس کے لئے 131 اساتذہ کی نگرانی میں طلبہ کی 288 حلقات ہیں۔ اسی طرح 84 معلمات کی نگرانی میں طالبات کے لئے 84 حلقات ہیں جن سے استفادہ کرنے والی طالبات کی تعداد 2139 ہے۔ یہ تو وہاں موجود رہ کر استفادہ کرنے والوں کی تعداد کی تفصیل ہے، جبکہ دنیا کے 98 ممالک کے 1971 طلبہ وطالبات مستفید ہوتے ہیں۔ یہ تو صرف قرآن مجید کے حفظ اور علمی متون کے یاد کرنے کی تفاصیل ہے۔ جبکہ تصحیح تلاوت کے حلقات الگ ہیں جن میں سے بہت سے حلقات سال بھر چلتے رہتے ہیں اور کچھ حلقات موسمی ہوتے ہیں جو زائرین کی قلت وکثرت سے کم وزیادہ ہوتے رہتے ہیں۔ اسی طرح بڑے بڑے علماء کے مستقل دروس ہوتے ہیں جو مختلف اوقات میں مختلف علوم وفنون کے مختلف کتابوں کو پڑھانے کا اہتمام کرتے ہیں۔ کہیں تفسیر کا درس ہوتا ہے تو کہیں حدیث کا کہیں علم قراءت کی مجلس

ہے تو کہیں علم حدیث کی۔ کہیں فقہ کے مسائل پڑھائے جاتے ہیں تو کہیں عقیدہ کی باریکیاں بتائی جاتی ہے تو کہیں وعظ ونصیحت ہوتی ہے۔اسی طرح باقاعدہ مسجد نبوی میں اعلی تعلیم حاصل کرنے والوں کے لئے مستقل کلیہ قائم ہے۔یہ صرف مسجد نبوی کی تعلیمی خدمات ہیں، مسجد حرام میں بھی اسی طرح کی علمی فضاء قائم ہے مختلف علوم وفنون کی تدریس ہوتی ہے اور باقاعدہ اعلی تعلیم کے لئے کلیہ موجود ہے۔سابقہ سطور سے اندازہ ہو گیا ہو گا کہ سعودی حکومت علم اور علماء کی کیسی سرپرستی کرتی ہے۔

جدید ترکی میں مذہبی تعلیم کی اُٹھان اور خصائص

ادارتی ٹیم

ترکی مسلم دنیا میں ایک ایسا ملک ہے کہ جہاں خلافت عثمانیہ کے سقوط کے بعد کمال اتاترک نے ملک سے مذہبی تعلیم کو مکمل طور پہ ختم کردیا تھا۔ بعد میں اگرچہ امام خطیب کی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے مخصوص اسکول کھولے گئے تھے، مگر وہ کافی وقت تک غیرمؤثر رہے۔یوں عملی طور پہ ملک کے اندر لوگ کسی باقاعدہ منظم مذہبی ادارے سے کئی دہائیوں تک محروم رہے،البتہ اکیسویں صدی کی شروعات سے بہت سی تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں اور سرکاری سرپرستی میں دینی علوم واداروں کو فروغ ملا ہے۔ اس مضمون میں ترکی کی موجودہ مذہبی تعلیمی صورتحال پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

خلافت عثمانیہ کے سقوط کے بعد ترکی کا تعلیمی ڈھانچہ مکمل طور پہ سیکولر کر دیا گیا تھا۔ کمال اتاترک نے تعلیمی شعبے میں جو چند امور اختیار کیے وہ درج ذیل ہیں،ان کے ذریعے ترکی کے نظام تعلیم کی ترقی کے مدارج کو آسانی سے سمجھا جا سکتا ہے۔

- تعلیمی نظام کو بڑے پیمانے پر تبدیل کیا گیا اور سائنسی علوم کو خاص طور پر شامل نصاب کیا گیا۔
- ریاست نے تعلیمی نظام کو مکمل طور پہ اپنے کنٹرول میں لے لیا اور نظام تعلیم کو ریاستی حیثیت میں ریگولیٹ کیا گیا۔
- تعلیمی نظام میں طبقاتی فرق کو ختم کیا گیا اور تمام لوگوں کے لیے یکساں معیار تعلیم کی فراہمی کو یقینی بنانے کی کوشش کی گئی۔
- نصاب کے بنیادی اصول ریاست کی طرف سے متعین کیے گئے تاکہ فکری و نظریاتی اعتبار سے ریاست مخالف فکر پروان نہ چڑھ سکے۔
- نصابِ تعلیم بنیادی طور پر نیشنلزم کی سوچ کو پروان چڑھاتا تھا۔
- کسی بھی طرح کا فکری اور مذہبی نصاب جو ایک سیکولر ریاست کے منافی ہو اس پر پابندی عائد کر دی گئی۔

آئین میں تعلیم

ترکی کے آئین میں درج ہے کہ:

Compulsory education is free for every citizen

یعنی ضروری تعلیم ہر شہری کے لیے مفت ہے۔ ترکی میں موجودہ حکومتی قوانین کے مطابق لازمی تعلیم میں آٹھ سالہ پرائمری ایجوکیشن اور چار سالہ سیکنڈری ایجوکیشن شامل ہے۔ یہ بارہ سالہ تعلیم ہر شہری کو حکومت کی طرف سے مفت دی جاتی ہے۔ ترکی میں ریاستی سطح کے اسکولوں میں تعلیم مفت ہے۔ اس کے علاوہ سرکاری یونیورسٹیوں میں بھی اعلی تعلیم ہر شہری کے لیے مفت ہے، نیز اپنے شہریوں کے علاوہ ترکی میں ہر سال بین الاقوامی طلباء کے لیے بھی ایک اسپیشل اسکالرشپ کا اعلان کیا جاتا ہے جس میں ان کے لیے معیاری تعلیم، قیام و طعام کی سہولتوں کے علاوہ معقول وظیفہ بھی دیا جاتا ہے، گویا ابتداء سے لیکر انتہائی درجے تک ہر سطح پر تعلیم کو عام کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اسی مقصد کے لیے ترکی میں 79 غیر منافع بخش ادارے قائم کیے گئے ہیں، ترکی میں سرکاری یونیورسٹیوں سمیت کئی ایک فاؤنڈیشن یونیورسٹیاں بھی قائم کی گئی ہیں جن کا مقصد ترکی کے شہریوں کو مفت تعلیم دینا ہے۔

ترکی کا معاصر تعلیمی ڈھانچہ

ترکی کا نظام تعلیم ریاست کے ماتحت ہے جس کے لیے ایک وزارت تشکیل دی گئی ہے، اسے (Ministry of National Education) کہا جاتا ہے۔ اس وزارت کا کام ترکی میں تعلیمی نظم کو قائم رکھنے، نصاب تعلیم، تعلیمی رجحانات کا جائزہ لینے، تعلیمی نظام اور نصاب میں عصر حاضر کے اتبارر سے تبدیلیاں کرنے، قوانین کی تشکیل، انکا اجراء اور ایسے ہی دیگر دوسرے تعلیمی امور کی دیکھ بھال کرنا ہے۔

ترکی میں ہر فرد کا خواندہ ہونا ضروری ہے، یہ ممکن نہیں کہ ترکی کا کوئی شہری غیر تعلیم یافتہ رہ جائے۔ 6 سال سے 11 سال کی عمر کے ہر بچے کو تعلیمی نظم کا حصہ ہونا انتہائی ضروری ہے۔ ریاستی

سطح کے اسکولوں میں تعلیم مفت دی جاتی ہے۔

ابتدائی تعلیم:

اسے کنڈر گارڈن بھی کہا جاتا ہے،اس کی تعلیم چھ سال سے کم عمر کے بچوں کو دی جاتی ہے تا کہ ان میں ابتدا ہی سے تعلیمی نظام کا حصہ بننے کی استعداد پیدا ہو سکے۔

پرائمری ایجوکیشن:

چھ سال سے چودہ سال تک کے بچے پرائمری ایجوکیشن کے دائرے میں آتے ہیں ،اسکی ابتدا پہلی جماعت سے مڈل تک ہوتی ہے جہاں طالب علم بنیادی سطح کی تعلیم میں مہارت حاصل کرتا ہے۔اس کا دورانیہ آٹھ سال کا ہوتا ہے۔

سیکنڈری ایجوکیشن:

چار سال کی جنرل سیکنڈری ایجوکیشن ہے۔اس میں پندرہ سے اٹھارہ سال تک کی عمر کے طلباء وطالبات شامل ہوتے ہیں، سیکنڈری ایجوکیشن میٹرک اور انٹر تک کی تعلیم فراہم کرتی ہے۔

پرائمری اور سیکنڈری کی یہ بارہ سالہ تعلیم ترکی میں لازمی تعلیم کے طور پر قانون کا ایک حصہ بنایا گیا ہے۔یہ تعلیم حاصل کرنا ہر شہری پر لازم ہے۔

ہائیر ایجوکیشن:

ترکی میں ہر قسم کی اعلی تعلیم یونیورسٹیوں میں ہی دی جاتی ہے۔اعلی تعلیمی نظام Council of Higher Education Commission کی سرپرستی میں چلتا ہے، صرف بعض انسٹیٹیوٹ ایسے ہیں جو براہ راست وزارت دفاع کے ماتحت تعلیمی عمل میں مصروف ہیں، ترکی میں پبلک سیکٹر یونیورسٹیز کے ساتھ کئی Foundation Universities بھی سرگرم عمل ہیں۔

تعلیم کی اسلامائزیشن

صدر طیب اردگان کی آمد کے بعد ترکی میں بڑے پیمانے پر اصلاحات ہوئی ہیں اور تعلیمی نظام میں اسلامی عنصر کو شامل کرنے کی بھرپور کوشش کی جارہی ہے تاکہ ترکی کی مذہبی روایت کا احیاء ہو سکے اور ترکی کو اس اسلامی مزاج سے قریب کیا جاسکے جو ترکی کی قدیم اسلامی روایت رہا ہے۔اس حوالے سے نچلی سطح پر مذہبی اسکولوں کے قیام سے لے کر اعلیٰ سطح کے تعلیمی درجات تک اس بات کا خاص خیال رکھا جارہا ہے کہ ترکی میں اسلامی فکری تعلیمی نظام کے راستے دوبارہ پروان چڑھ سکے۔

پروفیسر مصطفی، پروفیسر شعبہ اسلامک اسٹڈیز، یونیورسٹی آف استنبول کے تعارفی صفحے پر ترکی میں اعلیٰ تعلیمی سطح پر اسلامی تعلیم کا نقشہ کچھ یوں پیش کرتے ہیں:

> The Islamic and Religious Studies Program focuses on Islamic Studies with extensive instruction in Arabic. The language of instruction is Arabic (at least 30%) as well as Turkish and 50% of the curriculum of the undergraduate program is taught in Arabic by native Arabic speaking academic staff. Therefore, students registered in these programs are required to take Arabic preparatory classes. Those who successfully complete all 6 levels of Arabic courses are rewarded with an educational trip to Jordan, where they take further Arabic courses at the University of Jordan to improve their Arabic language skills as well as attending some other courses related to their programs for a period of two-three months.

صدر اردگان کی آمد کے بعد بڑے پیمانے پر ترکی کے تعلیمی نظام کو اسلامائز کرنے کی کوشش کی جارہی ہے اور سیکولر دور کے اثرات کو ختم کیا جارہا ہے۔ترکی کہ ہاں بدیع الزماں نورسی جیسی عظیم علمی شخصیات پیدا ہوئیں، جن کی کی گئی محنت سے ترکی دوبارہ سے اپنی اصل کی طرف لوٹ رہا ہے۔

امام حاطب اسکولوں کی تاریخ

سلطنت عثمانیہ کے خاتمے کے بعد ترکی کی نئی جمہوری حکومت نے تھوڑے سے عرصے میں ہی تمام مدارس دینیہ کو بند کروایا اور بہت سارے علماء کو جیل خانوں میں اور اسی طرح کئی اہم بڑے علماء کو ملک بدر کر دیا۔ البتہ اسی حکومت کے زمانے میں ہی کچھ عظیم شخصیات نے انفرادی طور پر امر بالمعروف اور درس و تدریس کا فریضہ خفیہ طور پر جاری رکھا۔ ان شخصیات میں سے استنبول کے شیخ محمود آفندی کا نام سر فہرست ہے۔ اس کے علاوہ بدیع الزماں سعید نورسی کی ''رسالہ نور'' کے نام سے تحریک نے بھی دینی خدمات کو جاری رکھا۔ ترکی میں اس خفیہ طریقے سے اسلام کے کام میں کئی سال گزر گئے۔ چونکہ ترکی کی اس سرزمین پر تقریباً ساڑھے چھ سو سال تک خلافت عثمانیہ کے قیام کی وجہ سے اور اسی طرح بعض اہل علم کی انفرادی محنتوں کے نتیجے میں لوگوں کے دلوں میں اسلام کے ساتھ قلبی لگاؤ کی تھوڑی سی رمق باقی تھی۔ اس وجہ سے نئی جمہوری حکومت نے مدارس کی جگہ دینی تعلیم کے لئے امام حاطب (امام خطیب) مکاتب کے قیام کا فیصلہ کیا۔ اس نظام تعلیم کے انعقاد کا مقصد یہ تھا کہ مذہبی ذہن رکھنے والے لوگ انہی سکولوں میں تعلیم حاصل کریں تاکہ یہ آگے حکومت کی باگ ڈور کو اپنے ہاتھوں میں لینے کے اہل نہ ہوں۔ چنانچہ 1924ء میں ترکی کی پارلیمنٹ میں توحیدی تدریسات کے نام سے ایک قانون پاس کروایا گیا۔ اس طرح سے ترکی میں امام خطیب مکاتب کی ابتداء کی گئی۔

لیکن بدقسمتی سے ان مکاتب میں ابتداء معیاری تعلیم نہ ہونے کی وجہ سے طلبہ کا رجحان ان کی طرف بہت کم رہا جس کی وجہ سے 1930ء میں ان مکاتب اور سکولز کو بند کیا گیا۔ 1950ء تک یعنی 20 سال تک یہ مکاتب بند رہے۔ البتہ 1951ء سے دوبارہ نئے سرے سے ان کا آغاز امام حاطب سکول کے نام سے کیا گیا۔ 1970ء تک یہ سکول مڈل لیول تک چلتے رہے پھر بعد میں ان سکولز کو ترقی دیتے ہوئے کالج کا درجہ دے دیا گیا۔ ابتدائی سالوں میں کالج سے فارغ ہونے والے طلبہ اور طلبات کو یونیورسٹی میں داخلے کے لئے کافی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ اس لیے کہ یونیورسٹی گرانٹس آف کمیشن کے ہاں امام خطیب سکول کی ڈگری قابل قبول نہ تھی۔ لیکن 1980ء میں امام خطیب کالجز کے طلباء کا یہ مسئلہ بھی

ختم ہوا۔اس کے بعد سے طلبہ تاحال یونیورسٹی کے مختلف شعبوں میں داخلے لے رہے ہیں۔

امام حاطب اسکولوں کا نصاب

امام حاطب سکولوں سے فارغ ہونے والے طلباء ترکی کی مساجد میں امامت و خطابت کے فرائض سرانجام دیتے ہیں اس لیے کہ ترکی کی اکثر مساجد حکومت کی زیر نگرانی میں ہیں۔ اس لیے اس ضرورت کو مد نظر رکھتے ہوئے ان سکولوں اور کالجوں کا نصاب مرتب کیا گیا ہے۔ ابتدا میں نصاب تقریباً نوے فیصد دینی مضامین پر مشتمل تھا جس میں قرآن، حدیث، فقہ، سیرت، عقائد، تاریخ، عربی وغیرہ سامل تھیں۔ لیکن ترکی کے حالات بدلنے کے ساتھ ساتھ اس کے نصاب میں تبدیلیاں بھی کی جاتی رہیں۔ اب موجودہ صورت حال میں تقریباً ساٹھ فیصد عصری علوم اور چالیس فیصد دینی علوم شامل نصاب ہیں۔ یہ طلبہ اعلی تعلیم حاصل کرنے کے بعد بیک وقت مسجد میں امام وخطیب، ہسپتال میں ڈاکٹر، عدالت میں جج اور کرسی اقتدار پر صدر اور وزیر اعظم بننے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ ترکی کے موجودہ صدر طیب اردوان بذات خود بھی اسی سکول سسٹم کے فارغ التصیل ہیں۔ انہوں نے 1973 میں استنبول کے ایک امام حاطب کالج سے میٹرک پاس کیا، وہاں سے ہی قرآن حفظ کیا، تجوید پڑھی اور علوم دینیہ حاصل کیے۔ اسی نظام تعلیم نے انہیں اسلام سے حقیقی لگاؤ عطا کیا۔

عصر حاضر میں یہ سکول تین تعلیمی مراحل میں کام کر رہے ہیں۔ پہلا مرحلہ پرائمری تک اور دوسرا مڈل اور تیسرا کالج تک ہے۔ ان تین طرح کے سکولوں اور کالجوں میں مخلوط تعلیمی نظام ہے۔ جس میں طلبہ اور طالبات ایک ساتھ تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ البتہ کالج کی سطح پر لڑکوں اور لڑکیوں کے کلاس رومز الگ الگ ہوتے ہیں۔ لیکن چند سالوں سے کالج کی سطح پر اب لڑکیوں کے لیے جگہ جگہ امام حاطب کالجز بھی قائم کیے گئے ہیں جس میں صرف لڑکیاں ہی تعلیم حاصل کر رہی ہیں۔ ان اداروں کی اہم خصوصیات یہ ہیں کہ ان سے ان سے فارغ ہونے والے طلبہ اور طالبات چاہے کسی بھی شعبہ سے تعلق رکھتے ہوں ان کو قرآن اور حدیث کی بنیادی احکام اور مسائل کا علم ضرور ہوتا ہے۔ ترکی میں اس وقت چالیس ہزار سے زائد ایسی مساجد ہیں جو وزارت مذہبی امور کے زیر انتظام چل رہی

ہیں۔ ان کے نوے ہزار کے لگ بھگ ائمہ و خطباء اور خدماء انہی کالجوں اور یونیورسٹی کے شعبہ الہیات سے فارغ التحصیل ہیں۔ امام خطیب سکولز میں پڑھنے والے طلبہ اور طالبات کی تعداد میں ہر آنے والے سال میں اضافہ دیکھنے میں آرہا ہے۔ چنانچہ ایک تحقیق کے مطابق امام حاطب سکولز میں پڑھنے والے طلبہ کی تعداد 2002ء میں 71 ہزار تھی۔ 2012ء میں 94 ہزار 461 ہوئی جبکہ 2017 میں 657 ہزار ہوگئی۔ اس وقت اس نظام تعلیم میں پڑھنے والے طلبہ کی کل تعداد 1 ملین 2 لاکھ 91 ہزار ہے۔ جبکہ صرف امام حاطب کالجز میں اس وقت کل طلبہ اور طالبات کی تعداد 6 لاکھ 60 ہزار 406 ہے۔ جس میں 3 لاکھ 80 ہزار لڑکیاں ہیں۔ دراصل پچھلے دس سالوں سے امام حاطب کالجز میں لڑکیوں کی تعداد میں ہر سال اضافہ ہوتا نظر آرہا ہے۔ اس کی ایک بنیادی وجہ موجودہ حکومت ہے کیونکہ طیب اردوان نے ہی سکارف اوڑھنے اور نقاب پر پابندی ختم کی جس کی وجہ سے لڑکیوں کا رجحان زیادہ ہوا۔ اس کے علاوہ چونکہ اس نظام تعلیم میں دنیاوی تعلیم کے ساتھ ساتھ بنیادی دینی تعلیم بھی دینی ماحول میں رہ کر پڑھائی جاتی ہے اس وجہ سے بھی لڑکیوں کا رجحان زیادہ ہے۔

امام حاطب کالجز کی خصوصیات

اس نظام تعلیم کی بعض خصوصیات درج ذیل ہیں:

اس نظام تعلیم میں دنیاوی تعلیم کے ساتھ ساتھ اسلام کی بنیادی تعلیم ایک منظم اسلوب کے ساتھ پڑھائی جاتی ہے۔

ان سکولز اور کالجوں میں غریب طالبات کو دوپہر کا کھانا مفت دینے کے علاوہ سکول تک آنے جانے کا کرایہ بھی دیا جاتا ہے۔

ان کالجز کا سیکیورٹی نظام بہت سخت ہے، چنانچہ سکول میں داخل ہونے کے بعد چھٹی تک کالج کے گیٹ سے بغیر اجازت نکلنا ناممکن ہے۔ البتہ پرنسپل کے آفس سے اجازت ملنے کے بعد ضرورت کے لیے باہر جاسکتی ہیں۔

سب سے اہم چیز جس کی وجہ سے آج کل پڑھائی میں کافی خلل آتا ہے وہ موبائل فون ہے لیکن ان

کالجز میں طالبات کے لیے صبح 8 بجے سے دوپہر بجے تک موبائل فون استعمال کرنا ممنوع ہوتا ہے۔ کالج میں موبائل فون کے لئے الگ الماریاں بنائی گئی ہیں جہاں پر سب طالبات موبائل رکھتی ہیں پھر 3 بجے چھٹی کے بعد ساتھ لے کر جاتی ہیں۔

ان کالجز میں عملی طور پر وعظ اور خطابت کی تعلیم بھی دی جاتی ہے تاکہ کل معاشرے میں مفید فرد کی حیثیت سے آگے دین کا کام کر سکیں۔

ترکی میں اس وقت بیس ہزار سے زائد ایسی مساجد ہیں جو وزارت مذہبی امور کے زیر اہتمام چل رہی ہیں۔ ان کے ساٹھ ہزار کے لگ بھگ ائمہ وخطبا انہی سکولز اور یونیورسٹی کی الہیات فیکیلٹی سے فارغ التحصیل ہیں۔ ترکی کی وزارت دیانت ائمہ وخطباء انہی یونیورسٹی کی الہیات فکیلٹی سے ڈگری لینے والوں کو ترجیح دیتی ہے۔ ایک ریسرچ کے مطابق اس وقت ترکی میں 30000 امام خطیب سکول قائم ہیں۔ جن میں لاکھوں بچے زیر تعلیم ہیں۔

ترکی میں ایردوآن حکومت میں کی جانے والی تعلیمی اصلاحات کے بعد مذہبی اسکولوں کی تعداد میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے۔ وزارت قومی تعلیم کے مطابق گزشتہ پانچ برسوں میں مڈل تک کی تعلیم دینے والے ایسے اسکولوں کی تعداد ایک ہزار ننانوے سے بڑھ کر تین ہزار دو سو چھیاسی ہو چکی ہے، جب کہ امام حاطب نامی مذہبی مدرسوں کی تعداد الگ ہے۔ اس وقت ترکی میں مجموعی طور پر مذہبی تعلیم حاصل کرنے والے بچوں کی تعداد چھ لاکھ بیس ہزار ہے۔

مذہبی اسکولوں سے متعلق عوامی رائے

امام حاطب اسکولز(Imam Hatip Schools)سے متعلق ترکی کے عوام میں مختلف رائے پائی جاتی ہیں۔ سیکولر ذہنیت کے حاملین اس نظام کی سخت مخالفت کرتے ہیں، ان کا کہنا ہے کہ ہمارے بچوں کو سر پر اسکارف، اور ڈھیلا ڈھالا لباس پہننا پڑے گا، یہ نظام ہمیں پیچھے کی طرف لے جانا چاہتا ہے حالانکہ ہم اپنے بچوں کو سیکولرازم کے اصولوں پر تعلیم دینا چاہتے ہیں۔ جبکہ دوسری طرف مذہبی سوچ کے حاملین اس طرز تعلیم سے نہ صرف مطمئن ہیں بلکہ اس نظام کے قیام پر انتہائی خوش دکھائی

دیتے ہیں،ان کے بقول ترکی ایک اسلامی ملک ہے اور ان کے باسیوں کو اسلامی تعلیم دینا انتہائی ضروری ہے جس کو Imam Hatip Schools انتہائی احسن طریقے سے انجام دے رہے ہیں۔

قرآن کورس(دارالقرآن) کے نام سے قائم کئے گئے ادارے

ترکی میں ایک طویل عرصے تک قرآن کی تعلیم نہ ہونے برابر تھی لیکن اب طیب اردوان کی کوششوں سے ایک مرتبہ پھر قرآن کریم کی تعلیم کے لیے ہر شہر میں سینکڑوں کی تعداد میں مراکز قائم کئے گئے جبکہ وقت کے ساتھ ساتھ ان مراکز کی تعداد میں اضافہ ہوتا ہوا نظر آرہا ہے۔

قیصری شہر ترکی کا پانچواں بڑا شہر ہے،اس کی آبادی تقریباً 2 ملین ہے۔اس شہر میں سرکاری طور پر قرآن کورسس کے نام سے جگہ جگہ پر 450 ادارے قائم کئے گئے ہیں۔ان اداروں میں ہر سال بچوں اور بچیوں کی تعداد میں اضافہ دیکھنے میں آرہا ہے۔یہ ادارے دو قسم کے ہیں۔اکثر اداروں میں ناظرہ قرآن کریم کی تعلیم دی جاتی ہے جبکہ بعض اداروں میں قرآن کریم کے حفظ کی تعلیم بھی دی جاتی ہے، ان میں سے 15 ادارے لڑکیوں کی تعلیم کے ساتھ خاص ہیں۔قرآن کورسس کے نام سے قائم کئے گئے اداروں میں پڑھانے والی اکثر خواتین ہیں جنہوں نے امام حاطب کالجز یا پھر جامعات سے شعبہ علوم اسلامیہ میں ایم اے تک تعلیم مکمل کی ہوتی ہے۔ان اداروں میں ترکی کی دیگر سرکاری اداروں کی طرح تعلیم اور کتابیں وغیرہ بغیر کسی اجرت کے دی جاتی ہیں۔ان میں قرآن کریم کی تعلیم کے ساتھ ساتھ بنیادی تعلیم بھی دی جاتی ہے۔قرآن کریم حفظ کرنے والی طالبات کے لئے ان اداروں میں کھانے پینے اور رہائش کا انتظام حکومت کی طرف سے ہوتا ہے۔قرآن کریم حفظ کرنے والی طالبات صبح کے اوقات میں دنیاوی تعلیم کے حصول کے لئے سکولز اور کالجوں میں جاتی ہیں جبکہ دوپہر کے بعد رات تک قرآن حفظ کرتی ہیں۔قرآن کریم حفظ کرنے کے بعد وفاقی مذہبی امور کے زیر نگرانی ادارہ امور دیانت کی طرف سے ان کو اسناد دی جاتی ہیں۔

جامعہ ازہر کے علمی تخصصات اور شعبے

حافظ غلام انور ازہری

مصر اسلامی اور دینی تعلیم کی ترویج و اشاعت اور ترقی کے لیے ہمیشہ سے اسلامی ممالک میں سرفہرست رہا ہے۔ اور اس مقصد کے لیے مصر میں مختلف تعلیمی اور دینی ادارے مصروفِ عمل ہیں، جن میں جامعہ الازہر سرفہرست ہے جس کی خدمات دنیا بھر میں معروف و مشہور ہیں۔ الازہر یونیورسٹی کا شمار دنیا کی قدیم ترین یونیورسٹیوں میں ہوتا ہے۔اس کے علاوہ الازہر یونیورسٹی کے چیدہ چیدہ علماء اور اساتذہ دنیا میں اسلام، قرآن و حدیث اور عربی زبان کی تعلیمات مختلف مسلم ممالک، یورپ اور امریکہ میں سرانجام دے رہے ہیں۔ ہزاروں لوگ الازہر یونیورسٹی سے اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے مختلف ممالک میں پھیلے ہوئے ہیں۔ یہ علماء فخر سے خود کو الازہری کہلاتے ہیں۔ ان میں سے کئی رؤسا اسلامی ممالک کے سربراہ بھی ہیں۔زیرنظر مضمون میں جامعہ ازہر کے دینی شعبوں کے نصاب کا خلاصہ پیش کیا گیا ہے۔مضمون نگار اسلامی علوم کے محقق اور جامعہ ازہر سے پی ایچ ڈی ہیں۔

جامعہ الازہر کا تعلیمی نظام

مصر اپنے تاریخی مقامات اور ثقافت کی وجہ سے پوری دنیا خصوصا یورپ وغیرہ میں جانا پہچانا جاتا ہے،اور اپنی دینی و ملی خدمات کی وجہ سے پورے عالم خاص کر عالم اسلام میں مشہور و معروف ہے، مصر کی اسی سرزمین پر امام شافعی، سیدہ نفیسہ، امام کمال ابن الہمام حنفی، امام دسوقی مالکی رحمہم اللہ جیسے بڑے بڑے علماء اور محدثین، فقہاء اور صوفیاء نے دین کی عظیم خدمت انجام دی ہے، اپنے بزرگان دین کے نقش قدم پر چلتے ہوئے بادشاہ صلاح الدین ایوبی رحمہ اللہ کے دور حکومت ۱۱۷۱ عیسوی سے لے کر آج تک ''جامعہ ازہر شریف'' کے سنی فارغین، علماء اور محققین مختلف طریقے سے اسلام و مسلمین کی خدمت انجام دیتے آرہے ہیں۔آج کل مصر میں تمام دینی امور تین ادارے سرانجام دیتے ہیں: (۱) وزارت اوقاف: تمام مساجد میں ائمہ اور خطباء کی تعیین اور اس سے متعلق ہر طرح کا انتظام وانصرام وزارت اوقاف کے ہاتھوں ہوتا ہے (۲) دارالافتاء: مسائل دریافت کرنے کے لئے عام و

خاص اس کی طرف رجوع کرتے ہے، یہ دارالافتاء وزارت العدل (منسٹری آف جسٹس) کے ماتحت ہے، جس کی وجہ سے اسے قانونی حیثیت بھی حاصل ہے (۳) جامعہ ازہر شریف: جس کا مختصر تعارف قارئین کرام عنقریب ملاحظہ کریں گے۔ وزارت اوقاف جامعہ ازہر ہی کے ماتحت آتا ہے۔

جامعہ ازہر شریف کا مختصر تعارف:

فاطمی حکومت کے چوتھے خلیفہ ''المعز لدین اللہ'' شمال افریقہ سے بحر اٹلانٹک تک کی ریاست کو فاطمی حکومت کے تحت لانے کے بعد مصر کی طرف متوجہ ہوئے۔ چنانچہ انہوں نے مصر کو اپنی حکومت کے تحت لانے کے لئے ''جوہر صقلی'' کو ایک ہزار فوج کا رئیس بنا کر اس کی طرف روانہ کر دیا، اس کے ہاتھوں فاطمی حکومت کو ۱۷، شعبان ۳۵۸ھ مطابق ۹۶۹ء میں مصر پر فتح حاصل ہوئی۔ مصر کی نئی حکومت کے لئے ''جوہر صقلی'' ہی نے ایک مسجد قائم کی، اور اس کا نام ''جامع القاہرۃ'' رکھا، کچھ صدی کے بعد یہ مسجد ''جامع القاہرۃ'' کے بجائے ''الجامع الازہر'' کے نام سے مشہور و معروف ہوئی۔ اس مسجد کی بنیاد ۲۴، جمادی الاولی ۳۵۹ھ مطابق اپریل، ۹۷۰ء میں رکھی گئی، اور ۷، رمضان ۳۶۱ھ مطابق ۲۳، جون ۹۷۲ء میں پائیہ تکمیل کو پہنچی۔ فاطمی حکومت ۹۶۹ء سے ۱۱۷۰ء تک اپنے افکار جامعہ ازہر کے ذریعہ پھیلاتی رہی، مگر جب ۱۱۷۱ء میں مصر کی باگ وڈور بادشاہ صلاح الدین ایوبی کے ہاتھ میں آئی، تو آپ نے جامعہ ازہر سے فاطمی حکومت کے افکار کو ختم کر کے وہاں سے اہل سنت و جماعت کے افکار و عقائد کی نشر و اشاعت کا انتظام فرمایا۔ بہر حال یہ مسجد اپنی گونگوں دینی و ملی خدمات کی بدولت جامعہ کی شکل اختیار کر گئی، اور دیکھتے ہی دیکھتے یہ جامعہ ''جامعہ ازہر شریف'' کے نام سے پوری دنیا میں مشہور و معروف ہو گیا۔ آج یہ جامعہ عالم اسلام کی وہ عظیم درسگاہ ہے جس میں دینی اور دنیوی تمام علوم کی تعلیم دی جاتی ہے، دینی تعلیم کیلئے جامعہ ازہر شریف کو عالم اسلام بلکہ پوری دنیا کا مرجع مانا جاتا ہے۔ اس وقت ازہر کے طلبہ کی ٹوٹل تعداد ۱۰ لاکھ سے زیادہ ہے جس میں تقریبا ۵۰ ہزار غیر ملکی طلبہ ہیں، جن کا تعلق ۱۰۰ سے زائد ممالک سے ہے، ان طلبہ کی تعلیم و تربیت کے لئے ۶ ہزار سے زائد فقط مصر میں ازہر کے معاہد (انسٹیٹیوٹس) اور اسکولز عالم وجود میں آئے۔

جامعہ ازہر میں تعلیم سے متعلق تمام شعبہ جات تقریباً ۷۰ کی تعداد میں ہیں۔ آکسفورڈ، کیمبرج، کراچی یونیورسٹی، انٹر نیشنل اسلامک یونیورسٹی اسلام آباد، انٹر نیشنل اسلامک یونیورسٹی ملیشیا، ام القری یونیورسٹی مکہ مکرمہ، اسلامک یونیورسٹی مدینہ منورہ، وغیرہ عالمی جامعات میں جتنے شعبے ہیں وہ سب جامعہ ازہر میں بوجہ اکمل موجود ہیں۔ یعنی میڈیکل، انجنیرنگ، سائنس اور دینی تمام قسم کے شعبے، اور تخصصات مثلاً تفسیر اور علوم قرآن، حدیث اور علوم حدیث،، فقہ اور اصول فقہ، کلام اور عقیدہ، دعوہ، اسلامی معاشیات، بینکاری، تجارت، عربی زبان وادب، تصوف، تربیت، سیرت، قراءت وتجوید، افتاء، فکر جدید اور مطالعہ غرب، استشراق وتبشیر، تقابل ادیان اور اسلامی ثقافت وحضارت وغیرہ سب کے سب تخصصات جامعہ ازہر میں موجود ہیں۔

بعض دینی کلیات (فیکلٹیز) میں ابتدائی دو سال کے مواد (مضامین) اگرچہ ایک ہوتے ہیں، مگران کے تخصصات کے نصاب میں کافی حد تک فرق موجود ہوتا ہے، جس کی وجہ سے ایک شعبۂ تخصص دوسرے سے بے نیاز نہیں کر سکتا۔ مثلاً کلیہ اصول الدین بی اے میں پہلے دو سال کے مواد ایک ہی ہوتے ہیں مگر باقی دو سال جسے تخصص کا درجہ حاصل ہے ان کے شعبہ جات مختلف ہونے کی وجہ سے ان کے مواد بھی مختلف ہوتے ہیں۔

جامعہ ازہر کے تعلیمی نصاب کا مختصر خاکہ

مصری طلبہ کیلئے حضانہ یعنی نرسری ۲ سال، پرائمری ۶ سال، اور ثانویہ یعنی ہائی اسکول ۳ سال، اس کے بعد کلیہ یعنی بی اے ۴ سال (بی اے کچھ کلیات میں ۵ سال کا بھی ہے) پھر ماجستر یعنی ایم اے ۴ سال جس کے اخیر کے ۲ سال میں ۴۰۰، ۵۰۰ صفحہ کا رسالہ لکھوایا جاتا ہے۔ اس کے بعد پی ایچ ڈی کم از کم ۳ سال کی ہوتی ہے اس میں بھی کسی موضوع پر رسالہ لکھوایا جاتا ہے۔

غیر ملکی طلبہ کیلئے نرسری اور پرائمری تو نہیں ہے۔ البتہ ان کیلئے ایک اضافی شعبہ ''معہد الدراسات الخاصۃ للغۃ العربیۃ لغیر الناطقین بہا'' اور ''مرکز تعلیم اللغۃ العربیۃ للوافدین'' ہے، جس میں غیر ملکی طلبہ (جو مصر میں بغیر کسی معادلہ کے تعلیم حاصل کرنے آتے ہیں) شروع میں عربی زبان سیکھنے کیلئے

داخل ہوتے ہیں۔ باقی ان کے دوسرے مراحل بھی مصری طلبہ ہی کی طرح ہوتے ہیں۔ ہاں ایک بات اوران سے مختلف ہوتی ہے وہ یہ کہ وافدین کو کلیہ کے مرحلہ میں ہر سال کم از کم ایک پارہ حفظ کرکے اس کا تحریری و تقریری امتحان دینالازمی ہوتاہے، مگر مصری طلبہ کا معاملہ وافدین سے مختلف ہوتاہے، ان کو ہر سال ساڑھے سات پارے حفظ کرکے اس کا تحریری و تقریری امتحان دیناضروری ہوتاہے۔ اس طرح مصری طلبہ کلیہ کے مرحلہ میں ہی حافظ قرآن ہو جاتے ہیں۔ یہ جامعہ ازہر کا تمام اسلامی جامعات کے درمیان خاص وصف اور طرہ امتیاز ہے۔ اس کے علاوہ جامعہ ازہر میں سہ ماہی ''دورہ تدریبیہ'' جسے ''ائمہ کورس'' بھی کہتے ہیں۔ ملک اور بیرون ملک کے لئے مسلسل پورے سال رواں دواں رہتاہے، اس میں تمام اسلامی مضامین، اسلامی معاشیات واقتصاد، کمپیوٹر، انٹرنیٹ اور دیگر تمام اسلامی موضوعات پر لیکچرز ہوتے ہیں۔ ہم یہاں پر مرحلہ ثانویہ (ہائی اسکول)، کلیات (بی اے)، ماجستیر (ایم اے) اور دکتوراہ (پی ایچ ڈی) کا تفصیلی منہج پیش کرتے ہیں:

مرحلۂ ثانویہ (ہائی اسکول):

مرحلہ ءثانویہ (ہائی اسکول) میں یہ مواد و مضامین پڑھائے جاتے ہیں:

(۱) الفقہ (۲) التفسیر (۳) الحدیث (۴) القرآن الکریم (۵) التوحید (۶) التجوید (۷) النحو (۸) الصرف (۹) البلاغۃ (۱۰) الادب والنصوص (۱۱) الانشاء (۱۲) التاریخ (۱۳) الجغرافیا (۱۴) اللغۃ الاجنبیۃ، انگریزی یا فرنسی، (۱۵) المطالعۃ والنصوص (۱۶) المحفوظات۔ اس کے علاوہ سائنس، معاشرتی علوم، علم الاجتماع، العروض والقوافی پرائمری کے مرحلہ ہی میں پڑھادئے جاتے ہیں، جن کا باقاعدہ تفصیلی نصاب مقرر ہوتاہے۔

کلیہ اصول الدین (بی اے):

کلیہ اصول الدین (بی اے) کے پہلے سال میں یہ مضامین پڑھائے جاتے ہیں:

پہلے سال کے مضامین: (۱) تاریخ السنۃ النبویۃ (۲) علوم القرآن (۳) نظم اسلامیۃ (۴) نحو و صرف

(۵) منطق قدیم(٦) فقہ (۷) تفسیر تحلیلی (۸) حدیث تحلیلی (۹) توحید(۱۰) اصول دعوۃ (۱۱) تصوف (۱۲) ملل و نحل (۱۳) علوم حدیث (۱۴) قصص قرآن کریم (۱۵) لغۃ اوروبیۃ انجلیزی یا فرنسی (١٦) حفظ قرآن کریم۔

دوسرے سال کے مضامین: (۱) منطق قدیم (۲) فلسفۃ عامۃ (۳) علوم قرآن (۴) علوم حدیث (۵) خطابۃ (٦) شبہات حو الحدیث (۷) فقہ (۸) تفسیر تحلیلی (۹) توحید (۱۰) نظم اسلامیۃ (۱۱) اخلاق اسلامیۃ (۱۲) تیارات فکریۃ (۱۳) ادب وبلاغۃ (۱۴) شبہات حول القرآن (۱۵) لغۃ اوروبیۃ انگلش یا فرنچ (١٦) حفظ قرآن کریم۔ ان دو سالوں کے بعد کلیہ اصول الدین کے تخصص کی چار فرعیں نکلتی ہیں جن کے منہج کی تفاصیل مندرجہ ذیل ہیں:

(۱) تفسیر وعلوم قرآن میں تخصص:

تیسرے سال شعبہ تفسیر وعلوم قرآن کے مواد:

(۱) التفسیر التحلیلی (۲) التفسیر الموضوعی (۳) مناہج المفسرین (۴) علوم القرآن (۵) السیرۃ التحلیلیۃ من الکتاب والسنۃ (٦) الحدیث (۷) الدخیل فی التفسیر (۸) التوحید (۹) الخطابۃ (۱۰) علم الرجال ومناھج المحدثین (۱۱) التیارات الفکریۃ المعاصرۃ (۱۲) الفقہ (۱۳) اللغۃ الاوروبیۃ انگلش یا فرنچ (۱۴) حفظ قرآن کریم (۱۵) ذخائر تفسیر (١٦) تدوین قرآن (۱۷) شبہات حول القرآن والرد علیہا۔

چوتھے سال شعبہ تفسیر وعلوم قرآن کے مضامین:

(۱) التفسیر التحلیلی (۲) الدخیل فی التفسیر (۳) قاعۃ البحث (۴) مناہج المفسرین (۵) السیرۃ التحلیلیۃ من الکتاب والسنۃ (٦) الاستشراق والتبشیر (۷) اصول الفقہ (۸) اللغۃ الاوروبیۃ انگلش یا فرنچ (۹) الفلسفۃ الاسلامیۃ (۱۰) الحدیث الموضوعی (۱۱) التفسیر الموضوعی (۱۲) علوم القرآن (۱۳) الحدیث التحلیلی (۱۴) حفظ القرآن الکریم۔

(۲)علوم حدیث میں تخصص:

تیسرے سال شعبہ علوم حدیث کے مواد:

(۱) تخریج (۲) توحید (۳) سیرۃ تحلیلیۃ(۴) دراسۃ الاسانید (۵) مناھج المفسرین (۶) خطابۃ(۷) حدیث تحلیلی (۸) حدیث موضوعی(۹) تصوف(۱۰) مصطلح الحدیث (۱۱) شبہات حول السنۃ النبویۃ(۱۲) مناھج المحدثین (۱۳) تفسیر موضوعی(۱۴)وسائل تبلیغ الدعوۃ(۱۵) قضایا فقھیۃ معاصرۃ (جدید فقھی مسائل)(۱۶)حفظ قرآن کریم۔

چوتھے سال شعبہ علوم حدیث کے مضامین :(۱)مناھج الدعوۃ (۲) تفسیر موضوعی (۳) مناھج المحدثین (۴) علل الحدیث (۵) توحید (۶) مختلف الحدیث و مشکلہ (۷) حدیث تحلیلی (۸) حدیث موضوعی(۹) مصطلح الحدیث(۱۰)دفع الشبہات حول الحدیث(۱۱) تخریج(۱۲)سیرۃ(۱۳)دخیل فی التفسیر(۱۴)استشراق والتبشیر(۱۵)ملل و نحل(۱۶)اصول فقہ(۱۷)حفظ قرآن کریم۔

(۳)عقیدہ و فلسفہ میں تخصص:

تیسرے سال شعبۂ عقیدہ و فلسفہ کے مواد:

(۱)توحید (۲)فلسفہ اسلامیۃ(۳) فلسفۃ یونانیۃ(۴) منطق حدیث و مناہج بحث(۵) ملل و نحل (۶) تیارات فکریۃ (۷) اخلاق فلسفیۃ(۸) تصوف (۹) فرق اسلامیۃ(۱۰) علم نفس (۱۱) خطابۃ (۱۲) وسائل تبلیغ الدعوۃ(۱۳) تفسیر موضوعی(۱۴) مناہج مفسرین(۱۵) حدیث موضوعی (۱۶) مناہج محدثین(۱۷) قضایا فقھیۃ معاصرۃ(۱۸)القرآن الکریم۔

چوتھے سال شعبۂ عقیدہ و فلسفہ کے مضامین:

(۱)توحید(۲)فلسفۃ اسلامیۃ(۳)نصوص قرآنیۃ و فلسفیۃ(۴)الفلسفۃ الاوربیۃ الحدیثۃ والمعاصرۃ(۵)فلسفۃ اوربیۃ فی العصور الوسطی (۶)تیارات فکریۃ (۷)تصوف اسلامی (۸)استشراق و تبشیر (۹) تفسیر موضوعی (۱۰)مناہج مفسرین (۱۱)مناہج محدیثین (۱۲) تخریج حدیث (۱۳)علم اجتماع (۱۴)مناہج

دعوۃ(۱۵)اصول فقہ (۱٦)القرآن الکریم۔

(۴)دعوہ اسلامیہ میں تخصص:

تیسرے سال شعبۂ دعوہ وثقافہ اسلامیہ کے مضامین:

(۱)اصول الدعوۃ(۲)الخطابۃ(۳)الاستشراق والتبشیر(۴)الثقافۃ الاسلامیۃ(۵)التفسیر الموضوعی (٦) الحدیث الموضوعی(۷) التوحید (۸) الحضارۃ الاسلامیۃ(۹) اللغۃ العربیۃ(۱۰) تاریخ الدعوۃ (۱۱)وسائل تبلیغ الدعوۃ (۱۲) مقارنۃ الادیان(۱۳) مناھج المفسرین (۱۴) علم الرجال (۱۵)الفقہ (۱٦)حاضر العالم الاسلامی (۱۷)اللغۃ الاوروبیۃ(۱۸)حفظ القرآن الکریم۔

چوتھے سال شعبۂ دعوہ وثقافہ اسلامیہ کے مواد:

(۱)الخطابۃ(۲) التیارات الفکریۃ(۳) تاریخ الدعوۃ(۴) اللغۃ العربیۃ(۵) الثقافۃ الاسلامیۃ (٦) الاستشراق والتبشیر (۷)الحدیث الموضوعی(۸)التفسیر الموضوعی(۹) مناھج الدعوۃ(۱۰)الدعوۃ فی العصر الحدیث (۱۱) اصول الفقہ (۱۲) اللغۃ الاوروبیۃ(۱۳) القرآن الکریم حفظ تحریری وشفوی(۱۴) الفلسفۃ الاسلامیۃ(۱۵) الفقہ (۱٦) التخریج (۱۷) الدخیل فی التفسیر (۱۸) مناھج البحث العلمی(۱۹) مقارنۃ الادیان۔

دراسات علیا کا نصاب

دراسات علیا: (ایم اے، وپی ایچ ڈی): ایم اے وپی ایچ ڈی کے ابتدائی دو سال میں تقریبا کلیہ کے تخصص والے ہی مواد ہوتے ہیں البتہ بحثیں مختلف ہوتی ہیں، اس میں مطالعہ، بحث اور مصادر ومراجع کی طرف کثرت سے رجوع اور محنت ومشقت کلیہ سے بہت زیادہ مطلوب ہوتی ہے، ایم اے کا دو سال پاس کرنے کے بعد ایم اے کا مقالہ کسی خاص موضوع پر لکھنا ہوتا ہے، اس کی مدت کم از کم دو سال ہوتی ہے جسے ''رسالۃ التخصص الماجستیر'' کہتے ہیں، پاک وہند میں اسے ایم فل کا درجہ دیا جاتا ہے، اس کے بعد پی ایچ ڈی کا مقالہ ''رسالۃ العالمیۃ الدکتوراۃ'' لکھنا ہوتا ہے جس کی مدت کم از کم تین

سال ہوتی ہے، تقریبا تمام کلیات کے دراسات علیا کا یہی طریقئہ کار ہوتا ہے۔

دراسات علیا (ایم اے، وپی ایچ ڈی) شعبہ علوم حدیث کے پہلے سال کے مضامین:

(۱) تفسیر (۲) علل الحدیث (۳) مصطلح الحدیث (۴) حدیث تحلیلی (۵) حدیث موضوعی (۶) مناھج بحث (۷) الجرح والتعدیل (۸) تخریج (۹) لغۃ انجلیزیۃ (۱۰) حفظ قرآن کریم۔

دوسرے سال کے مضامین: (۱) رجال الحدیث (۲) حدیث تحلیلی (۳) دفاع عن السنۃ (۴) تفسیر تحلیلی (۵) حدیث موضوعی (۶) تحقیق تراث (۷) تخریج و دراسۃ الاسانید (۸) مصطلح الحدیث (۹) لغۃ انجلیزیۃ (۱۰) حفظ قرآن کریم۔

ان دو سالوں کے بعد کم سے کم دو سال کے اندر کسی موضوع پر رسالہ لکھنا ہوگا، اس کے بعد پی ایچ ڈی میں تین سال کے اندر کسی موضوع پر رسالہ لکھنا ہوگا۔

کلیہ لغہ عربیہ (بی اے):

(بی اے) کلیہ لغہ عربیہ شعبہ عامہ کے مضامین:

پہلے سال کے مضامین: (۱) القرآن الکریم (۲) النحو (۳) علم اللغۃ (۴) قاعۃ البحث (۵) البلاغۃ (۶) علم الاصوات والتجوید (۷) تاریخ الادب العربی (۸) النصوص الادبیۃ (۹) التفسیر (۱۰) العروض والقوافی (۱۱) الصرف (۱۲) اللغۃ الاوروبیۃ (۱۳) فن کتابۃ المقال (۱۴) عبادات (الفقہ)۔

دوسرے سال کے مضامین: (۱) القرآن الکریم (۲) النحو (۳) قاعۃ البحث (۴) البلاغۃ (۵) المعاجم اللغویۃ (۶) الصرف (۷) تاریخ الادب العربی (۸) النصوص الادبیۃ (۹) اوزان الشعر وموسیقاہ (۱۰) تاریخ العالم الاسلامی (۱۱) التفسیر (۱۲) معاملات (الفقہ) (۱۳) اللغۃ الاوروبیۃ۔

تیسرے سال کے مضامین: (۱) القرآن الکریم (۲) النحو (۳) قاعۃ البحث (۴) البلاغۃ (۵) الصرف (۶) تاریخ الادب العربی (۷) النصوص الادبیۃ (۸) الادب المقارن (۹) النقد الادبی (۱۰) اللھجات والقراءات (۱۱) تاریخ الادب الاندلسی ونصوصہ (۱۲) اسرۃ ومیراث (الفقہ) (۱۳) الحدیث (۱۴) اللغۃ

الاوروبیۃ۔

چوتھے سال کے مضامین: (۱) القرآن الکریم (۲) النحو (۳) قاعۃ البحث (۴) البلاغۃ (۵) فقہ اللغۃ (۶) تاریخ الادب العربی (۷) النصوص الادبیۃ (۸) الصرف (۹) النقد الادبی (۱۰) الادب الاسلامی (۱۱) الحدیث الشریف (۱۲) اصول الفقہ (۱۳) اللغۃ الاوروبیۃ (۱۴) علم الدلالۃ (۱۵) کتب الصرف والنحو والبلاغۃ والادب، کا تعارف شامل ہے۔

عربی زبان وادب میں مہارت اور تخصص کیلئے بنیادی طور پر نحو صرف بلاغت اور پھر انشاء پر عبور ضروری ہے، مذکورہ مضامین جب اچھی طرح سے پڑھے جائیں تو یہ سب مسئلہ حل ہو جائے گا، عربی زبان بولنے میں مہارت حاصل کرنے کے لئے، محادثہ اور گفتگو کا ماحول ہونا ضروری ہے، مصر میں بہت سارے سینٹر ہیں اگر اس میں داخلہ لے لیا جائے تو عربی زبان بولنے میں یہ سینٹر کافی معاون ثابت ہونگے۔

کلیہ دراسات اسلامیہ (بی اے):

(بی اے) کلیہ دراسات اسلامیہ عربیہ کے مضامین:

پہلے سال کے مضامین: (۱) القرآن الکریم (۲) التفسیر وعلوم القرآن (۳) توحید (۴) فقہ مذہبی (العبادات) (۵) نحو وصرف (۶) اصول الفقہ (۶) بلاغۃ (۷) العروض والقافیۃ (۸) التجوید (۹) تاریخ التشریع (۱۰) الادب الجاھلی والاسلامی والنقد (۱۱) اللغۃ الاجنبیۃ (۱۲) مختارات الحدیث (۱۳) علوم الحدیث (۱۴) تاریخ الدولۃ الامویۃ والحضارۃ الاسلامیۃ۔

دوسرے سال کے مضامین: (۱) القرآن الکریم (۲) التفسیر (۳) التوحید (۴) فقہ مذھبی (الحدود) (۵) اصول الفقہ (۶) نحو وصرف (۷) البلاغۃ (۸) المنطق (۹) تاریخ الدولۃ العباسیۃ (۱۰) المعاجم والھجات العربیۃ (۱۱) الادب والنقد (۱۲) الحدیث الشریف (۱۳) اللغۃ الاجنبیۃ۔

تیسرے سال کے مضامین: (۱) القرآن الکریم (۲) التفسیر (۳) توحید (۴) اصول الفقہ (۵) فقہ مذھبی

(المعاملات)(٦) النحو والصرف(٧) البلاغة(٨) دراسات عربیۃ فی النصوص (٩) التیارات الفکریۃ(٨)الفلسفۃ والتصوف (٩) فقہ اللغۃ والاصوات (١٠) التربیۃ وعلم النفس (١١) اللغۃ الاجنبیۃ (١٢) قاعۃ البحث (١٣) الحدیث الشریف (١٤) الادب والنقد (١٥) قاعۃ البحث فی اصول الفقہ والفقہ والتفسیر۔

چوتھے سال کے مضامین: (١) القرآن الکریم (٢) توحید (٣) التفسیر (٤) اصول الفقہ (٥) الفقہ المقارن (٦) النحو و الصرف (٧) البلاغۃ (٨) دراسات عربیۃ فی نصوص (٩) تیارات فکریۃ (١٠) الحدیث الشریف (١١) احوال شخصیۃ (١٢) ادب حدیث ونقد (١٣) قاعۃ البحث فی دراسات عربیۃ (١٤) مناھج وطرق التدریس۔

کلیہ دعوہ اسلامیہ (بی اے): (اصول الدین کی فرع کے علاوہ یہ ایک بذات خود مستقل کلیہ بھی ہے)

(بی اے) کلیہ دعوہ اسلامیہ کے مضامین:

پہلے سال کے مضامین: (١) الملل والنحل (٢) الفرق الاسلامیۃ (٣) الثقافۃ الاسلامیۃ (٤) التصوف (٥) السیرۃ النبویۃ (٦) التفسیر (سورۃ النور) (٧) علوم القرآن (٨) الحدیث الشریف (٩) علوم الحدیث (١٠) النشاط الثقافی (١١) اللغۃ العربیۃ (١٢) مناھج الدعوۃ (١٣) انگلش یا فرنچ (١٤) علم النفس (١٥) خطابۃ (١٦) قرآن (حفظ) (١٧) تجوید (١٨) العقیدۃ (١٩) اصول الدعوۃ (٢٠) رکائز الدعوۃ (٢١) الفقہ۔

دوسرے سال کے مضامین: (١) الملل والنحل (٢) الدعوۃ (٣) النظم الاسلامیۃ (٤) خطابۃ (٥) الحدیث الشریف (٦) علوم الحدیث (٧) التفسیر (سورۃ لقمان) (٨) علوم التفسیر (٩) النشاط الثقافی (١٠) اللغۃ العربیۃ (١١) مناھج الدعوۃ (١٢) حیاۃ الصحابۃ (١٣) العقیدۃ (١٤) التصوف (١٥) الفرق الاسلامیۃ (١٦) انگریزی /فرنچ (١٧) قرآن کریم (حفظ) (١٨) التجوید (١٩) وسائل الدعو ۃ (٢٠) الفقہ۔

تیسرے سال کے مضامین: (١) حضارۃ الدین (٢) الخطابۃ (٣) التفسیر (سورۃ المائدۃ) (٤) علوم التفسیر

(۵)الفقہ (۶) انگریزی/فرینچ (۷) اللغۃ العربیۃ (۸) النشاط الثقافی (۹) مناھج البحث العلمی (۱۰) تاریخ الدعوۃ (۱۱) الحدیث الشریف (۱۲) الملل والنحل (۱۳) الاستشراق والتبشیر (۱۴) تیارات اسلامیۃ فکریۃ (۱۵) قرآن کریم (حفظ) (۱۶) التجوید (۱۷) علوم الحدیث (۱۸) النظم الاسلامیۃ۔

چوتھے سال کے مضامین: (۱) النظم السیاسی (۲) النظم المالی (۳) الدعوۃ (۴) الملل والنحل (۵) انگریزی تکلم (۶) الحدیث الشریف (۷) علوم الحدیث (۸) اصول الفقہ (۹) اللغۃ العربیۃ (۱۰) تیارات اسلامیۃ (۱۱) الملل والنحل (۱۲) اخلاق اسلامیۃ (۱۳) التفسیر (۱۴) علوم التفسیر (۱۵) حاضر العالم الاسلامی (۱۶) اللغۃ الاوروبیۃ (۱۷) قرآن کریم (حفظ) (۱۸) تجوید (۱۹) اعجاز العلمی فی القرآن الکریم۔

دراسات صوفیا کا معہد عالی اور علم تراث:

اس میں بھی کلیہ (بی اے) چار سال کا ہوتا ہے پھر ''دراست علیا'' میں تصوف کے حوالے سے ڈپلومہ کرایا جاتا ہے۔

دراسات صوفیا کے بعض اہم مضامین:

(۱) الفقہ الصوفی للتفسیر وعلوم القرآن (۲) الفقہ الصوفی للحدیث وعلومہ (۳) الفقہ الصوفی للعقیدۃ (۴) اصول الفقہ الصوفی للاحکام (۵) الفقہ الصوفی للاحکام (۶) قواعد التصوف واصولہ (۷) مصطلحات التصوف (۷) قضایا التصوف واشکالاتہ (۸) الفقہ الصوفی للغۃ العربیۃ وآدابھا (۹) السلوک الصوفی (۱۰) اللغۃ الاجنبیۃ (۱۱) الادب الاسلامی (۱۲) التاریخ الاسلامی (۱۳) مدخل التصوف (۱۴) تیارات فکریۃ معاصرۃ (۱۵) التربیۃ وعلم النفس (۱۶) العقیدۃ۔

کلیہ شریعہ اسلامیہ (بی اے):

کلیہ شریعہ اسلامیہ (بی اے) کے مضامین:

پہلے سال کے مضامین: (۱) الفقہ (۲) علوم الحدیث (۳) تاریخ التشریع الاسلامی (۴) اللغۃ العربیۃ (۵)

اللغۃ الاجنبیۃ(٦) تفسیر آیات الاحکام(٧)الفقہ المقارن(٨)اصول الفقہ(٩)التوحید(١٠)حفظ القرآن الکریم(١١)قضایا فقھیۃ معاصرۃ(جدید فقھی مسائل)(١٢) قاعۃ البحث۔

دوسرے سال کے مضامین: (١) الفقہ المقارن (٢) اصول الفقہ (٣) التوحید (٤) اللغۃ العربیۃ (٥) تفسیر آیات الاحکام(٦) لغۃ اجنبیۃ (٧) الحدیث الشریف (٨) الفقہ (٩) قضایا فقھیۃ معاصرۃ (جدید فقھی مسائل)(١٠)احوال شخصیۃ(١١)حفظ القرآن الکریم(١٢) قاعۃ البحث۔

تیسرے سال کے مضامین: (١)الفقہ (٢) منہج الدعوۃ(٣)الفقہ المقارن(٤)احوال شخصیۃ(٥) تفسیر آیات الاحکام (٦)لغۃ اجنبیۃ(٧)الحدیث الشریف(٨)اصول الفقہ(٩)اللغۃ العربیۃ(١٠) قضایا فقھیۃ معاصرۃ(جدید فقھی مسائل)(١١)حفظ القرآن الکریم(١٢) قاعۃ البحث۔

چوتھے سال کے مضامین: (١)التفسیر (٢) قواعد الفقہ (٣)اللغۃ العربیۃ(٤)لغۃ اجنبیۃ(٥)الفقہ (٦) احادیث احکام (٧) الفقہ المقارن(٨) اصول الفقہ (٩)حفظ القرآن الکریم(١٠) قضایا فقھیۃ معاصرۃ (جدید فقھی مسائل)(١١)البحث۔

دراسات علیا(ایم اے)فقہ مقارن کے بعض اہم مضامین: (١)القرآن الکریم،(٢)النظریات العامۃ فی المعاملات فی الفقہ الاسلامی(٣)فقہ الکتاب والسنۃ (البیوع)(٤)،الفقہ الاسلامی المقارن بالقانون الوضعی فی الشرکات(٥)نظام الاسرۃ(٦) اصول الفقہ (اثر القواعد الاصولیۃ)(٧)الفقہ الاسلامی المقارن بالقانون الوضعی فی المعاملات (الاجارۃ)(٨)فقہ الکتاب والسنۃ (عقود الولایات)(٩)الفقہ الاسلامی المقارن بالقانون الوضعی فی عقود التوثیقات(١٠)دراسۃ احد المجتھدین (١١)ضوابط الاجتھاد (١٢)اللغۃ الاجنبیۃ۔

دراسات علیا(ایم اے)اصول فقہ کے بعض اہم مضامین:

(١)اثر القواعد الاصولیہ (الحکم الشرعی وانواعہ،الامر والنھی،البطلان والفساد،التکلیف) کتاب التمھید فی تخریج الفروع علی الاصول للاسنوی الشافعی اور مفتاح الوصول الی بناء الفروع علی الاصول للتلمسانی المالکی،(٢)تاریخ علم اصول الفقہ ، منہج الائمۃ الاربعۃ فی الاستنباط ،(٣)مقاصد الشریعۃ (الموافقات

للشاطبیؔ، الفروق للقرافی، مقاصد الشریعۃ لطاھر بن عاشور (۴) اصول الفقہ المقارن (الحنفی) التوضیح علی التنقیح، فواتح الرحموت شرح مسلم۔

دارالافتاء میں مفتی کورس کے بعض اہم مضامین:

(۱) مناھج بحث (۲) القضایا الفقھیۃ المعاصرۃ، قضایا طبیۃ، قضایا مالیۃ، قضایا اجتماعیۃ (۳) اللغۃ العربیۃ، صرف نحو بلاغت (۴) الاحوال الشخصیۃ نکاح، طلاق (۵) المیراث (۶) قراءۃ النصوص، الفقہ المقارن (۷) فقہ الکتاب، تفسیر آیات الاحکام (۸) فقہ الحدیث، احادیث الاحکام (۹) اصول الفقہ (۱۰) مھارات الافتاء، قواعد رسم المفتی (۱۱) الوصیۃ (۱۲) اعداد البحوث والفتاوی الفقھیہ (۱۳) جلوس مع المفتی، تدریب عملی (۱۴) علم النفس (۱۵) کتب الفتوی والفقہ واصول کا تعارف، ہر مذھب میں مفتی بہ قول کا بیان اور اس کے لینے کا طریقہ (۱۶) تدریبات لتقویم الاسلوب (۱۷) مقاصد الشریعۃ الاسلامیۃ (۱۸) مطالعۃ دواوین وکتب الفتاوی (۱۹) علم الاجتماع (۲۰) الشفوی اور آخری سال میں ایک تحقیقی مقالہ۔ مذکورہ مواد اور مضامین کے حوالے سے کافی تعداد میں کتابیں لائبریریوں میں ملتی ہیں۔

شعبہ تجوید وقراءت:

شبرا مصر کے معھد القراءات میں دو سال عام تجوید کے بارے میں کتابیں پڑھائی جاتی ہیں، پھر تین سال عالیہ اور تین سال کے تخصص کا مرحلہ طے کرنا ہوتا ہے، اس طرح یہ آٹھ سال کا تجوید وقراءت کا کورس ہے، اس کے علاوہ کلیۃ القرآن الکریم طنطا میں (بی اے) چار سال، دراسات علیا (ایم اے) چار سال اور (پی ایچ ڈی) یعنی ڈاکٹریٹ تین سال کروایا جاتا ہے۔

تیونس اور مصر کے مذہبی ادارے اور تعلیم: ایک تقابلی جائزہ

شفیق منصور

تیونس اور مصر، مسلم دنیا کے ایسے دو ممالک ہیں جہاں قدیم ترین مذہبی علوم کے ادارے قائم ہیں۔ تیونس میں جامعہ زیتونہ اور مصر میں جامعة الازہر تابناک مثالیں ہیں۔یوں ان اداروں کی وجہ سے دونوں ممالک میں دینی تعلیم کا فروغ تاریخی تناظر میں ہمیشہ نظر آیا ہے جس سے باقی مسلم دنیا نے بھی استفادہ کیا۔ اس مماثلت کی وجہ سے یہ تأثر سامنے آتا ہے کہ دونوں ممالک کا موجودہ مذہبی نظام تعلیم اور نصاب بھی ملتا جلتا ہوگا اور شہری حقوق و اقلیتوں کے حوالے سے بھی چیزیں ایک جیسی ہوں گی۔ اس مضمون میں دونوں ممالک کی مذہبی تعلیم کا ایک عمومی جائزہ لیا گیا ہے۔ مضمون نگار مجلہ تحقیقات کے مدیر ہیں۔

تیونس میں مذہبی تعلیم

تیونس، شمالی افریقہ میں واقع مسلم اکثریتی ملک ہے۔ یہ اسلامی روایات سے جڑا ہوا ایک بھرپور ثقافتی اور تاریخی ورثہ رکھتا ہے۔ ملک میں مذہبی تعلیم کی فراہمی کے لیے مختلف اسکول اور ادارے قائم ہیں۔ذیل میں اس پہلو کا ایک جامع تجزیہ پیش کیا جاتا ہے۔

تاریخی پس منظر

تیونس میں مذہبی تعلیم کے موجودہ منظر نامے کو سمجھنے کے لیے، اس کے تاریخی ارتقاء کو سمجھنا بہت ضروری ہے۔ اسلامی فکر و تعلیم کے حوالے سے اس کی ایک طویل تاریخ ہے، اور مختلف ادوار میں دینی مدارس بھی قائم ہوتے رہے ہیں۔ عثمانی دور حکومت میں تیونس میں اسلامی تعلیم کو بہت زیادہ فروغ ملا۔ مدارس اور روایتی اسلامی اداروں نے دینیات، فقہ اور عربی زبان جیسے شعبوں میں علم کی فراہمی میں مرکزی کردار ادا کیا۔ تاہم، نوآبادیاتی نظام کی آمد کے ساتھ ہی تعلیمی نظام میں نمایاں تبدیلیاں رونما ہوئیں، اور فرانسیسی استعماری عہد (1881-1956) کے دوران تعلیمی میدان میں

سیکولرائزیشن کی بھی کچھ کوششیں کی گئیں۔

جدید تعلیمی صورتحال

آزادی کے بعد تیونس میں سیکولر تعلیم اور اسلامی اقدار کے تحفظ کے درمیان توازن قائم کرنے کی کوششیں کی گئیں۔یوں تعلیمی نظام میں اصلاحات کی گئیں، اور مذہبی تعلیم کو مزید پنپنے کے دوبارہ مواقع میسر آئے۔آج، تیونس کے تعلیمی منظر نامے میں سیکولراور مذہبی دونوں اجزاء شامل ہیں۔

دینی مدارس

مدارس تیونس کے مذہبی تعلیمی نظام کا ایک لازمی حصہ ہیں۔ یہ مکاتب، جو اکثر مساجد سے منسلک ہوتے ہیں، مذہبی تعلیم کی روایتی شکل فراہم کرتے ہیں۔ مدارس میں طلباء قرآن، حدیث،اسلامی فقہ اور دیگر اسلامی علوم حاصل کرتے ہیں۔اس کا مقصد اسلامی تعلیمات سے باخبر افراد پیدا کرنا ہے۔یہ ادارے عام طور پر پرائمری سطح کی تعلیم فراہم کرتے ہیں اور مذہبی تعلیم کے بنیادی مراکز کے طور پر کام کرتے ہیں۔ نصاب کا ہدف نہ صرف مذہبی علوم کی تدریس ہے، بلکہ اس کے ساتھ سماجی اخلاقی اقدار کو فروغ دینا بھی ہے۔

زاویہ

Zaouias، یا صوفی زاویے، تیونس کے مذہبی تعلیم کے منظر نامے کا ایک اور اہم پہلو ہیں۔ صوفیانہ اعتقادی نظام کی جڑیں تیونس میں کافی گہری ہیں۔ 'زاویہ' نام کے ادارے روحانی ترقی کے مراکز کے طور پر کام کرتے ہیں، اور ان میں متنوع تعلیمی اجزاء شامل ہوتے ہیں۔ صوفی رہنما، جنہیں شیخ کہا جاتا ہے، وہ ان اداروں میں روحانی اور فکری دونوں معاملات میں شاگردوں کی رہنمائی کرتے ہیں۔ روایتی معنوں میں باضابطہ تعلیمی ادارے نہ ہونے کے باوجود، زاویہ ادارے اسلامی اقدار، روحانی نظم وضبط اور اللہ تعالی کے ساتھ تعلق پر زور دے کر، ایک طرح سے مذہبی تعلیم میں ہی حصہ ڈالتے ہیں۔

مرکزی دھارے کی تعلیم میں مذہبی علوم

تیونس کے مرکزی دھارے کے تعلیمی نظام میں بھی نصاب کے اندر مذہبی علوم شامل ہیں۔ معیاری اور معتدل مواد کو یقینی بنانے کے لیے وزارت تعلیم اس مواد کی نگرانی کرتی ہے۔ طلباء اسلامی تاریخ، اخلاقیات اور روحانی اقدار کے بارے میں سیکھتے ہیں۔ اس کا مقصد نوجوانوں میں اسلام کی ایک جامع تفہیم فراہم کرنا ہے۔ مرکزی دھارے کی تعلیم میں مذہبی علوم کی شمولیت تیونس کی اسلامی شناخت کو برقرار رکھنے کے عزم کی عکاسی کرتی ہے۔

حکومتی ضابطے اور پالیسیاں

تیونس کی حکومت اسلامی اقدار اور قومی شناخت کے درمیان توازن برقرار رکھنے کے لیے مذہبی تعلیم کے نصاب کی نگرانی کرتی ہے۔ اس بات کو یقینی بنانے کے لیے ہدایات موجود ہیں کہ مذہبی ادارے تعلیمی معیارات پر عمل پیرا ہوں اور اسلام کی معتدل تشریح کو فروغ دیں۔ حکومتی حکام مذہبی علماء اور اداروں کے ساتھ مل کر نصاب تیار کرتے ہیں جو ملک کی ثقافتی اور مذہبی اخلاقیات کے مطابق ہو۔ اس کا مقصد انتہا پسند نظریات کے فروغ کو روکنا اور مذہبی ہم آہنگی کے لیے سازگار ماحول کو فروغ دینا ہے۔

تیونس میں مذہبی مدارس اور ادارے دلیل ہیں کہ ملک میں عوامی سطح پر ان کی مقبولیت اور ضرورت موجود ہے۔ روایتی مدارس سے لے کر صوفی زاویہ اور مرکزی دھارے کے تعلیمی اداروں تک، ہر ایک شعبہ ملک میں مذہبی تعلیم کے کثیر جہتی ڈھانچے میں اپنا حصہ ڈالتا ہے۔ جدیدیت کو اپنانے کے باوجود، اپنے اسلامی ورثے کے تحفظ کے لیے مذہبی علوم کو مرکزی دھارے کی تعلیم میں ضم کرنے کی کوششیں ڈھکی چھپی نہیں ہیں۔ اس کا مطلب ہے کہ ریاست سیکولر اور مذہبی عناصر کے درمیان توازن قائم کرتے ہوئے، ایک ایسے معاشرے کی تشکیل کرنا چاہتی ہے جو تعلیم اور روحانی روایات دونوں کو اہمیت دیتا ہے۔ جیسے جیسے ملک ترقی کرتا جا رہا ہے، مذہبی تعلیم کا کردار تیونس کی ثقافتی اور تعلیمی شناخت کا ایک متحرک اور اٹوٹ حصہ بن رہا ہے۔

مصر میں مذہبی تعلیم

مصر، ایک شاندار تاریخ اور ممتاز اسلامی ورثے کا حامل ملک ہے، جو تعلیمی حوالے سے بھی متنوع جہات رکھتا ہے۔اس میں مذہبی تعلیم کے لیے کئی نامی گرامی ادارے شامل ہیں۔ روایتی اسلامی مدارس سے لے کر جدید تعلیمی نظام تک، مصر جس قدر تنوع رکھتا ہے ایسی مثال کسی بھی مسلم ملک میں نہیں ملتی۔ یہ وہ ملک ہے کہ جہاں پچھلے ایک سو سال میں مذہبی فکری تناظر میں جتنے مکاتب، نقطہ ہائے نظر اور حلقے سامنے آئے وہ صرف اسی کا خاصہ ہے۔اس کا واضح مطلب یہ ہے کہ مصر میں مذہبی علوم کے لیے بڑی وسیع جگہ رہی ہے اور ریاست و عوام دونوں نے اس لحاظ سے بہت دلچسپی کا مظاہرہ کیا ہے۔ یہ ملک صدیوں سے اسلامی علوم و مباحث کا بہت بڑا مرکز رہا ہے، جس میں کئی معروف ادارے بھی قائم ہیں۔

جامعہ الازہر

10ویں صدی میں قاہرہ میں قائم کی گئی الازہر یونیورسٹی دنیا کے سب سے قدیم مسلسل چلنے والے تعلیمی اداروں میں سے ایک ہے اور اسلامی تعلیم کے لیے مصر کی دلچسپی کو ظاہر کرتی ہے۔ جامعہ الازہر مصر میں دینی تعلیم کا سب سے بڑا اور نمایاں مرکز ہے۔ یہ اصل میں قرآنی علوم کے ایک مرکز کے طور پر قائم کیا گیا تھا۔اس میں صدیوں سے مختلف مذہبی شعبہ جات، بشمول الہیات، فقہ اور عربی زبان شامل رہے ہیں۔ یہ اسلامی دنیا کے علماء اور طلباء کے لیے ایک مرکز کے طور پر کام کرتا ہے۔الازہر کا کردار روایتی تعلیم سے بالاتر ہے۔ یہ عظیم تاریخی ادارہ اہم فتاوی جاری کرنے اور پوری دنیا کے سنی مسلم سماج کی رہنمائی میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔اس ادارے کے اثرات عالمی نوعیت کے ہیں،اسی لیے دنیا میں کسی بھی بڑے اور اہم مسئلے کے لیے ازہر کی رائے کو کافی حیثیت دی جاتی ہے۔

الازہر سکولز

مرکزی جامعہ کے علاوہ، الازہر مختلف تعلیمی پراجیکٹس کی بھی نگرانی کرتا ہے،اور اسکولوں کے نیٹ

ورک کی نگرانی کرتا ہے۔ الازہر کے اسکول جدید معیاری تعلیم کے ساتھ ساتھ مذہبی تعلیم بھی فراہم کرتے ہیں۔ اس میں ایک جامع تعلیمی فریم ورک تشکیل دیا گیا ہے، جو سیکولر اور مذہبی علوم کو یکجا کرتا ہے۔ یہ اسکول طلباء کی مذہبی اور اخلاقی تہذیب میں اپنا حصہ ڈالتے ہیں اور اس بات کو یقینی بناتے ہیں کہ وہ اپنی اسلامی شناخت کو باقی رکھتے ہوئے، جدید تعلیم حاصل کریں۔

روایتی مدارس

الازہر کے علاوہ، مصر میں بہت سے روایتی مدارس ہیں جو اسلامی تعلیم کے کلاسیکی ماڈل کی پیروی کرتے ہیں۔ ان اداروں میں قرآن، حدیث، اسلامی فقہ اور عربی زبان کی تعلیم پر توجہ دی جاتی ہے۔ ان میں سے بہت سے مدارس مساجد کے اندر کام کرتے ہیں اور مقامی کمیونٹیز کا ایک لازمی حصہ ہی۔ یہ ادارے اسلامی علوم کے تحفظ میں اپنا حصہ ڈالتے ہیں۔

جدید تعلیمی اداروں میں مذہبی عنصر

مصر کے جدید تعلیمی نظام کے نصاب میں بھی مذہبی علوم بھی شامل ہیں۔ سرکاری اور نجی اسکولوں میں طلباء اسلامی تاریخ، اخلاقیات اور اقدار کے بارے میں سیکھتے ہیں، جو ان کے ثقافتی اور مذہبی ورثے کے بارے میں ان کی مجموعی تفہیم کو بہتر بناتے ہیں۔

وزارتِ اوقاف

مصر میں وزارت اوقاف (مذہبی اوقاف) مذہبی تعلیم کی نگرانی کرنے میں ایک اہم کردار ادا کرتی ہے۔ یہ اوقاف مساجد کو منظم کرتا ہے، اور تعلیمی اداروں کے ساتھ تعاون کرتا ہے تاکہ ان میں مذہبی علوم اقدار کی مناسب ترسیل کو یقینی بنایا جاسکے۔ وزارت اوقاف مصر کے اندر جدید تعلیمی اداروں کے نصاب کی تشکیل و نگرانی میں بھی کردار ادا کرتی ہے۔

روایت اور جدیدیت کا توازن

مصر میں اب جدیدیت کی طرف رجحان بڑھ رہا ہے۔ مگر اس کے باوجود یہ بھی ظاہر ہے کہ وہاں کے مذہبی ادارے اپنی گہری ساکھ اور جڑیں رکھتے ہیں۔ حکومت اگرچہ کئی حوالوں سے انتہاپسندی کے سدباب کے نام پر ایسے اقدامات کر رہی ہے جو سیکولر نوعیت کے ہیں، لیکن یہ رجحان زیادہ تر حکومتی سطح پر ہی ہے، عوام میں اب بھی مذہبی اداروں کی ساکھ ویسی ہی مضبوط ہے۔اس چیز کا ادراک خود حکومت کو بھی ہے اور وہ ان دینی اداروں کی اہمیت کو سمجھتی بھی ہے۔اسی لیے جدیدیت کی طرف رجحان کے باوجود وہ ان دینی اداروں کے ساتھ تعلقات خراب کرنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتی۔ حکومت کی کوششیں زیادہ تر بعض مذہبی جماعتوں کے رسوخ کو کم کرنے پر مرکوز ہیں۔روایتی مذہبی ادارے اب بھی مضبوط ہیں۔ بہرحال، مجموعی لحاظ سے مذہبی تعلیم کے حوالے سے، جامعہ الازہر جیسے تاریخی مرکز سے لے کر روایتی مدارس اور جدید تعلیمی اداروں تک، مصر کا منظرنامہ متنوع اور کثیر جہتی ہے۔

مصر اور تیونس کے مذہبی نصاب کا تقابل

اگر مذہبی تعلیم کے حوالے سے تیونس اور مصر کے مابین موازنہ کیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ ،ادارہ جاتی سطح پر انفرادی حیثیت میں الگ الگ امتیازی خصائص اگرچہ موجود ہیں، لیکن اگر مجموعی تناظر میں دونوں ملکوں کی مذہبی تعلیم کا تجزیہ کیا جائے تو واضح ہوتا ہے کہ تیونس کی مذہبی تعلیم کا ڈھانچہ دینی و شہری اقدار کی تدریس میں مصر سے زیادہ ذمہ دارانہ ہے اور یہ کہ حکومت کا کنڑول تیونس کے مذہبی منظرنامے پر مصری حکومت سے زیادہ ہے۔ تیونس کی مذہبی تعلیم کا ڈھانچہ شہری اقدار، سماجی مساوات، باہمی احترام، رواداری اور عالمی انسانی اقدار کو بھی بہتر انداز میں ملحوظ رکھتا ہے اور ان کی رعایت رکھتا ہے۔ خصوصا تیونس کے جدید تعلیمی اداروں میں جو مذہبی تعلیم کا نصاب پڑھایا جاتا ہے وہ کافی معتدل ہے۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ مذہبی نصاب میں رواداری کے عنصر کو سابق تیونسی حکمران زین العابدین علی

کے آمرانہ دور صدارت میں فروغ دیا گیا۔ان سماجی اصطلاحات کو باقاعدہ منظم انداز میں تعلیمی نصاب میں جگہ جگہ شامل کیا گیا تھا تاکہ نوجوانوں کو ان سے متعارف کرایا جائے۔ زین العابدین علی نے 1989 میں محمد الشرفی کو ملک کا وزیر تعلیم مقرر کیا تھا، جو ایک قابل وکیل، انسانی حقوق کے سرگرم کارکن، اور خود صدر کے ناقد بھی تھے۔ محمد الشرفی نے ملک کے تعلیمی ڈھانچے میں بہت سی اصلاحات متعارف کرائیں۔ان کے دور میں اسکول کی تمام نصابی کتب کی جانچ پڑتال کی گئی۔اس کا مقصد ایسے سارے مواد کو حذف کرنا تھا جو مختلف مذاہب اور گروہوں میں عدم برداشت کو فروغ دینے کا سبب بن سکتا تھا، اور مذہبی تعلیم میں مسلم فکر کے لبرل پہلوؤں کو شامل کرنا بھی تھا۔اسی طرح انہوں نے تعلیمی نصاب سے مغرب دشمنی کو بھی حذف کر دیا۔ سائنس کے نصاب میں، مثال کے طور پر، بگ بینگ تھیوری اور ڈارون نظریہ ارتقاء کو بھی شامل کیا گیا۔ان اصلاحات کو البتہ ملک کی اسلامی سیاسی جماعت النہضہ نے مسترد کر دیا تھا۔

تیونس کی 98 فیصد آبادی سنی مسلم ہے، جبکہ یہودی اور مسیحی کل آبادی کا 2 فیصد سے بھی کم ہیں۔ سرکاری اسکولوں میں پڑھایا جانے والا واحد مذہب اسلام ہے۔ مگر اس کے ساتھ سرکاری ثانوی اسکولوں میں سماجی علوم کے حصے کے طور پر، یہودیت، مسیحیت کی تاریخ بھی پڑھائی جاتی ہے۔

سرکاری پرائمری اسکولوں میں، اسلامی تعلیم کے ضمن میں تیونس کی نصابی کتابوں میں اسلام کے اخلاقی اور اخلاقی پہلوؤں اور اس کے بنیادی ستونوں کے ساتھ ساتھ مخصوص مذہبی رسومات، نماز اور روزہ کی تربیت کو نمایاں کیا جاتا ہے۔ مسیحی اور یہودیوں کے ساتھ مذہبی رواداری قائم رکھنے کو بھی اسلامی قدر کے طور پر اجاگر کیا گیا ہے۔دوسرے عرب ممالک کے برعکس، تیونس کے نصاب میں شامل کتب کفار کے ساتھ دشمنی کو غلط قرار دیتی ہیں اور انسانی یکجہتی و ہم آہنگی پر زور دیتی ہیں۔ مثال کے طور پہ اسکولوں میں زیر تدریس ایک دینی کتاب میں یہ واقعہ بھی شامل ہے کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ایک مرتبہ مدینہ میں ایک یہودی کے جنازے کے احترام میں کھڑے ہوئے تھے۔ جب آپ ﷺ سے کہا گیا کہ یہ تو ایک یہودی کا جنازہ ہے، تو آپ ﷺ نے جواب میں فرمایا تھا کہ کیا وہ انسان نہیں ہے، جب بھی تم جنازے کا جلوس دیکھو تو کھڑے ہو جاؤ۔

اسی طرح تیونس کے اسکولوں کے مذہبی تعلیم کے سارے نصاب میں تقریبا 36 ابواب شامل ہیں، اور مذہبی رواداری کے فروغ کے لیے قرآن کی بہت سی آیات بھی حصہ بنائی گئی ہیں۔اس نصاب میں بتایا گیا ہے کہ مذاہب کے الگ ہونے کے باوجود تمام مذاہب کے ماننے والے حقوق کے اعتبار سے مساوی ہیں۔اسلام امن کا درس دیتا ہے اور جارحیت و جنگ کی تمام شکلوں کی حوصلہ شکنی کرتا ہے۔مزید یہ کہ، جہاد کی روحانی تعبیر کو بھی نمایاں کی گیا جو کہ نفس کے خلاف جہاد ہے۔اس کے علاوہ جمہوری اقدار اور عالمی انسانی ثقافت پر بھی کچھ مواد کتب کا حصہ ہے۔

تیونس میں پرائمری اور مڈل اسکولوں کے لیے مختص کیے گئے مذہبی نصاب میں دین کو ایک ذاتی معاملے کے طور پہ پیش کیا گیا ہے، کہ اس میں معاشرے کے کسی طبقے یا ریاست کو کوئی اتھارٹی حاصل نہیں ہے۔

سیکنڈری سطح پر، سرکاری اسکولوں میں اسلامی تعلیم کے کورس کو "اسلامی فکر" کا عنوان دیا گیا ہے، تاکہ اس کو پڑھتے ہوئے طلبہ میں کسی تعبیر کی حتمیت کا تصور نہ پیدا ہو۔

مصر میں، حسنی مبارک کے عہد کے دوران مذہبی تعلیم کو اسی انداز میں باقی رکھا گیا جیسے روایتی دینی مدارس میں موجود تھی۔جدید تعلیمی اداروں میں بھی اسی طرح کا ہی عنصر نظر آتا رہا۔حکومتی سطح پر اس طرح کے کسی خاص اقدام کا پتہ نہیں چلتا کہ سرکاری تعلیمی اداروں میں شامل مذہبی نصاب پر نظرثانی کی گئی ہو یا اس کی تنقیح کے لیے کوششیں کی گئی ہوں۔اس دور میں اگرچہ مذہبی سیاسی جماعتوں کی سخت مخالفت کی جاتی رہی، مگر اس کے باوجود تعلیمی اداروں میں شامل مذہبی نصاب کے اندر کوئی تبدیلیاں نہیں کی گئیں۔

البتہ پچھلے دس برسوں کے دوران شہریت کی تعلیم کو پرائمری اور مڈل اسکول کی سطح پر مذہبی تعلیم اور سماجی علوم کا حصہ بنایا گیا ہے۔حال ہی میں، وزارت تعلیم نے گیارہویں اور بارہویں جماعت کے نصاب میں شہریت اور انسانی حقوق پر ایک کورس شامل کیا ہے۔

ایران کی دینی علمی روایت میں حوزوں کا کردار

مجتبیٰ علی شجاعی

ایران چونکہ اہل تشیع مکتب فکر کا اکلوتا مرکز رہا ہے اس لیے یہاں اہل تشیع کے نظریات پر مبنی اسلامی کورسس بڑی تعداد میں پڑھائے جاتے ہیں ۔پوری دنیا سے اہل تشیع مکتب فکر کے طلباء ایران سے اسلامی علوم میں ڈگریاں حاصل کرتے ہیں۔حکومتی سطح پر ایسے طلباء کی حوصلہ افزائی بھی کی جاتی ہے۔ایران کے حوزے دینی تعلیم کے فروغ اور تخصصات کے لحاظ سے پوری دنیا میں ایک منفرد حیثیت رکھتے ہیں۔خصوصا 'حوزہ علمیہ قم' کو بلند مقام حاصل ہے۔مکتب تشیع کی اس دینی علمی روایت کی تاریخ کیا ہے اور اس کے اثرات کیا ہیں، اس مضمون کا موضوع ہے۔مضمون نگار محقق اور اسلامی علوم وفلسفہ کے ماہر ہیں۔

ایران میں ابتدائی/پرائمری مرحلے کو ''مقدمات'' کہتے ہیں۔اس مرحلے میں طالب علموں کو نصاب میں شامل بنیادی عربی، فارسی، گرائمر، منطق، فقہ و اصولِ فقہ سے آشنائی، عرصہ چھ سال تک پڑھائے جاتے ہیں۔اس کے بعد ہائی سکول لیول جسے ایران میں ''سطح'' کہا جاتا ہے، میں فقہ، اصولِ فقہ، قرآن، تفسیر، حدیث، کلام اور فلسفہ کی تدریس قدرے تفصیل کے ساتھ عرصہ چار سال تک پڑھائے جاتے ہیں۔(یادرہے، کہ درج بالا مرحلوں کے دوران بحث و مباحثہ اور خطابت پر بھرپور توجہ دی جاتی ہے)درس خارج: یہ مرحلہ چار سال اور مزید کچھ سالوں پر محیط ہوتا ہے، جس میں زیادہ تر توجہ تخیل و قیاس کے ذریعے(خود بقول ان کے)جدید مسائل کا شرعی حل نکالنے پر مرکوز ہوتا ہے، جیسے فقہ قیاسی بھی کہا جاتا ہے۔دراصل یہ مرحلہ رتبہ مجتہد کی طرف لے جاتا ہے۔کئی عوامل کی بناپر طلبا کی ایک نہایت محدود تعداد درس خارج میں شامل ہوتی ہے، جس میں زیادہ تر ایرانی اور عرب ہوتے ہیں۔

شہرِ قم کی تاریخ

قم کا شمار اسلامی جمہوریہ ایران کے اہم شہروں میں ہوتا ہے اور یہ ایران کا آٹھواں بڑا شہر ہے ۔جو

تہران سے تقریباً ۱۵۰ کلومیٹر کے فاصلے پر جنوب میں واقع ہے۔ شہر قم کے شمال میں تہران، جنوب میں اصفہان، مشرق میں صوبہ سمنان اور مغرب میں صوبہ مرکزی واقع ہے۔ سرکاری اعداد و شمار کے مطابق قم شہر کی کل آبادی ۱۱۵۱۶۷۲ نفوس پر مشتمل ہے۔

عراق کے شہر نجف اشرف کے بعد قم مسلمانوں کا سب سے اہم علمی مرکز سمجھا جاتا ہے۔ قم اس لئے بھی قابل احترام ہے کہ یہاں پر آٹھویں امام حضرت علی رضا کی ہمشیرہ حضرت فاطمہ معصومہ کا مزار بھی ہے۔ شہر قم کی آبادی کا ایک بڑا حصہ علما کرام، فقہا عظام اور دینی تعلیم حاصل کرنے والے طلاب پر مشتمل ہے۔ شہر قم کو اس کی علمی، تاریخی اور معنوی اہمیت کے پیش نظر مختلف ناموں اور القاب سے یاد کیا جاتا ہے۔ جن میں سے مشہور قم المقدسہ، شہر علم، علما کا شہر اور شہر کریمہ اہل بیت وغیرہ ہیں۔

شہر قم قدیم زمانے سے علمی مرکز رہا ہے۔ حجاج بن یوسف ثقفی کے دور میں جب بنو ہاشم کے چاہنے والوں پر سرزمین عرب تنگ ہونے لگی تو انہوں نے اپنی جان و مال اور عزت و آبرو کے تحفظ کے لئے سرزمین عرب کو خیر باد کہتے ہوئے دور دراز علاقوں کی طرف ہجرت کرنا شروع کیا۔ اسی دوران سر زمین کوفہ سے تعلق رکھنے والے اشعری نامی ایک قبیلہ کے لوگوں نے کوفہ سے ہجرت کرکے قم کو اپنا مسکن قرار دیا۔ جیسا کہ محمد شریف رازی نے لکھا ہے کہ: "انہوں نے قم کو جو ۱۶ قلعوں پر مشتمل تھا ایک شہر میں تبدیل کر دیا اور اپنے مخالفین کو وہاں سے باہر نکال دیا، یوں شہر قم علم حدیث کا مرکز بن گیا"۔

حوزہ کا مفہوم

حوزہ یا الحوزہ عربی زبان کا لفظ ہے جس کے لغوی معنی کنارہ، طبیعت اور سرحدوں کے درمیان گھرا ہوا وسطی اور مرکزی علاقہ کے ہیں، اسی مناسبت سے ملک کے دار الخلافہ کو بھی حوزہ کہتے ہیں۔ جبکہ عام اصطلاح میں لفظ حوزہ یا حوزہ علمیہ اس دینی تعلیمی مرکز کو کہا جاتا ہے جہاں ابتدائی کلاس سے لیکر اجتہاد کے درجے تک کی دینی تعلیم دی جاتی ہو۔ عام طور پر جب حوزہ علمیہ قم یا حوزہ علمیہ نجف اشرف یا کسی

اور حوزہ علمیہ کی بات کرتے ہیں تو یہ خیال کیا جاتا ہے کہ حوزہ علمیہ قم یا حوزہ علمیہ نجف کسی خاص مدرسہ کا نام ہوگا، جبکہ ایسا نہیں ہے بلکہ قم اور نجف کو ان کی علمی مرکزیت کی وجہ سے حوزہ علمیہ کہا جاتا ہے جہاں پر سیکڑوں مدارس ہیں جو ''شورای عالی حوزہ ہای علمیہ ''یعنی حوزات علمیہ کی سپریم کونسل نامی ادارے کے زیر نظر خدمات انجام دے رہے ہیں۔ حوزہ علمیہ مشہد مقدس اور حوزہ علمیہ اصفہان کے علاوہ (ان دونوں حوزات علمیہ کی اپنی اپنی الگ سپریم کونسل موجود ہے) ایران کے دیگر صوبوں میں موجود تمام دینی مدارس بلکہ بعض بیرون ملک کے مدارس بھی اسی شورای عالی کے زیر نظر خدمات انجام دے رہے ہیں۔ حوزہ علمیہ قم نے اپنی طویل زندگی میں زمانے کے بڑے نشیب و فراز دیکھے ہیں۔ حالات نے بارہا اس کی ترقی کی راہیں مسدود کی ہیں اور مشکلات نے اکثر و بیشتر اس کی رفتار ترقی کو متاثر کیا ہے تاہم اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے کہ وہ نامساعد حالات اور پے در پے مشکلات کے باوجود ترقی کی منزلیں طے کرتا رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج کا حوزہ علمیہ قم اس حوزہ سے بہت مختلف ہے جس نے آج سے تقریباً ستانویں سال قبل سن ۱۹۲۱ء میں آیت اللہ عبدالکریم بروجردی کی سرپرستی میں بڑی بے سروسامانی کے عالم میں اپنی تعلیمی اور تدریسی زندگی کا آغاز کیا تھا۔ یقیناً اس وقت حوزہ کو یہ سہولیات میسر نہ تھیں جو آج کے حوزہ کو میسر ہیں آج حوزہ علمیہ قم کو اس کی ضرورت کی تمام سہولیات، عمارتیں، سماعت گاہیں، کتب خانے دستیاب ہیں کہ جن کے در و دیوار کسی عظیم الشان اسلامی یونیورسٹی کی عظمت و وقار کا پتہ دیتے ہیں جہاں کے پر وقار اور پر سکون ماحول میں صبح و شام تعلیمی اور تحقیقی سرگرمیاں جاری رہتی ہیں، بلکہ دن رات اس کے کتب خانوں کی روشنیاں دور سے جھلملاتی نظر آتی ہیں جو اس بات کی علامت ہیں کہ یہاں شمع علم کے پرستار ہمہ وقت مصروف مطالعہ رہتے ہیں۔

حوزہ علمیہ قم کی تاسیس

حوزہ علمیہ قم کی تاسیس پہلی صدی ہجری سے جاملتی ہے۔ اس وقت سے لیکر آج تک بڑی عظیم شخصیات مختلف ادوار میں حوزہ علمیہ قم کی تاسیس نو کے حوالے سے اپنا کردار ادا کرتی رہی ہیں۔

عبداللہ اشعری:

حضرت امام زین العابدین کے دور امامت (۹۳ ہجری) میں عبداللہ بن سعد اشعری کوفہ سے قم تشریف لائے اور شہر قم میں پہلا حوزہ علمیہ کی داغ بیل ڈالی اور فقہ کے درس وتدریس کا آغاز کیا یوں آپ شہر قم میں فقہ کے پہلے استاد تھے جو کھلم کھلا اس شہر میں شیعی فقہ کی تعلیم دیتے تھے۔

ابراہیم بن ہاشم:

ابواسحاق، ابراہیم بن ہاشم بن خیل کوفی جو یونس بن عبدالرحمن کے شاگرد تھے جس کا شمار حضرت امام علی بن موسی الرضا کے اصحاب میں ہوتا تھا وہ بھی کوفہ سے ہجرت کر کے قم آئے تھے اور اسے تجدید حیات بخشی۔آپ ابراہیم بن ہاشم قمی کے نام سے معروف ہوئے۔ابراہیم بن ہاشم حضرت امام علی بن موسی الرضا کے اصحاب میں سے پہلے شخص ہیں جنہوں نے کوفہ کے بزرگ علما کی احادیث کو قم منتقل کیا۔ابراہیم بن ہاشم کے بعد آپ کے فرزند علی بن ابراہیم بن ہاشم المعروف علی بن ابراہیم قمی جو تفسیر قمی کے مصنف بھی ہیں انہوں نے اپنے والد کے مشن کو آگے بڑھایا۔

علی بن بابویہ:

علی بن حسین بن موسی بن بابویہ قمی المعروف ابن بابویہ قمی کا شمار حضرت امام حسن عسکری کے دور کے بڑے علماء میں ہوتا ہے انہوں نے بھی اپنے دور میں حوزہ علمیہ قم کو حیات نو بخشی۔ علی بن بابویہ نے اپنے دور مدیریت میں حوزہ علمیہ قم میں بڑے نامی گرامی علماء کی تربیت کی ہے منجملہ ان میں سے ایک شیخ صدوق کا نام ہے۔ شیخ صدوق حوزہ علمیہ قم سے فراغت کے بعد بغداد تشریف لے گئے۔

حوزہ علمیہ قم کی کامیاب پالیسی ۲۸۰ھ سے لیکر ۳۴۰ھ میں تشیع کی تبلیغ، تعلیم وتربیت کا سبب بنی۔ بنوامیہ اور بنوعباس کی طرف سے علویوں پر تمام تر دباؤ اور سختیوں کے باوجود اسی حوزہ علمیہ اور اس سے وابستہ علماء کی کوششوں سے علویوں کی دو چھوٹی حکومتیں قائم ہوئیں (یعنی مازندران کے علویوں (ناصر صغیر) اور آل بویہ مختلف علاقوں (فارس، عراق، خوزستان، رے، ہمدان اور اصفہان)

میں اپنی حکومت تشکیل دینے میں کامیاب ہوئے۔ حوزہ علمیہ قم نے چوتھی صدی ہجری کے نصف اول اور پانچویں صدی ہجری میں ترقی کی بلندیوں کو چھولیا تھا لیکن چھٹی صدی ہجری سے لیکر نویں صدی ہجری تک انتہائی مشکلات اور سختیوں سے دوچار ہوا جس کی بنیادی وجہ مغلوں اور تیموریوں کی طرف سے قتل عام کے واقعات ہیں۔

قم پر حملے اور علمی زوال

۶۲۱ھ میں قم اور کاشان پر منگولوں کے بے رحمانہ حملوں اور خونریزیوں کے نتیجے میں حوزہ علمیہ قم پر بھی بے شمار منفی نتائج مراتب ہوئے جس کی وجہ سے یہ عظیم حوزہ روبزوال ہوا۔ آقا بزرگ تہرانی کے بقول 'قمی' نسبت رکھنے والے علما کی تعداد چھٹی صدی ہجری میں ۳۴، ساتویں صدی میں ۳ اور نویں صدی میں ۷ تھی جبکہ اس کے مقابلے میں حوزہ علمیہ حلہ میں علما کی تعداد چھٹی صدی ہجری میں ۱۶، ساتویں صدی میں ۳۴، آٹھویں صدی میں ۳۸ اور نویں صدی میں ۱۰ تھی۔ یہ بات بذات خود اس دور میں حوزہ علمیہ قم کے جمود اور روبزوال ہونے پر دلالت کرتی ہے۔ لیکن یہ بات حقیقت ہے کہ اس دوران بھی تمام تر مشکلات کے باوجود حوزہ علمیہ قم کی علمی فعالیت جاری وساری رہی ہے۔ ابن طاؤس (متوفی ۶۹۳ھ) نے قم میں ایک مدرسے کا تذکرہ کیا ہے۔ جو ان دنوں سرگرم عمل تھا اور شاید قم کے بازار کے قریب واقع مدرسہ رضویہ اسی مدرسے کی یادگار ہے۔ اسی طرح ابن عنبہ (متوفی ۸۲۸ھ) نے بھی بازار قم کے نزدیک ''سورانیک'' کے علاقے میں ایک مدرسے کا تذکرہ کیا ہے۔ جس میں امام حسن مجتبیٰ کی اولاد میں سے ایک امامزادہ'' ناصر الدین علی بطحانی'' مدفون ہیں۔ ''خواندمیر'' اپنی کتاب دستور الوزرا میں تیموری بادشاہوں کے وزیر برہان الدین عبدالحمید کرمانی (متوفی ۸۷۷ھ) کے حالات زندگی بیان کرتے ہیں جنہوں نے قم کے ایک مدرسے میں سکونت اختیار کی تھی۔ مدرسی طباطبائی نے احتمال ظاہر کیا ہے کہ یہ وہی مدرسہ غیاثیہ تھا جو تقریبا ۷۳۰ھ میں خواجہ غیاث الدین امیر محمد بن رشید الدین فضل اللہ کے ہاتھوں تعمیر ہوا تھا اور آج بھی اس کے داخلی دروازے کا بالائی حصّہ اور مینارے موجود ہیں۔

شیعہ حکمرانوں کے علمی حوزوں پر اثرات

صفوی بادشاہوں کا شیعہ ہونا شیعہ مدارس اور حوزات علمیہ (خصوصاً حوزہ علمیہ قم) کی رونق میں اضافے کا سبب بنا۔ صفویوں ہی کے دور میں مدرسہ فیضیہ کی تعمیر نو کی گئی اور اس کے ساتھ ساتھ چند نئے مدارس بھی تعمیر کئے گئے جیسے مدرسہ مہدی قلی خان، مدرسہ جہانگیر خان اور مدرسہ مومنیہ وغیرہ(۱۴) حوزہ علمیہ قم عملی طور پر سرزمین ایران میں تشیع کا دوسرا بڑا مرکز بن گیا تھا یہاں تک کہ صفویوں کے آخری دور حکومت میں متعصب لوگوں نے قم پر چڑھائی کی جس کی وجہ سے حوزہ علمیہ قم نے اپنا رونق کھو دی۔

محمد خان قاجار نے حصول اقتدار کی خاطر ایران کے مختلف شہروں منجملہ قم پر حملہ کر دیا اور انہیں ویران کر دیا لیکن اس کے بعد فتح علی خان قاجار نے شہروں کو دوبارہ رونق بخشنے کی پالیسی اپنائی اور مذہبی شہروں اور مقدس مقامات پر خاصہ توجہ دی اور یہ وصیت بھی کر دی کہ اس کے مرنے کے بعد اسے قم میں دفن کیا جائے۔ اس دور میں شہر قم کو پھر سے رونق تو ملی لیکن وہاں پر کوئی ایسا عالم موجود نہ تھا جو حوزہ علمیہ قم کو سنبھالتا۔ یہاں تک کہ میرزا ابوالقاسم قمی صاحب قوانین الاصول جس کا شمار میرزا آیت اللہ وحید بہبہانی (حوزہ علمیہ کربلا میں اصولی نظریات کا بانی) کے شاگردوں میں ہوتا ہے، قم تشریف لائے انہوں نے عالم تشیع میں اصولی نظریات پر مبنی دوسرے حوزہ علمیہ کی بنیاد رکھ دی۔ میرزای قمی کے وجود سے حوزہ علمیہ قم کی رونقوں میں اضافہ ہوا علماء اور طلبہ کی ایک بڑی تعداد قم میں اکھٹی ہوئی۔

اس کے علاوہ مدرسہ فیضہ اور دیگر مدارس تعمیرات نو کی گئی اور تمام مدارس کی عظمت رفتہ پھر سے لوٹ آئی۔ ان کے بعد آیت حائری یزدی قم تشریف لائے۔ قم تشریف لانے سے قبل آپ حوزہ علمیہ اراک میں خدمات انجام دے رہے تھے اس وقت بھی بعض علماء قم میں درس وتدریس میں مشغول تھے منجملہ ان میں سے ایک شیخ ابوالقاسم قمی (متوفی ۱۳۵۳ھ) کا نام لیا جا سکتا ہے۔ آپ مسجد امام میں نماز جماعت کی امامت فرماتے تھے اور اس کے ساتھ صبح کے وقت طلباء کو درس دیتے تھے جبکہ شام

کے وقت عوام الناس کو درس دیا کرتے تھے۔ یوں آپ نے قم میں علم کے چراغ کو روشن رکھا تھا۔

رضا شاہ کے بعد حوزات علمیہ

رضا خان نے اقتدار حاصل کرنے کے بعد جب ملک سے اسلام کی جڑوں کو کاٹنا شروع کیا تو اس کے کردار کو دیکھتے ہوئے قم کے علماء نے حوزہ علمیہ قم کو فعال کرنے کا پروگرام بنایا۔ اس سلسلے میں شیخ مہدی حکمی (معروف پایین شہری) نے آیت اللہ عبدالکریم حائری یزدی سمیت قم اور تہران کی جید علماء کی اپنے گھر پر دعوت کی اور علماء کی موجودگی میں شیخ حائری سے حوزہ علمیہ اراک کو قم منتقل کرتے ہوئے اس کی زعامت سنبھالنے کی دعوت دی۔ اس موقع پر آیت اللہ حائری نے قرآن مجید سے استخارہ نکالنے کا فیصلہ کیا اور جب آپ نے استخارہ نکالا تو سورہ مبارکہ یوسف کی یہ آیت آئی "وآتونی بأهلکم أجمعین" علماء کرام کی تاکید کے ساتھ ساتھ قرآن مجید کی تائید بھی حاصل ہونے پر آیت اللہ حائری نے قم میں مستقل قیام کا فیصلہ کیا۔

آیت اللہ حائری نے حوزہ کے تعلیمی امور، درس وتدریس اور اسکالر شپ یعنی شہریہ کا نظام کو ٹھیک کرنے کے ساتھ اچھے اور پائے کے اساتذہ کو جذب کرنے نیز طلبا کے امور کی دیکھ بال کی ذمہ داریاں الگ الگ لوگوں کو سونپی۔ آپ نے ایک ایسا سنگ بنیاد رکھا کہ رضا شاہ (شاہ ایران) نے آپ کے ۱۵ سالہ دور مدیریت کے دوران حوزہ علمیہ قم کو ختم کرنے کے لیے اپنی پوری دولت کو داؤ پر لگانے کے ساتھ ساتھ تمام تر اقدامات کے باوجود اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکا۔ یہاں تک کہ رضا شاہ کو یہ کہنا پڑا کہ: میں نے سب کو تو ہٹا لیا لیکن اگر ایک اس (آیت اللہ حائری) کو بھی ہٹاتا تو پورے ملک سے ان کو مٹا سکتا تھا۔ ایک ایسے ماحول میں آیت اللہ حائری ۱۵ سال تک حوزہ علمیہ قم کے مدیر رہے اور ۴۰۰ جامع الشرائط مجتہدین اور فقہا کی تربیت کی اور انہیں پورے ایران میں پھیلایا۔ آیت اللہ حائری نے حوزہ علمیہ قم کی کچھ اس طرح سے بنیاد رکھی اور ایسے علما کی تربیت کی کہ یہاں تک کہ آپ کے ارتحال کے بعد بھی رضا شاہ اور اس کا بیٹا محمد رضا حوزہ علمیہ کو ختم کرنے میں ناکام رہے اور یہ اپنی جگہ قائم ودائم رہا۔ ۱۹۳۶ء میں آیت اللہ حائری یزدی نے اس دار فانی کو وداع کہا اس زمانے میں شاہی

حکومت کی طرف سے اس قدر سختی کی جاتی تھی اور مظالم ڈھائے جاتے تھے کہ حوزہ علمیہ کے بزرگ علما فرماتے تھے کہ: ہمیں کسی بھی قسم کے حادثے کا انتظار ہوتا تھا ہم سوچتے تھے کہ شاید وہ ہمارے ساتھ روس اور ترکی والا سلوک کریں گے اور راتوں رات سب کو جمع کر کے دریا میں بہادیں گے یا کسی میدان میں پھینک کر گولیوں سے چھلنی کر دیں گے "۔ اس قسم کے حالات میں آیت اللہ حائری کے تین شاگردوں (آیت اللہ سید صدرالدین صدر، سید محمد کوہ کمرہ ای اور سید محمد تقی خوانساری) نے حوزہ علمیہ قم کی مدیریت کو سنبھالا اور جس نہج پر آیت اللہ حائری نے حوزہ کو ڈالا تھا اسی پر چلاتے رہیں۔ اس زمانے میں بعض دیگر بزرگ علما جیسے امام خمینی، آیت اللہ مرتضیٰ حائری (فرزند آیت اللہ حائری) آیت اللہ گلپایگانی، آیت اللہ مرعشی نجفی، آیت اللہ میرزا ہاشم آملی آیت اللہ بہاالدینی اور دیگر علما حوزہ علمیہ قم میں تدریس کے فرائض انجام دے رہے تھے اور مذکورہ بالا تینوں آیات عظام کی مدد کرنے میں مشغول تھے۔ ان تینوں بزرگ علما کرام نے ۱۹۳۶ء سے ۱۹۴۴ء تک حوزہ علمیہ کی مدیریت کو چلاتے رہیں اور ۱۹۴۴ء میں حوزہ کی مدیریت آیت اللہ العظمیٰ بروجردی کے حوالے کر دیا۔ جس سال آیت اللہ عبدالکریم حائری کے ہاتھوں حوزہ علمیہ قم کی تاسیس ہوئی اسی سال عراقی حکومت نے چودھویں صدی ہجری کے بعض علماء اور مجتہدین کو سرزمین عراق سے نکال دیا جن میں سرفہرست آیت اللہ سید ابوالحسن اصفہانی، آیت اللہ میرزا حسین نائینی، آیت اللہ سید علی شہرستانی، آیت اللہ سید عبدالحسین حجت کربلائی، آیت اللہ شیخ محمد حسین اصفہانی غروی اور آیت اللہ شیخ مہدی خالصی وغیرہ شامل تھے۔

قم کے بزرگ علما نے حوزہ علمیہ قم کی مدیریت کو کسی ایک شخص کے حوالے کرنے نیز حوزہ کے بارے میں آیت اللہ حائری یزدی کی طرف سے متعین کردہ طویل مدت اہداف پر جلد سے جلد عمل درآمد کرانے کے لیے آیت اللہ العظمیٰ بروجردی کو قم آنے پر مجبور کیا۔ اس دور میں دینی مدارس اور حوزات علمیہ کی اصلاح کے حوالے سے امام خمینی کا بہت بڑا کردار تھا۔ اس بات کا اندازہ روح اللہ خمینی کے اس جملے سے ہو سکتا ہے۔ "سیاسی امور سے متعلق ایک میٹنگ کے دوران جس میں آقائے بروجردی، حجت، خوانساری اور صدر شریک تھے میں نے کہا کہ سب سے پہلے ان مقدس مآب لوگوں کے بارے میں فیصلہ کیا جائے کیونکہ ان کی موجودگی کی مثال ایسی ہے جیسے دشمن نے آپ پر حملہ کیا

ہو اور کسی نے مضبوطی کے ساتھ آپ کے ہاتھوں کو پکڑا ہو۔"

آیت اللہ بروجردی نے آیت اللہ حائری کی طرف سے مرتب کردہ پروگراموں سے باقی ماندہ کمزوریوں کو دور کرنے کی بھرپور کوشش کی، انہوں نے حوزہ علمیہ کے درسی اور شہریہ (اسکالرشب) کے نظام کو انتہائی دقت کے سے تکمیل کو پہنچایا۔اس کے علاوہ پورے ایران میں بڑے بڑے علما کی تربیت کا بھرپور انتظام فرمایا نیز بڑے بڑے علما کو اپنے نمائندوں کے طور پر پورے ایران میں بھیجا اور ان سب کا حوزہ علمیہ قم سے روابطہ کو برقرار رکھا۔بعض بزرگ مراجع جیسے امام خمینی، سید محمد رضا گلپایگانی، میرزا ہاشم آملی، سید شہاب الدین مرعشی نجفی وغیرہ کو قم ہی میں رکھا تاکہ ان کے بعد حوزہ علمیہ قم کی مدیریت کو سنبھال سکیں۔

امام خمینی کا اثر ورسوخ

اسی دوران آیت اللہ بروجردی کے بے پناہ اصرار اور بعض دیگر علما جیسے استاد شہید مرتضی مطہری کی خواہش پر امام خمینی نے فقہ اور اصول کا درس شروع کیا اور آپ نے اس کام پر اپنا بڑا وقت صرف کیا ۔یہی وجہ ہے کہ کچھ ہی عرصہ بعد آپ آیت اللہ بروجردی کے بعد حوزہ علمیہ قم کے سب سے بڑے استاد کے طور پر جاننے لگے۔آیت اللہ العظمیٰ بروجردی کے ارتحال پر محمد رضا شاہ (شاہ ایران) نے اس نیت سے کہ اب حوزہ علمیہ قم کی بساط لپیٹ دینا چاہیے انہوں نے عراق میں مقیم آیت اللہ حکیم کے نام اپنا پیغام بھیجا۔وہ چاہتا تھا کہ ایران کے لوگ نجف کے بزرگ علما کی تقلید کریں تاکہ اس طرح آہستہ آہستہ حوزہ علمیہ قم کو کمزور کیا جاسکے اور یوں وہ حوزہ علمیہ قم اور دین اسلام کے خلاف تیار کردہ پروگرام کو عملی جامہ پہنا سکے۔

امام خمینی حوزہ علمیہ قم کے ہی تربیت یافتہ تھے وہ علما کرام کی بھرپور حمایت اور تعاون سے شاہ ایران کی ان غلط پالیسیوں کے خلاف سیسہ پلائی دیوار بن گئے اور اسلامی انقلاب جس کا سنگ بنیاد آیت اللہ حائری نے رکھا تھا اور آیت اللہ بروجردی نے پورے ملک میں جس کی جڑوں کو پھیلایا تھا اس پر عمل در آمد کرانے کا اصولی فیصلہ کر لیا اور سنہ ۱۹۶۴ء کو ملک میں اسلامی انقلاب لانے کا اعلان کیا جس پر حوزہ

علمیہ قم کے بڑے بڑے مجتہدین اور اعلیٰ شخصیات نے بھی آپ کی آواز سے آواز ملائی یوں ۱۱فروری ۱۹۷۹ء کو ایران پر مسلط ۲۵۰۰ سالہ شہنشاہی نظام کے تختہ کو الٹنے اور اس کی جگہ ایک اسلامی جمہوری حکومت تشکیل دینے میں کامیاب ہوئے۔

سیاست میں کردار

حوزہ علمیہ قم کی شہرت کی ایک بڑی وجہ اس کی انقلابی جدوجہد ہے۔تاریخ میں پہلی مرتبہ ایک حوزہ علمیہ سے ایک سیاسی انقلاب نے جنم لیا یہی نہیں بلکہ حوزہ علمیہ قم شروع ہی سے قم کی سیاست میں اپنا بھرپور کردار ادا کرتا رہا ہے اس کی بنیادی وجہ یہ تھی یہ پورا شہر شیعہ تھا جس کے نتیجے میں یہاں کے والی اور قاضی اکثریتی آبادی سے مقرر کئے جاتے تھے۔مثال کے طور پر ہارون الرشید نے اپنے دور حکومت میں حمزہ بن یسع بن عبداللہ قمی کو والی قم مقرر کیا جو امام علی رضاؑ کے راویوں میں سے تھے اور نہیں یہ بھی اجازت دی کہ وہ قم کو اصفہان سے الگ کر دیں اور وہاں نماز جمعہ قائم کریں۔اسی طرح یہاں کا قاضی بھی شہر کے عوام کے مذہب کا پیروکار ہوتا تھا یہاں تک کہ مکتفی نے قاضیوں کی تقرری کے لئے ضابطہ متعین کیا جس کے تحت قضات کو شہروں سے بھیجے جاتے تھے۔اس کے باوجود یہاں کے قاضی شہر کے شیعہ علماء میں سے متعین کئے جاتے تھے۔

خلاصہ

اس تحقیق کا حاصل بحث یہ ہے کہ حوزہ علمیہ قم کا شمار عالم اسلام کے قدیم دینی تعلیمی مراکز میں ہوتا ہے۔جس نے اپنی طویل تاریخ میں زمانے کے بڑے نشیب و فراز دیکھے ہیں اور تمام تر مشکلات کے باوجود ترقی کی منزلیں طے کرتے ہوئے اس مقام پر پہنچا ہے کہ اس وقت حوزہ علمیہ قم کا شمار دنیا کے بڑے اور عظیم تعلیمی مراکز میں ہوتا ہے جہاں دنیا بھر کے تقریباً ۱۰۰ ممالک سے تعلق رکھنے والے ۸۰ ہزار سے زائد طلبا و طالبات علم کے نور سے اپنے اذہان کو منور کر رہے ہیں۔صرف یہی نہیں بلکہ حوزہ علمیہ قم نے معاشرتی اور سیاسی میدان میں بھی نمایاں کردار ادا کیا ہے۔جس کی سب سے عظیم مثال اس حوزہ سے وابستہ علماء کا آیت اللہ خمینی کی قیادت تاریخ اسلام کا سب سے بڑا انقلاب لانا اور پھر

ایک اسلامی فلاحی ریاست کو کامیابی کے ساتھ چلانا شامل ہے۔ خلاصہ یہ کہ حوزہ علمیہ قم نے پوری دنیا کے سامنے یہ ثابت کر دیا ہے کہ اسلامی تعلیمات میں اتنی وسعت پائی جاتی ہے کہ اس میں جدید سے جدید مسائل کا حل موجود ہے۔ نیز یہ بھی ثابت کر دیا کہ دینی مدارس اور حوزات علمیہ سے وابستہ علماء زندگی کے تمام شعبوں میں اسلامی معاشرے کی بہترین راہنمائی کی صلاحیت رکھتے ہیں جس کی زندہ مثال حوزہ علمیہ قم کی شکل میں ہمارے سامنے موجود ہے۔

انڈونیشیا کے مذہبی ادارے
اور قومی مرکزی دھارے میں ان کا کردار

ادارتی ٹیم

بیسویں صدی کے آغاز میں انڈونیشیا سے بڑے پیمانے پر حج کے لیے آمدورفت شروع ہوئی، تو ان میں متعدد حجاج کرام مکہ یا مدینہ میں دو چار برس کے لیے مقیم ہوجاتے، اور عربی کا فہم حاصل کرتے۔ پھر انڈونیشیا سے آنے والے حاجیوں کی ایک تعداد چند برس بعد جب اپنے وطن لوٹتی تو وہ معیاری دینی مدارس قائم کرنے کو سعادت مندی خیال کرتی۔اسی طرح انڈونیشیا میں دینی تعلیم کے حصول کے لیے مصر کو منزل بنایا گیا۔یوں اس ملک کا دینی ڈھانچہ برصغیر کی مذہبی روایت سے الگ رہا۔اگرچہ انڈونیشیا میں دینی مدارس کی روایت بڑی قدیم تھی، لیکن مندرجہ بالا تجربے کے ساتھ دینی مدارس قائم کرنے کی اس لہر کے کئی امتیازات سامنے آئے۔ ان میں ایک بڑا امتیاز یہ تھا کہ شروع ہی سے ان مدارس پر شیخ محمد عبدہ اور الازہر یونیورسٹی مصر کے اثرات، طاقتور انداز سے مرتب ہونا شروع ہوئے۔انڈونیشیا کا موجودہ مذہبی تعلیمی نظام کیسا ہے، زیر نظر مضمون میں اسی کو موضوع بنایا گیا ہے۔

انڈونیشیا کی آزادی کے بعد ابتدائی دنوں میں ہی تعلیمی نظام میں مذہبی عنصر اور تعلیم میں اس کی حیثیت پر گرما گرم بحث چھڑ گئی تھی۔ڈیڑھ سال کے بحث ومباحثے کے بعد انڈونیشیا کی پارلیمنٹ نے مندرجہ ذیل پالیسی اختیار کی:

"سرکاری اسکولوں میں مذہبی تعلیم فراہم کی جائے گی،البتہ والدین فیصلہ کریں گے کہ آیا ان کے بچے ان اسباق میں شرکت کریں گے یا نہیں"۔ ظاہر ہے اس شرط کی وجہ یہ تھی کہ ملک میں دیگر مذاہب کے لوگ بھی رہتے ہیں۔

شروع میں مذہبی تعلیم سے متعلقہ ہدایات تعلیمی ایکٹ 1950 کا حصہ تھیں۔ مگر مسلم گروہوں اور وزارت مذہبی امور کی طرف سے دباؤ آیا کہ، اسلامی نظام تعلیم کو مجموعی طور پر تعلیمی ایکٹ 1950

سے خارج کر کے، باقاعدہ اسے وزارت مذہبی امور کے ماتحت کر دیا جائے۔اس کے بعد تعلیمی نظام سے متعلق عمومی مذہبی ہدایات کو تو ایکٹ میں شامل رکھا گیا، لیکن اسلامی مذہبی ہدایات کو وزارت مذہبی امور کی ذمہ داری کے تحت کر دیا گیا، چاہے یہ اسلامی تعلیم سیکولر اسکولوں میں ہی کیوں نہ فراہم کی جائے۔اُس وقت سے لے کر اب تک، سیکولر اسکولوں میں بھی مذہبی تعلیم کی پالیسی کے نفاذ کو وزارت مذہبی امور اور وزارت تعلیم مشترکہ طور پر دیکھتی ہیں۔

1960 کے بعد انڈونیشیا کے سیاسی ڈھانچے میں نمایاں تبدیلی آئی، تو اس کے بعد غیر لازمی مذہبی تعلیم کو پہلی جماعت سے لے کر یونیورسٹی کی سطح تک، سب کے لیے لازمی قرار دے دیا گیا۔ 1965 میں بغاوت کی کوشش ہوئی، جس میں کمیونسٹ اور بنیاد پرست قوم پرستوں کو کامیابی نہ مل سکی، اور فوج اور مسلم گروہ مزید مضبوط ہوئے۔اس سے اسکول کے نصاب میں مذہبی تعلیم کی حیثیت کو پہلے سے بہتر بنانے کا ایک نیا موقع مل گیا۔تب کمیونزم کے خلاف جنگ میں مذہب کو ایک اہم عنصر سمجھا جاتا تھا۔1966 میں اسمبلی نے فیصلہ کیا کہ پہلی جماعت سے لے کر یونیورسٹی کی سطح تک اسکولوں میں مذہب کو بطور مضمون بنایا جائے۔

1997/98 میں کرپشن، معاشی ابتری اور بے روزگاری کے باعث ملک کے کچھ علاقوں میں سول تنازعات پھوٹ پڑے۔ان سے متعلق کہا گیا تھا کہ یہ نسلی بنیادوں پر ہونے والے واقعات ہیں، بعض علاقوں میں یہ مذہبی تنازعات کی صورت اختیار کر گئے، جیسے کہ مسلمانوں اور مسیحیوں کے مابین بدمزگی ہوئی۔یہی نہیں بلکہ خود مسلم گروپوں کے اندر بھی تناؤ کی کیفیت پیدا ہو گئی، جیسے سامپانگ، مدورا، مشرقی جاوا میں سنی اور شیعہ گروہ مدمقابل تھے۔مختلف مقامات پر احمدیہ اور مسلم گروہوں میں بھی فسادات ہوئے۔ان تنازعات کے بعد ملک میں بڑے پیمانے پر سیاسی اصلاحات کی گئیں۔

اس پس منظر میں، انڈونیشیا کے تعلیمی نظام، نصاب، فنڈز کے طریق کار اور انتظامی امور میں بھی اصلاحات کی خواہش سامنے آئی۔مذہبی تعلیم سے یہ توقعات وابستہ ہو گئیں کہ اسے اب دوہرا کام انجام دینا پڑے گا۔طالب علموں کو عقائد واخلاقیات کی تربیت دینے اور قومی طور پر ذمہ دار شہری بننے میں مدد کرنے کے ساتھ،انہیں تکثیریت پسند، مکالمے پر یقین رکھنے والا اور اختلافات کے لیے روادار بنانا ہو گا۔

ان فسادات کے بعد اصل میں لوگ فکر مند ہو گئے تھے، کیونکہ ان میں طالب علموں کی شمولیت بھی تھی۔ تعلیمی اداروں کے نوجوانوں کے درمیان شادی سے پہلے جنسی تعلقات، منشیات استعمال کرنے والوں کی بڑھتی تعداد اور طبقاتی تقسیم جیسے مسائل نے لوگوں کو سوچنے پر مجبور کر دیا۔ حکام اور لوگوں نے مذہبی تعلیم کی تاثیر پر سوال اٹھانا شروع کر دیے کہ ان کے بچوں پر دینی تعلیم نے کیا اثرات مرتب کیے؟ مذہبی تعلیم بچوں کو سماج دشمن سرگرمیوں سے کیوں نہ روک سکی؟ لوگ تعلیمی احتساب کا مطالبہ کرنے لگے۔ مذہبی اساتذہ کو مورد الزام ٹھہرایا گیا کہ وہ طالب علموں میں اچھے اخلاق پیدا کرنے میں ناکام رہے ہیں۔ کیونکہ لوگ مذہبی تعلیم سے بہت زیادہ توقع رکھتے ہیں جو طلباء کو کسی بھی غیر سماجی سرگرمیوں سے باز رکھنے میں اہم کردار ادا کرے گی۔

اس کے بعد نصاب میں اصلاحات کے لیے کھل کر باتیں ہونے لگیں اور ضرورت محسوس کی جانے لگی کہ حکومت اسکولوں کے لیے نیا مذہبی نصاب لائے، جس میں نہ صرف ظاہری معاملات کو درست کرنے پر توجہ دی جائے، بلکہ طلبہ کی شہری اخلاقی تربیت بھی ہو۔ درمیان میں تھوڑی بہت تبدیلیاں آتی رہیں، مگر 2013 میں باقاعدہ ایک تنقیح شدہ مذہبی نصاب متعارف کرایا گیا جسے ''نصاب 2013'' کہا جاتا ہے۔ اس میں مذہبی تعلیم کو اخلاقی تعلیم کے ساتھ ایک مضمون کے طور پر ضم کر دیا گیا ہے جسے 'مذہبی و اخلاقی تعلیم' کہا جاتا ہے۔ اسی طرح، انڈونیشیا کے قومی شعار پانچاسیلا[1](Pancasila) کی تعلیم جو پہلے نصاب سے ختم کر دی گئی تھی اسے بھی واپس بحال کر دیا گیا۔ اس کے بعد انڈونیشین حکومت نے مذہبی اداروں کے نصاب پر بھی توجہ مرکوز کی اور زور دیا کہ اسے شہریوں کے لیے مؤثر بنایا جانا چاہیے۔ اس میں اچھے کردار، علم اور مہارتوں کا عمدہ امتزاج ہونا چاہیے۔

انڈونیشیا کی ایک بڑی اسلامی جماعت محمدیہ نے اپنے تعلیمی اداروں کے لیے جو نصاب تیار کیا ہے وہ بہت ہی جدید اور کئی خوبیوں کا حامل ہے۔ محمدیہ کا ماڈل جدید تعلیمی نظام کے سیکولر علوم کو مذہبی علوم

[1] - یہ پانچ اصول ہیں جن پر تمام انڈونیشین یقین رکھتے ہیں: ایک خدا، مہذب انسانیت، ملکی اتحاد، جمہوریت اور سماجی انصاف۔

کے ساتھ جوڑتا ہے تاکہ اسلامی اقدار، انڈونیشیائی عنصر اور جدیدیت کے درمیان فرق کو کم کیا جا سکے۔ محمدیہ کے تعلیمی مفکرین اور ماہرین نے اسلامی اقدار، انڈونیشیائی قومی عنصر اور جدیدیت کو جوڑنے کے لیے مختلف کوششیں کی ہیں۔ ان تینوں ستونوں کو انڈونیشیا کی شناخت کی تشکیل میں بنیادی سمجھا جاتا ہے۔ محمدیہ کے مطابق، تعلیم اس وژن کو حاصل کرنے کا سب سے بہتر اور ممکنہ طریقہ ہے۔ یہ تنظیم انڈونیشیا میں پرامن، اعتدال پسند، اور جمہوری اسلامی تعلیمات کو فروغ دینے میں پیش پیش ہے۔ حالانکہ یہ ہدف حاصل کرنا بہ ظاہر آسان نہیں تھا۔

دینی اداروں فضلا کی قومی دھارے میں فعالیت

انڈونیشیا میں مذہبی تعلیم اور مدارس کی تاریخ بہت پرانی ہے۔ استعمار سے آزادی سے قبل بھی دینی تعلیم کے ادارے موجود اور متحرک تھے، اور اس کے بعد بھی یہ صورتحال جاری رہی۔ مدارس کو ملک کے اندر کافی مقبولیت ملی ہے، اور کئی سیاسی جماعتوں اور رہنماؤں نے مدارس کی کوکھ سے جنم لیا۔ مدارس کی ڈگریوں کو حکومتی سطح پر تسلیم کیا جاتا ہے اور ان سے نکلنے والے افراد مرکزی قومی دھارے میں فعال ہیں۔ یہ لوگ زندگی کے تمام شعبوں میں قائدانہ کردار ادا کر رہے ہیں۔ ملک کے بائیں بازو کو اگرچہ ان مدارس پر تحفظات ہیں، کیونکہ دائیں بازو کی سیاسی جماعتوں کو یہ مدارس بڑی وسیع کمک مہیا کرتے ہیں۔ 1970 کی دہائی میں، انڈونیشیا میں بڑے پیمانے پر تعلیم اور تعلیمی اداروں کو سیکولر نہج پر غالب کرنے کے لیے سب سے بڑی کوشش کی گئی تھی۔ اس وقت کی حکومت نے 61,000 پبلک پرائمری اسکول بنائے، جن کا مقصد تعلیم کے نظریاتی وزن کو تبدیل کرنا تھا۔ مگر اس کا کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ کیونکہ پرائمری سطح پر اتنی بڑی اسکولنگ اور ڈھانچے کو کھڑا کرنے اور مؤثر بنانے کے لیے حکومت کی ساری توجہ محدود ہوگئی اور پرائمری کے بعد کی سطح کی تعلیم میں مدارس پہلے سے زیادہ فعال ہوگئے۔ اس دوران اسلامی شعبہ نہ صرف ریاست کے ساتھ مقابلہ کرنے کے لیے نئے مرحلے میں داخل ہوا، بلکہ رفتہ رفتہ سماجی طلب اور تقاضوں کی بنا پر نئے بنائے گئے اسکولوں میں بھی کسی نہ کسی حد تک مذہبی نصاب شامل ہوتا گیا۔ تاہم، سیکولر تعلیمی نظام ختم نہیں ہوا ہے، سیکولر تعلیم پبلک کے ساتھ ساتھ پرائیویٹ اسکول بھی فراہم کرتے ہیں۔ سیکولر ادارے زیادہ تر سرکاری

ہیں۔ملک کے 76 فیصد سیکولر اسکول سرکاری ہیں، جن میں 90 فیصد پرائمری سطح پر اور 50 فیصد ثانوی سطح پر ہیں۔ سیکولر اسکول 1970 کی دہائی سے وزارت تعلیم و ثقافت کی ریگولیٹری اتھارٹی کے تحت آتے ہیں۔

اسلامی اداروں کی تقسیم

انڈونیشیا میں اسلامی تعلیم فراہم کرنے والے دو طرح کے ادارے ہیں۔ ا: مدرسہ، ۲: پیسنٹرن (pesantren)

مدارس دن کے اوقات میں کام کرنے والے ایسے ادارے ہیں جو سیکولر اسکولوں کی طرح تدریسی طریقے استعمال کرتے ہیں لیکن اپنے نصاب میں کافی زیادہ مذہبی مواد شامل کرتے ہیں۔

پیسنٹرن (pesantren)، رہائشی ادارے ہیں جو اسلامی علوم کی تدریس کے لیے وقف ہیں۔ انڈونیشیا میں مدارس کے مقابلے میں پیسنٹرن زیادہ فعال اور سیاسی رجحانات کے حامل ہیں۔ان میں زیادہ تفصیلی طور پہ مذہبی علوم پڑھائے جاتے ہیں اور حکومت کی طرف سے نگرانی کا پہلو بھی کمزور ہے۔

مذہبی اداروں کی اکثریت نجی طور پر چلائی جاتی ہے۔اس میں تمام پیسنٹرن اور 92 فیصد مدرسے شامل ہیں۔ 1967 میں، حکومت نے تمام نجی مدرسوں کو ریاست کے زیر انتظام آنے اور اضافی فنڈنگ دینے کی دعوت دی۔ مگر یہ کوشش ناکام ہوگئی کیونکہ زیادہ تر مذہبی اداروں نے نجی رہنے کا انتخاب کیا۔ مذہبی شعبے کی آزادی کو برقرار رکھنے کی شدید خواہش نے انڈونیشیا کے دوہرے تعلیمی نظام کو بھی برقرار رکھا ہوا ہے۔ لیکن اب حالات تبدیل ہو رہے ہیں۔

سیکولر اور مذہبی اداروں کے درمیان نصاب کا فرق

اسلامی اسکول بہت سے ایسے مذہبی مضامین پڑھاتے ہیں جو سیکولر اسکولوں میں شامل نہیں ہیں۔ان اداروں کے پانچ بنیادی مضامین ہیں: اسلامی قانون (فقہ)، اسلامی نظریہ اور اخلاقیات (عقیدہ اور

اخلاق)، قرآن اور حدیث، عربی زبان، اور تاریخ انبیاء (قصہ الانبیاء)۔1950 کی دہائی میں انڈونیشیا کے تمام اسلامی و سیکولر ادارے لگ بھگ ملتا جلتا نصاب پڑھاتے تھے۔ لیکن بعد میں یہ فرق بڑھتا گیا۔ مثال کے طور پہ، اب سیکولر اداروں میں گریڈ 6 کے طلباء اگر مذہبی تعلیم پر ہر ہفتے کل 2 گھنٹے صرف کرتے ہیں، تو اسلامی اسکولوں کے طلباء مذہبی مضامین پر تدریسی وقت کا 25 سے 40 فیصد تک خرچ کرتے ہیں۔

تعداد اور اخراجات کا فرق

انڈونیشیا کے تمام نجی اسکولوں کا 60 فیصد اسلامی اسکولوں پر مشتمل ہے۔ یعنی کہ ملک کے آدھے سے زیادہ پرائیویٹ سکول اسلامی ہیں۔ اگرچہ ملک کے کچھ علاقوں میں سیکولر نجی اسکولوں کی طرف رجحان پایا جاتا ہے، مگر ان کا نصاب اور تعلیم کا منہج بالکل الگ ہے۔ پرائمری سطح پر تو ملک میں 43 فیصد اسکول اسلامی ہیں، جبکہ اس کے بعد مڈل اور ثانوی اسکولوں کی سطح پر اسلامی ادارں کا تناسب اور بھی زیادہ بڑھ جاتا ہے۔ اسلامی اور ریاستی اسکولوں کے مابین تعلیمی اخراجات کا فرق بھی پایا ہے، مگر یہ محدود ہے۔ پرائمری سطح پر، ایک طالب علم کا اسلامی اسکولوں میں تقریباً 20 ڈالر سالانہ خرچ آتا ہے، تو ریاستی اسکولوں کے لیے 21 ڈالر کے اوسط سالانہ اخراجات آتے ہیں۔ مڈل اسکول کی سطح پر، ریاستی اسکولوں میں سالانہ اخراجات اوسطاً 34 ڈالر اور مدرسے میں 29 ڈالر ہیں۔

ملائشیا: ایک متنوع سماج میں مذہبی تعلیم کی نوعیت

رشاد بخاری

دیگر متعدد مسلم ممالک کی طرح ملائیشیا میں دینی مداراس کا ہدف یہ ہے کہ خود اسلامی تعلیم کو کس طرح جدیدیت سے ہم آہنگ بنایا جائے، اور اس تعلیم سے کس طرح کے لوگ تیار کیےجائیں؟ اور یہ کہ اسلامی تدریس و تحقیق کے لیےمتاثر کن اہلیت رکھنے والےلوگوں کی کمی کوکیسے پورا کیا جائے؟ اس مقصد کےلیے بعض کلاسیکی اسلامی مضامین کے اور کچھ جدید مضامین کےمرکب کا تجربہ کرنے سے مفر نہیں ہے۔ ملائشیاکے مذہبی سکولوں سے نکلنے والے طلبہ، اسلامی اور عصری تعلیم کے دونوں دھاروں کا فہم رکھتے ہیں،اور بعد ازاں اپنے رجحان طبع کے تحت دینی یا دینوی علوم میں سے جس جانب جانا چاہیں سہولت سے جاسکتے ہیں۔ عام سرکاری سکولوں کی بہ نسبت ان کے طالب علم سماجی علوم کے ساتھ عربی، قرآن اور اسلامی تعلیمات کے وسیع فہم سے بھی روشناس ہوتے ہیں۔ اس لیے مدرسہ سسٹم کے لیے معاشرے میں خاصا احترام پایا جاتا ہے۔ اس میں مضمون میں ملائشیا کے مذہبی نظام تعلیم کا جائہ لیا گیا ہے۔مضمون نگار محقق اور ’انٹرنیشنل ریسرچ کونسل برائے مذہبی امور‘ کے ڈائریکٹر ہیں۔

نسلی و مذہبی تنوع اور تعلیم پر اثرات

1957 میں انگریزوں سے آزادی کے بعد ملائیشیا کو ’فیڈریشن آف ملایا‘ کے نام سے جانا جانے لگا۔ ملائیشیا کی آبادی مختلف نسلی گروہوں پر مشتمل ہے، جن میں مختلف تناسب کے ساتھ ملائی (51فیصد)، بومیپوٹیرا (15فیصد۔ یہ بھی مقامی گروہ ہے)، چینی (22فیصد)، ہندوستانی (7فیصد)، اور دیگر (0.8فیصد) نسلی قومیتیں شامل ہیں،اور ان سب کاالگ الگ مذہبی تشخص بھی ہے۔

چونکہ تنوع بہت زیادہ تھاجو نہ صرف نسلی تھا، بلکہ مذہبی بھی تھا،اس لیے ملائیشیا کی آزادی کے ابتدائی مرحلے میں ہی ایک بڑا متنازعہ مسئلہ مختلف نسلی گروہوں کے درمیان شہریت اور اس کی حیثیت کے سوال تھا۔ مقامی لوگوں کے ساتھ ملائی تشخص کواس زمین کاسب سے نمایاں حقدار تسلیم کیا گیا، تو چینی اور ہندوستانی لوگوں کی شہریت کے حق پر سوالیہ نشان لگ گیا۔ ایک تلخ کشمکش کے بعد مختلف

نسلی گروہوں کے درمیان ان کے سیاسی نمائندوں کے ذریعے ایک معاہدہ طے پایا۔ یہ معاہدہ ملائیشیا کے آئین کے آرٹیکل 153 میں لکھا گیا ہے، جس میں کہا گیا ہے کہ غیر ملائی باشندوں کو ملک کی شہریت دی جاتی ہے، اس شرط کے ساتھ کہ مالے گروہ کو تعلیم، عوامی خدمات اور تجارت کے میدان میں خصوصی حقوق حاصل ہیں۔

اس تاریخی رعایت و امتیاز کا ملائیشیا میں تعلیم کے ڈھانچے پر گہرا اثر نظر آتا ہے۔ ایجوکیشن ایکٹ (1961) میں ملائشیا کے قومی نصاب میں ملائی تشخص و زبان کو فوقیت دی گئی۔ نیز، ایکٹ 1961 کا مذہبی تعلیم کے نفاذ پر گہرا اثر پڑا۔ ایکٹ کے اجراء سے پہلے، اسلامی تعلیم ایک غیر رسمی سرگرمی تھی جو سکول کے اوقات میں شامل نہیں تھی۔ مگر اس ایکٹ اس کے نفاذ کے بعد یہ تبدیلی آئی کہ مذہبی تعلیم کو سکول کے اوقات میں اور سرکاری خرچ پر شامل کر دیا گیا۔ غیر مسلم طلبہ بھی یہ مذہبی تعلیم حاصل کر سکتے ہیں، لیکن صرف اس صورت میں جب والدین کی رضامندی موجود ہو۔

نسلی تنازعات اور جدید تعلیمی فلسفہ

13 مئی 1969 کو ہونے والے نسلی فسادات کے بعد حکومت نے کئی اقدامات کیے، تاکہ قومی سالمیت اور نسلی ہم آہنگی پیدا کرنے کی کوشش کی جائے۔ تب یہ رائے سامنے آئی کہ ملائیشیا کو اپنے لوگوں کو اتحاد میں رکھنے کے لیے ایک مضبوط قومی نظریے کی ضرورت ہے۔ انڈونیشیا کے نمونے سے متاثر ہو کر، ملائیشیا نے 1970 میں ایک نیا قومی نظریہ تیار کیا جسے 'رکن نگارا' (Rukun Negara) کے نام سے جانا جاتا ہے، جو کہ پانچ اصولوں پر مشتمل ہے: خدا پر یقین، بادشاہ اور ملک سے وفاداری، آئین کی پاسداری، قانون کی خود مختاری، اور حسنِ سلوک و اخلاقیات۔ بعد میں، یہ نیا نظریہ پرائمری اور سیکنڈری اسکول کے نصاب میں اخلاقی تعلیم کی بنیاد بن گیا۔ تعلیمی اداروں میں یہ اخلاقی تعلیم دراصل غیر مسلموں کے لیے شامل کی گئی تھی، یہ غیر مسلم طلبہ کے لیے لازمی ہے، اور مسلمان طلبہ کو اس سے استثنیٰ حاصل ہے کیونکہ وہ پہلے ہی اسلامی مذہبی تعلیم حاصل کر رہے تھے۔

1969 کے نسلی فسادات کے بعد ایک اور اہم پیش رفت بھی سامنے آئی۔ وہ یہ کہ مالے زبان کو تعلیم

کی واحد زبان بنادیا گیا، جبکہ اس سے قبل مالے کے ساتھ انگریزی بھی تعلیم کی بنیادی زبان تھی۔ یہ اقدام ظاہر ہے کہ تعلیم پر مالائی لوگوں کے بڑھتے ہوئے کنٹرول کی نشاندہی کرتا ہے۔ گویا نسلی بنیادوں پر جنم لینے والے فسادات نے مالے کو جہاں ایک نئی اقتصادی پالیسی اپنانے پر مجبور کیا، وہیں اس کے ساتھ ہی اس چیز نے ریاست پر مالائی تسلط کو واضح طور پر مزید گہرا کردیا۔ مگر وقت کے ساتھ سرکاری یونیورسٹیوں میں محدود نشستوں، داخلہ کی بلند شرح، اور بیرون ملک مہنگی تعلیم کی وجہ سے، 1980 کی دہائی کے اوائل سے تعلیمی پالیسی میں تبدیلی آئی۔ ایجوکیشن ایکٹ 1996 کے ذریعے حکومت نے نجی تعلیمی اداروں کے دروازے کھول دیے، اور اس کے ساتھ ہی یہ ایکٹ مالے کے علاوہ دیگر زبانوں میں بھی تعلیم کی اجازت دیتا ہے۔ ایکٹ 1996 کو ملک کی تاریخ کا سب سے جامع تعلیمی قانون سمجھا جاتا ہے۔

تب پہلی بار، ملائیشیا نے اپنا قومی تعلیمی فلسفہ لکھا:

> "ملائیشیا میں تعلیم مکمل اور مربوط انداز میں افراد کی صلاحیتوں کو مزید فروغ دینے کی ایک کوشش ہے تاکہ ایسے افراد پیدا کیے جا سکیں جو فکری، روحانی، جذباتی اور جسمانی طور پر متوازن اور ہم آہنگ ہوں، خدا پر پختہ یقین رکھتے ہوں۔ اس طرح کی کوشش ملائیشیا کے ایسے شہریوں کو پیدا کرنے کے لیے تشکیل دی گئی ہے جو باشعور اور قابل ہوں، جو اعلیٰ اخلاقی معیار کے حامل ہوں، اور جو لچکدار اور اعلیٰ درجے کی ذاتی فلاح و بہبود کے ساتھ ساتھ خاندان، معاشرے کی بہتری میں اپنا حصہ ڈالنے کے قابل ہوں۔"

مذہبی تعلیم کے ادارے اور ان کی اقسام

ملائشیا میں مذہبی تعلیم کی مانگ میں وقت کے ساتھ اضافہ ہوا ہے۔ اس کا ثبوت 'تحفیظ' اسکولوں کی بہت بڑی تعداد ہے جہاں قرآن حفظ کرایا جاتا ہے۔ ملک بھر میں تقریباً 1200 تحفیظ اسکول رجسٹرڈ ہیں۔ انہیں حکومت کی طرف سے مالی امداد فراہم کی جاتی ہے۔ ملائیشیا میں بچوں کی مذہبی تعلیم کے لیے کل وقتی مدارس سے لے کر ہفتہ وار قرآنی کلاسز تک کے مختلف اور متنوع ماڈل دستیاب ہیں۔ ان

لوگوں کے لیے جو زیادہ گہرائی کے ساتھ مذہبی تعلیم حاصل کرنے کے خواہاں ہیں،ان کے لیے وہاں پرائیویٹ مدارس ہیں جنہیں 'پونڈوک' یا' پیسنٹرین' کہا جاتا ہے۔اگرچہ پونڈوک اداروں کو قدامت پسند اور جدید علم سے محروم ہونے کی وجہ سے تنقید کا نشانہ بنایا جاتا ہے، لیکن وہ ملائیشیا میں مسلم کمیونٹی کے کچھ طبقات میں کافی مقبول ہیں۔

ملائشیا میں سرکاری سطح پر سکولوں کا ایک ایسا نیٹ ورک موجود ہے جو دینی تعلیم کے لیے خاص ہے۔یہ نیٹ ورک دو طرح کا ہے:

ایک 'قومی اسلامی ثانوی سکول'(Sekolah Menengah Kebangsaan Agama :SMKA) کے نام سے کام کرتا ہے۔یہ سکول ملائشیا کی وزارتِ تعلیم کے زیرِ اہتمام چلتے ہیں اور 1977 سے قائم ہیں۔دوسرے عام ثانوی اسکولوں کے مقابلے میں مختلف ہوتے ہیں۔یہ ان بچوں کے لیے قائم کیے گئے ہیں جو اسلامی ثقافت کو سیکھنا اور اس پر عمل کرنا چاہتے ہیں۔ان سکولوں میں نہ صرف عربی زبان اور قرآن کی تعلیم دی جاتی ہے بلکہ اس کے ساتھ فقہ اور دیگر مذہبی علوم بھی سکھائے جاتے ہیں۔ان اداروں کے طلبہ کے پاس یہاں سے اپنی گریجویشن مکمل کرنے کے بعد، مختلف شعبوں میں مقامی اور بین الاقوامی سطح پر اپنی تعلیم کو آگے بڑھانے کے مواقع موجود ہوتے ہیں۔یہ اسکول نہ صرف اسلامی مبلغ پیدا کرتے ہیں، بلکہ اسلامی علوم کے ماہرین بھی معاشرے کو فراہم کرتے ہیں۔ان مدارس میں داخلے کے لیے امیدوار کی عمر 13 سال سے زیادہ نہیں ہونی چاہیے،ناظرہ قرآن پڑھنا بھی آنا چاہیے۔جاوی رسم الخط میں مہارت ہونی چاہیے،لکھنے پڑھنے کی بنیادی صلاحیت موجود ہونی ضروری ہے اور اس کے علاوہ اسکول کا اپنا ایک ٹیسٹ ہوتا ہے جو پاس کرنا ضروری ہوتا ہے۔

دوسری قسم کے مذہبی اسکول جو حکومت کی طرف سے چلائے جاتے ہیں انہیں 'حکومتی فنڈڈ دینی اسکول'(Sekolah Agama Bantuan Kerajaan: SABK) کہا جاتا ہے۔یہ بھی ملائشیا کی وزارت تعلیم کے زیرانتظام چلتے ہیں۔ان اداروں کی شروعات بھی 1977 میں ہوئی تھی۔یہ اسکول پہلے ریاستوں کی سطح پر مقامی سرکاری ڈھانچے کے تحت چلتے تھے، مگر پھر مرکزی

حکومت نے اپنی سربراہی میں لے لیا تھا۔ پھر 1983 میں جب ریاستوں کے مرکزی حکومت کے ساتھ کچھ اختلافات ہوئے تو مرکزی حکومت نے ان اسکولوں کو فنڈز فراہم کرنے سے انکار کر دیا اور بند کرنے کا عندیہ دے دیا تھا۔ مگر پھر 2005 میں انہیں دوبارہ بحال کر دیا گیا اور ان کی مالی معاونت بھی مرکزی حکومت کی طرف سے جاری کر دی گئی۔ پورے ملائیشیا میں اب ان اسکولوں کی کل تعداد 219 کے قریب ہے۔ ان میں سے 41 کو پرائمری اسکولوں کا درجہ حاصل ہے اور باقی سب ثانوی درجے تک کے ہیں۔

ملائشیا میں سرکاری دینی مدارس کے تحت جہاں 90,000 طلبہ زیر تعلیم ہیں۔ یہ تعداد پورے ملک میں طلبہ کی کل تعداد (پانچ ملین) کا دو فیصد بنتی ہے۔ یہ قومی مذہبی اسکول وزارت تعلیم کے دائرہ اختیار میں آتے ہیں اور وفاق سے فنڈ حاصل کرتے ہیں اور حکومت کی طرف سے متعین کردہ قومی نصاب پڑھاتے ہیں۔

اس کے برعکس دوسری قسم نجی مذہبی اسکولوں کی بھی ہے، جن کی تعداد اس وقت ملک بھر میں تقریباً 350 ہے اور ان میں زیر تعلیم طلبہ کی تعداد ملائشیا کے کل طلبہ کا ایک فیصد ہے۔ نجی مذہبی اسکول ریاستوں اور وفاقی حکومت دونوں کے ساتھ رجسٹرڈ ہوتے ہیں اور عام طور پر شہری علاقوں میں ہوتے ہیں۔

مذہبی اداروں کا نصاب

عام طور پہ والدین کی خواہش ہوتی ہے کہ ان کے بچے ایک اچھی تعلیم حاصل کریں اور ان کی توقع ہوتی ہے کہ ان تعلیمی اداروں کے نصاب میں اسلامی علوم اور جدید مضامین دونوں شامل ہوں۔ ملائیشیا میں، اسلامی اسکولوں میں جو کچھ پڑھایا جاتا ہے، وزارت تعلیم اس کے لیے رہنما اصول طے کرتی ہے۔ نصاب میں عام طور پر تجوید، عربی زبان، اسلامی تاریخ اور فقہ کے ساتھ ساتھ سائنس، ریاضی، سماجی علوم اور انگریزی زبان کے اسباق شامل ہیں۔ ان اسلامی اسکولوں میں کھیل اور بحث و مباحثہ جیسی غیر نصابی سرگرمیاں بھی ہوتی ہیں۔ بہت سے اسکول طلبہ کو پیشہ ورانہ تربیت بھی

دیتے ہیں جس کے لیے تجارتی سرگرمیوں سے متعلق پروگرام کرانا، یا بڑی عمر کے طلبہ کے لیے انٹرنشپ کے لیے مقامی کاروباری کمپنیوں کے ساتھ شراکت داری شامل ہیں۔ ملائیشیا میں اسلامی اسکولوں کے نصاب کا مقصد طلباء کو مذہبی علم اور عملی مہارت دونوں میں ایک مضبوط بنیاد فراہم کرنا ہوتا ہے جو انہیں زندگی کے تمام پہلوؤں میں کامیابی کے لیے تیار کرے۔

مدارس میں تدریس کے طریقے

ملائیشیا کے اسلامی اسکول طلباء میں اسلامی اقدار وعلوم بارے فہم پیدا کرنے کے لیے روایتی اور جدید طریقوں کا استعمال کرتے ہیں۔ اساتذہ اسباق کو دلفریب اور دلکش بنانے کے لیے ملٹی میڈیا ٹولز جیسے ویڈیوز، آڈیوز، اینیمیشنز اور پریزنٹیشنز کا استعمال کرتے ہیں۔ طلباء ایسی سرگرمیوں میں بھی حصہ لیتے ہیں جو انہیں سیکھی ہوئی چیزوں کو عملاً پیش کرنے کا موقع فراہم کرتی ہیں۔ مثال کے طور پر، سماجی خدمات کے پروجیکٹس میں شامل کیا جاتا ہے جو انہیں یہ سمجھنے کے قابل بناتے ہیں کہ اسلام کو حقیقی زندگی میں کیسے لاگو کیا جا سکتا ہے۔ یہ تدریسی طریقے نہ صرف اسلام کی گہری تفہیم فراہم کرتے ہیں بلکہ طلبہ میں تنقیدی سوچ کی صلاحیت بھی پیدا کرتے ہیں جو آج کی دنیا میں کامیابی کے لیے ضروری ہے۔

مذہبی اداروں کی تنظیم میں حکومت کا کردار

ملائیشیا میں اسلامی تعلیم سے متعلق ضوابط کی نگرانی پوری طرح حکومت کرتی ہے۔ اس بات کو یقینی بنایا جاتا ہے کہ اسکول ان معیارات پر پورا اترتے ہیں اور ایک متوازن نصاب شامل درس کرتے ہیں۔ وزارت تعلیم نے پرائیویٹ اسلامی اسکولوں کے لیے بھی رہنما اصول مرتب کیے ہوئے ہیں جن پر عمل کرنا ضروری ہوتا ہے۔ اساتذہ کی اہلیت، تدریسی مواد، اور طلبہ پر مثبت و پیداواری اثرات کا جائزہ لیا جاتا ہے۔ ان رہنما خطوط کے علاوہ، حکومت اسلامی اسکولوں کا باقاعدہ معائنہ بھی کرتی ہے تاکہ ضوابط کی تعمیل کو یقینی بنایا جا سکے۔ حکومت کے پیش نظر یہ ہے دینی اداروں میں طلباء کو اعلیٰ معیار کی تعلیم حاصل ہو اور ساتھ ہی مذہبی ہم آہنگی کو بھی فروغ دیا جائے اور انتہا پسندانہ خیالات کو سکولوں

میں پڑھائے جانے سے روکا جائے۔ لہذا، والدین اس بابت پر اعتماد ہوتے ہیں کہ ان کے بچے ملائیشیا کے اسلامی اسکول میں داخلہ لیتے وقت ایسی تعلیم حاصل کر رہے ہیں جو مذہبی اور جدید، دونوں معیارات پر پورا اترتے ہیں۔

بعض غیر رجسٹرڈ اسلامی اسکولوں/مدارس کو درپیش چیلنجز

ملائیشیا میں بعض غیر رجسٹرڈ اسلامی اسکولوں کو درپیش کچھ عام چیلنجز یہ ہیں:

1. فنڈنگ: کئی اسلامی اسکول ایسے بھی ہیں جو محدود فنڈنگ اور وسائل کی کمی کا بھی شکار ہوتے ہیں، اس لیے معیار کے لحاظ سے وہ ان مدارس سے ذرا نیچے ہوتے ہیں جنہیں حکومت کی طرف سے فنڈنگ ملتی ہے۔

2. نصاب: جو مدارس یا اسکول رجسٹرڈ نہ ہوں ان میں نصاب کے حوالے سے مضامین کا تناسب غیر متوازن ہو سکتا ہے، جبکہ رجسٹرڈ مدارس میں دینی اور سیکولر مضامین کا باقاعدہ توازن رکھا جاتا ہے۔

3. اعلی تعلیم کا حصول: جو اسلامی اسکول ملائیشیا کی وزارت تعلیم کے ذریعہ تسلیم شدہ نہیں ہو سکتے ہیں، ان سے فارغ ہونے والے طلبہ کو بعد میں اعلی تعلیم حاصل کرنے میں مشکلات کا سامنا کرنا پڑ سکتا ہے۔

بعض اداروں کو درپیش ان چیلنجز کے باوجود، ملائیشیا میں اسلامی اسکول اور مدارس کی اکثریت معیاری تعلیم فراہم کر رہی ہے۔

ان رکاوٹوں کو سمجھ کر، آپ اپنے اختیارات کو بہتر طریقے سے نیویگیٹ کر سکتے ہیں اور اپنی تعلیم یا اپنے بچے کی تعلیم کے بارے میں باخبر فیصلے کر سکتے ہیں۔

ملائیشیا میں اسلامی تعلیم کا مستقبل

ملائیشیا میں دینی تعلیم کے فروغ اور ترقی کے حوالے سے مستقبل روشن نظر آتا ہے۔ ٹکنالوجی کی طرف پیشرفت اور جدید تدریسی طریقے اپنانے کی وجہ سے وہ ادارے سماج میں اپنی جگہ بنائے ہوئے ہیں۔ ملائیشیا کی حکومت ثقافتی ورثے کے تحفظ اور مذہبی اقدار کے فروغ کی اہمیت کو تسلیم کرتے ہوئے اسلامی تعلیم میں بھی بہت زیادہ سرمایہ کاری کر رہی ہے۔ جیسے جیسے دنیا تیزی سے ایک دوسرے سے جڑرہی ہے، ایسے افراد کی بھی مانگ بڑھتی جارہی ہے جو اسلام کے بارے میں گہری جانکاری رکھتے ہوں اور متنوع پس منظر کے لوگوں سے رابطہ قائم کرنے کے قابل ہوں۔ ملائیشیا میں اسلامی اسکول اور مدارس جہاں ایک طرف طلباء کو اسلامی علم میں ایک مضبوط بنیاد فراہم کرتے ہیں وہیں اس کے ساتھ وہ ان کے اندر تنقیدی سوچ پیدا کرتے ان میں اور انہیں جدید نقطہ نظر سے روشناس بھی کراتے ہیں، یوں وہ تعلیمی لحاظ سے ایک اچھے معیار پر قائم ہیں جو لوگوں کو پسند آتا ہے۔ ان تمام پہلوؤں کو دیکھتے ہوئے یہ کہا جاسکتا ہے کہ ملائشیا میں مذہبی اسلامی تعلیم کو کوئی خطرات لاحق نہیں اور مستقبل میں یہ ایسے ہی جاری رہے گی۔

مذہبی تعلیم کا بنگلہ دیشی ماڈل

تحمید جان

بنگلہ دیش میں دینی تعلیم دینے والے مدارس کی تعداد اس وقت اٹھارہ ہزار سے زائد ہے جن میں ساٹھ لاکھ کے لگ بھگ طلبہ اور طالبات تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ ان میں ساڑھے چھ ہزار مدارس وہ ہیں جو عوامی چندہ سے چلتے ہیں، ان مدارس کی تعداد بھی کم و بیش اتنی ہی ہے جنہیں حکومت کی طرف سے امداد دی جاتی ہے جو مختلف مدارج میں اخراجات کے اسی فیصد تک بھی جا پہنچتی ہے، جبکہ کچھ دینی مدارس ایسے ہیں جو صرف حکومت کے خرچہ پر قائم ہیں۔یوں تو بنگلہ دیش میں برصغیر کا روایتی مذہبی نظام تعلیم غالب ہے جیسے پاکستان اور بھارت میں، مگر بنگلہ دیش ماڈل کی کچھ خصوصیات ایسی بھی ہیں جو منفرد ہیں۔ اس مضمون میں ان خصائص کا جائزہ لینے کی کوشش کی گئی ہے۔ مضمون نگار سکالر و ترتیب کار ہیں اور امن و امان کے حوالے سے کام کرتے ہیں۔

بنگلہ دیش میں دینی تعلیم اور مدارس

بنگلہ دیش کے قیام کے بعد شیخ مجیب الرحمان کی حکومت نے ان دینی مدارس کو بند کرنے کا پروگرام بنایا تھا، ان مدارس پر الزام تھا کہ انہوں نے پاکستان کی حمایت کی ہے اور ان سے فارغ ہونے والے علماء بنگلہ قومیت کی بجائے اسلام کی بات کرتے ہیں۔ اس مقصد کے لیے ایک کمیشن قائم کیا گیا جس نے رپورٹ میں یہ سفارش کی کہ ان مدارس کو بند کر دیا جائے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی مجیب حکومت نے ایک عوامی سروے کا بھی اہتمام کیا جس کی رپورٹ حیران کن تھی کیونکہ اس کے مطابق ملک کے نوے فیصد عوام نے جن میں جدید پڑھے لکھے حضرات کی اکثریت تھی دینی مدارس کو بند کر دینے کی تجویز کی سختی کے ساتھ مخالفت کی تھی اور حکومت سے کہا تھا کہ وہ دینی مدارس کے ساتھ کسی قسم کی چھیڑ چھاڑ نہ کرے۔ اس سلسلہ میں بنگلہ دیش کے عوامی حلقوں میں یہ روایت بھی مشہور ہے کہ اسی دوران ایک روز مولانا عبدالحمید بھاشانی نے شیخ مجیب الرحمان کی گاڑی کو ایک سڑک پر جاتے ہوئے راستہ میں رکوا کر ان سے کہا کہ آپ کی بہت سی باتیں برداشت کرتا رہا ہوں اور اب بھی کر رہا ہوں مگر

دینی مدارس بند کرنے کی بات برداشت نہیں کروں گا اور اگر اس سلسلہ میں کوئی قدم اٹھایا گیا تو اس کی مزاحمت کے لیے میں خود میدان میں آؤں گا۔ چنانچہ شیخ مجیب الرحمان نے دینی مدارس پر ہاتھ ڈالنے کا ارادہ ترک کر دیا اور بنگلہ دیش میں دینی مدارس پوری آزادی اور پہلے سے زیادہ وسعت کے ساتھ دینی خدمات میں مصروف ہیں۔[1]

مدارس کے امور میں حکومت کا عمل دخل

بنگلہ دیش کے مدارس کی اکثریت جن میں ملک کے نمائندہ مدارس شامل ہیں؛ دیوبندی مکتب فکر سے تعلق رکھتی ہے۔ ''سلہٹ'' میں مولانا حسین احمد مدنی سے ارادت وعقیدت رکھنے والوں کی بڑی تعداد ہے۔ یہاں دو طرح کے مدارس پائے جاتے ہیں: قومی مدارس اور عالیہ مدارس۔ قومی مدارس ہندوستان کی طرز کے پرائیویٹ اور عوامی چندوں سے چلنے والے مدارس ہیں۔ جب کہ عالیہ مدارس کو حکومت امداد فراہم کرتی ہے۔ تقریباً تمام ہی قومی مدارس دیوبندی مکتب فکر سے تعلق رکھتے ہیں۔ بریلوی اور اہل حدیث مکتب فکر سے تعلق رکھنے والے افراد زیادہ تر عالیہ مدارس سے وابستہ ہیں۔ عالیہ مدارس پر حکومت بے تحاشا خرچ کرتی ہے تاکہ ان کے فضلاء کو مین اسٹریم میں لایا جا سکے۔ ان کے فاضلین کی اکثریت کو سرکاری ملازمت حاصل ہو جاتی ہے۔ اس کے مقابلے میں قومی مدارس کے ذمہ داران کسی بھی صورت میں حکومت سے امداد لینے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ اس کی وجہ وہی اندیشہ ہے کہ اس سے ان کی خود مختاری حکومتی زد میں آجائے گی اور حکومت کو ان کے معاملات میں مداخلت کا جواز حاصل ہو جائے گا۔

بنگلہ دیش میں درس نظامی کی باقاعدہ تعلیم دینے والے قومی مدرسوں کی تعداد آٹھ ہزار کے لگ بھگ بتائی جاتی ہے جبکہ وفاق المدارس العربیہ بنگلہ دیش کے نام سے جو سب سے بڑا وفاق ہے اس سے صرف پندرہ سو مدارس ملحق ہیں۔ اور اتحاد المدارس العربیہ کے نام سے دوسرے وفاق سے ملحق مدارس کی تعداد پانچ سو بتائی جاتی ہے۔

---

[1] - دینی مدارس روایت و تجدید، ڈاکٹر ممتاز

عالیہ مدارس کے فضلاء کو ملک یا ملک سے باہر اعلی تعلیم کے حصول اور زندگی کو بہتر اور خوشحال بنانے کے جو امکانات میسر ہیں وہ قومی مدارس کے فضلاء کو نہیں ہیں۔ بانی دارالعلوم دیوبند مولانا قاسم نانوتوی کے دارالعلوم دیوبند کے انتظام وانصرام کے حوالے سے طے کردہ آٹھ اصولوں (اصول ہشتگانہ) میں شامل اس اصل پر دیوبندی مکتب فکر کے مدارس کے ذمہ دار سختی کے ساتھ عمل پیرا ہیں کہ حکومت مدرسے کے حق میں حکومت کی طرف سے مالی تعاون کو قبول نہ کیا جائے۔ مدرسہ دیوبند کے فروغ واستحکام اور عوام کے ساتھ وابستگی میں اس نے اہم رول ادا کیا لیکن یہ یا اس طرح کے اصول کی معنویت ہر زمان ومکان کے لیے یکساں نہیں ہوتی۔

وہاں درس نظامی کے ابتدائی چار سالوں میں تمام ضروری عصری مضامین پڑھائے جاتے ہیں۔ بعض مدارس جن میں بنگلہ دیش کا سب سے بڑا ہزاری کا مدرسہ 'دارالعلوم معین الاسلام' شامل ہے؛ اس میں صنعت وحرفت کی تعلیم بھی شامل ہے۔ پہلے عربی سیکھنے کے لیے اردو پڑھائی جاتی تھی پھر فارسی اور اس کے ذریعہ عربی۔ اب یہ واسطے ختم کر دیئے گئے ہیں۔ ہندوستان میں اب بھی یہ صورتحال بہت سے مدارس میں برقرار ہے۔ عربی کی پہلی گرامر 'نحو میر' فارسی میں پڑھائی جاتی ہے۔

مدارس کی تعلیم کے شعبے میں کچھ نئے تجربے بھی کیے جاتے رہے ہیں جیسے ڈھاکہ کے ایک مدرسے کی تدریسی زبان انگریزی ہے۔ ڈھاکہ میں ہی 'مدرسۃ القرآن' کے نام سے تیسری صنف کیلئے حال میں ہی ایک مدرسے کا قیام عمل میں آیا ہے۔ قومی اور عالیہ دونوں مدارس کا اپنا وفاق ہے جو امتحانات اور دیگر امور سے متعلق معاملات کو طے کرتا ہے۔ ڈھاکہ کا مدرسہ 'دارالرشاد' صرف ان طلبہ کو داخلہ دیتا ہے جو پہلے Graduation کر چکے ہوں۔ بنگلہ دیش میں لڑکیوں کا سب سے پہلا مدرسہ 1972 میں قائم کیا گیا جس کے بانی مولانا عبدالملک حلیم ہیں جو دیوبندی مکتب فکر سے تعلق رکھتے ہیں۔ انہیں اس کی تحریک حجاز میں قیام کے دوران ملی۔ وہ مولانا تھانوی سے بھی متاثر تھے۔

بنگلہ دیش میں اب کئی مدارس کو حکومتی امدادی رقوم سے چلایا جا رہا ہے، جبکہ بدلے میں مدارس کی طرف سے حکومت کو نصاب میں تبدیلی جیسے اختیارات دیے گئے ہیں۔ بنگلہ دیشی حکومت کی طرف

سے یہ بھی مطالبہ کیا گیا ہے کہ بچوں اور بچیوں کو اکٹھے تعلیم حاصل کرنے کی اجازت دی جائے۔[2]

وہاں مکمل درس نظامی پڑھایا جاتا ہے اس میں سے 30 فیصد مدارس میں دورہ حدیث بھی ہوتا ہے 1993 میں ایسے مدارس کی تعداد صرف 12 یا 13 فیصد تھی جہاں دورہ حدیث کا انتظام تھا اس اضافے کی وجہ یہ ہے کہ اس سے پہلے بنگلہ دیش کے علماء کی بہت بڑی اکثریت درس نظامی مکمل کر کے دورہ حدیث کے لیے دیوبند جایا کرتی تھی۔ لیکن اب بنگلہ دیش میں مدارس نے خود دورہ حدیث کے انتظامات کئے ہیں۔ اس وقت صرف ڈھاکہ میں 28 مدارس ایسے ہیں جہاں دورہ حدیث ہوتا ہے قومی مدارس کے اساتذہ کی تعداد ایک لاکھ 30 ہزار اور طلبہ کی تعداد 14 لاکھ 62 ہزار 5 سو ہے۔

انگریزی زبان

تمام قومی مدارس میں انگریزی زبان لازمی قرار دی گئی ہے۔ اس وقت کوئی ایک بھی ایسا قومی مدرسہ نہیں ہے جس میں انگریزی زبان نہ پڑھائی جاتی ہو۔ ان مدارس میں انگریزی کی تدریس کے معیار میں ضرور فرق ہو گا، کسی میں بہتر ہے کسی میں کم بہتر، لیکن پڑھائی ہر جگہ جاتی ہے۔ ایک اہم بات یہ ہے کہ تمام قومی مدارس میں پرائمری ایجوکیشن تدریس کا حصہ بنادی گئی ہے۔ پہلے تو یہ ہوتا تھا کہ طلبہ کو براہ راست درس نظامی میں لیا جاتا تھا اب پرائمری تعلیم درس نظامی کا لازمی حصہ بن گئی ہے۔ جو بچہ پرائمری اسکول سے شروع کرتا ہے اسے سائنس سوکس جغرافیہ ،انگریزی زبان، بنگلہ زبان سب پڑھایا جاتا ہے۔ پرائمری کا یہ سارا نصاب پڑھ کے طالب علم درس نظامی میں جاتا ہے۔

میر پور ڈھاکہ میں ایک اور مدرسہ قائم ہے اس کا نام ہے ڈھاکہ کیڈٹ مدرسہ اس میں عام مضامین کے لیے ذریعہ تعلیم انگریزی ہے اور اسلامی علوم کے لیے عربی۔ ان کے طلبہ ڈھاکہ کہ یونیورسٹی کے گریجوایٹس سے بہت بہتر، ان کے علم کی وسعت بھی یونیورسٹی گریجوایٹس کے مقابلے میں بہتر ہے۔ ان کا خیال ہے کہ اس مدرسے کا گریجویٹ بنگلہ دیش کے چوٹی کے انگلش میڈیم اسکولوں کے گریجوایٹس کے مقابلے میں کھڑا ہو سکتا ہے۔

---

[2] - ڈاکٹر وارث مظہری

مدارس کے بورڈ

ایک اور تبدیلی جو آئی ہے وہ یہ کہ مدارس پاکستان کی طرح اپنے اپنے وفاق میں شامل ہیں۔اس وقت دو بڑے وفاق ہیں: ایک وفاق المدارس ہے۔ جس کا صدر مقام پوٹھیاں مدرسہ ہے جو چٹاگانگ کے پاس ہے، دوسرا انجمن اتحاد المدارس ہے جس کا صدر مقام ڈھاکہ میں ہے۔ ایک کے ساتھ ایک ہزار 5 سو اور دوسرے کے ساتھ 850 مدارس کا الحاق ہے۔یہ دونوں وفاق ہر سال کے امتحان الگ لیتے ہیں اور فائنل امتحان الگ لیتے ہیں۔ پورے بنگلہ دیش میں ایک وقت میں ہی امتحانات ہوتے ہیں۔امتحانی مراکز نگران اور سپر وائزرسب خود مقرر کرتے ہیں اور سندیں وفاق کی طرف سے دی جاتی ہیں۔ایک بڑی تبدیلی یہ ہوئی ہے کہ داخلے امتحان سب پیشہ وارانہ انداز سے ہو رہے ہیں۔ تین چار مدرسے ایسے ہیں جن کا سارا ڈیٹاData کمپیوٹر پر موجود ہے۔

ٹیکنکل ایجوکیشن

کئی مدارس میں ٹیکنکل ایجوکیشن بھی بڑی حد تک موجود ہے۔آٹھ ہزاری مدرسہ پورے برعظیم میں دوسرا بڑا مدرسہ ہے جو دیوبند سے 7 سال بعد قائم ہوا۔اس میں ٹیکنکل ایجوکیشن کا پورا انتظام ہے۔ طلبہ کو باقاعدہ جدید ٹیکنکل مضامین کی تعلیم دی جاتی ہے۔ پوٹھیاں مدرسہ جو 1937ء میں قائم ہوا اس میں بھی ٹیکنکل تعلیم دیا جاتی ہے۔ پوٹھیاں مدرسے میں تقریباً 50 فیصد طالب علم ایسے ہوتے ہیں جو فاضل گریجویٹ ہونے کے بعد کسی بھی ہسپتال میں جاکر میڈیکل پریکٹیشنز کے طور پر کام کر سکتے ہیں۔ہر طالب علم کو انجکشن لگانا آتا ہے۔ہر فرد بنیادی طبّی کورس کر چکا ہوتا ہے۔

قومی تعلیمی دھارے سے اشتراک

عالیہ مدرسے میں میٹرک،ایف اے،بی اے،ایم اے،ان چار سطحوں تک تعلیم دی جاتی ہے۔اسے داخلی عالم فاضل اور کامل کہتے ہیں بنگلہ دیش کی حکومت نے داخلی کو میٹرک کے اور عالم کو انٹرمیڈیٹ کے برابر تسلیم کر لیا ہے۔ نتیجتاً عالیہ مدرسے کے 80 فیصد گریجوایٹس قومی تعلیم کے

دھارے میں شامل ہو جاتے ہیں۔ یہ ڈھاکہ یونیورسٹی، چٹاگانگ یونیورسٹی اور راج شاہی یونیورسٹی میں داخلہ لے لیتے ہیں اور پھر اپنے اپنے مضامین میں ایم اے، بی اے کر لیتے ہیں۔ اس وقت بنگلہ دیش کی سول سروس، آرمی پرائیویٹ سیکٹر اور بنک کاری میں بہت بڑی تعداد ایسی ہی ہے جو عالیہ مدرسوں کے گریجوایٹس ہیں۔ وہ درس نظامی کے مکمل طور پر ماہر ہیں۔ مزید یہ کہ انھوں نے ایف اے بی اے سطح کے جدید مضامین بھی پڑھے ہوئے ہیں۔ اس وقت ڈھاکہ، راج شاہی، چٹاگانگ، جہانگیر، ان ساری یونیورسٹیوں میں فارسی اردو عربی اسلامی تاریخ اسلامیات ان تمام شعبوں کے 100 فیصد اساتذہ عالیہ مدرسوں کے گریجوایٹس ہیں۔ عالیہ مدرسوں سے بہت سے نامی گرامی لوگ نکلے ہیں۔ اس وقت بنگلہ دیش کے جو چوٹی کے اہل علم دانش ہیں ان کی خاصی بڑی تعداد عالیہ مدارس سے نکلی ہے۔

مذہبی عنصر کے قومی تعلیمی ڈھانچے پر اثرات

پچھلے دو ڈھائی عشروں کے دوران بنگلادیش میں دائیں بازو سوچ تیزی سے پروان چڑھی ہے۔ دائیں بازو نے سیکولرازم کی بات کرنے والے دانشوروں کا بہت مقابلہ کیا ہے۔ طرف بنگلادیشی معاشرے میں ایسی خواتین کی تعداد میں نمایاں اضافہ ہوا ہے جو پردے کی طرف مائل ہیں۔ وہ اب حجاب استعمال کرنے کو ترجیح دے رہی ہیں۔ مدارس میں پڑھنے والے بچوں کی تعداد میں بھی تیزی سے اضافہ ہوا ہے۔

بنگلادیش میں اسلامی تنظیمیں اپنی بات منوانے کے لیے غیر معمولی حد تک کوشاں رہی ہیں۔ حتی اب قومی تعلیمی دھارے پر بھی اثر انداز ہیں، اور اس میں کئی کتب کا نصاب بھی تبدیل کرایا ہے۔ بنگلادیش میں اسکول کی سطح کے نصاب میں اسلامی امور داخل کرائے گئے ہیں۔ سابق مشرقی پاکستان نے ۱۹۷۱ء میں پاکستان سے الگ ہو کر جب بنگلادیش کی شکل اختیار کی تھی تب اس ریاست کے قیام کا بنیادی مقصد سیکولرازم اور جمہوریت کو زیادہ سے زیادہ فروغ دینا تھا۔

بنگلادیش کے قیام کے دو ڈھائی عشروں بعد تک معاملات قابو میں رہے۔ سیکولر اور جمہوری روایات کا غلغلہ رہا۔ مگر اب چند برسوں کے دوران بنگلادیش میں اسلامی عنصر نے تیزی سے زور پکڑا

ہے۔اسلامی تنظیمیں بہت منظم ہو کر کام کر رہی ہیں۔ عوام کو بڑے پیمانے پر متحرک کرنے کے حوالے سے ان کی مہارت سے انکار کیا جاسکتا ہے نہ اسے نظر انداز کیا جاسکتا ہے۔ حکومت چاہے بھی تو اُنہیں غیر اہم قرار دے کر نظر انداز نہیں کر سکتی۔

درسی کتب میں تبدیلی کا مطالبہ سب سے پہلے ڈھاکا میں قائم ایک تنظیم حفاظتِ اسلام نے ۲۰۱۳ء میں کیا تھا۔ بنگلادیش میں اسلام اور سیکولرازم کے درمیان تناؤ ہر دور میں رہا ہے مگر ۲۰۱۳ء میں یہ تقسیم زیادہ نمایاں ہو کر سامنے آئی۔اِس سال مدارس کے ہزاروں طلبہ نے دارالحکومت ڈھاکا کے وسط میں جمع ہو کر مطالبہ کیا کہ الحاد کو فروغ دینے والے بلاگر کو سزا دی جائے، مجسمہ سازی پر پابندی عائد کی جائے اور درسی کتب میں اسلامی تعلیمات کی روشنی میں ناگزیر نوعیت کی تبدیلیاں کی جائیں۔ مدارس سے تعلق رکھنے والے علماء کرام نے حکومت کو چند تحریری تجاویز پیش کیں۔ ایک اہم تجویز یہ تھی کہ درسی کتب میں غیر ضروری طور پر پائے جانے والے غیر اسلامی نام خارج کر دیے جائیں۔ان کا استدلال تھا کہ توحید پرست معاشرے میں درسی کتب میں کوئی بھی غیر اسلامی نام غیر ضروری طور پر قبول نہیں کیا جانا چاہیے۔ ساتھ ہی انہوں نے یہ مطالبہ بھی کیا کہ درسی کتب میں لڑکوں اور لڑکیوں کے درمیان گفتگو پیش کرنے سے حتی الامکان گریز کیا جائے۔ حکومت نے مدارس کے علماء کرام کی طرف سے پیش کی جانے والی تجاویز اور مطالبات کو تسلیم کیا۔ مدارس میں پڑھائی جانے والی درسی کتب سے تمام ہندو، عیسائی اور دیگر غیر اسلامی نام خارج کر دیے گئے ہیں۔ لڑکوں اور لڑکیوں کے درمیان گفتگو بھی کتب سے نکال دی گئی ہے۔ایسی تمام تصاویر بھی درسی کتب سے نکال دی گئیں جن میں لڑکیوں کو برہنہ سر دکھایا گیا ہے۔ان کتب پر ٹیکسٹ بک بورڈ کے ہندو چیئرمین، پروفیسر نارائن چندر ساہا، کا نام بھی شائع نہیں کیا جاتا۔

خواتین کی مذہبی تعلیم:
رجحانات و تجربات

مسلم دُنیا میں خواتین کی تعلیم :
شرح خواندگی اور معاشی ترقی کے تناظر میں

شفیق منصور

مسلم دُنیاسے متعلق عام طور پہ یہ سمجھا جاتا ہے کہ یہ ایک ایسا خطہ ہے جہاں بڑے پیمانے پر لڑکیوں کی تعلیم میں پیش رفت کا فقدان ہے۔مگر اب صورتحال حقیقت میں یہ ہے کہ ترکی میں اسکول کی تعلیم میں صنفی فرق تقریبا ختم ہوچکا ہے۔ کویت، متحدہ عرب امارات، بحرین اور لیبیا میں، لڑکوں کے مقابلے میں زیادہ لڑکیاں سیکنڈری اسکول میں زیرتعلیم ہیں اور پرائمری کے درجے تک صنفی تناسب برابری کا ہے۔اس طرح کی کامیابی کی واضح مثالیں عرب دنیا سے باہربھی دیکھی جاسکتی ہیں۔ دنیا کے سب سے زیادہ آبادی والے مسلم ملک انڈونیشیا کے اندر سکولوں میں لڑکیوں اور لڑکوں کی یکساں تعداد ہے۔اس کے پڑوسی ملک ملائیشیا میں، تعلیم کے تقریباً تمام شعبوں میں لڑکے لڑکیوں سے پیچھے ہیں۔زیرنظر مضمون میں کچھ مثالوں کے تناظر میں اسلامی ضوابط، خواتین کی شرح خواندگی اور ترقی کے رجحانات کے باہمی تعلق پر بحث کی گئی ہے۔

اِس وقت مسلم دنیا کے کئی ممالک میں تعلیم کا صنفی امتیاز ختم ہو چکا ہے۔ملائیشیا نے تقریباً تین دہائیاں قبل ہی صنفی فرق کے مسئلے پر قابو پالیا تھا۔بنگلہ دیش میں بھی ایسا ہی نمونہ نظر آتا ہے جہاں پرائمری اور سیکنڈری اسکولوں میں لڑکیوں کی تعداد لڑکوں سے زیادہ ہے۔اس مسلم اکثریتی ملک میں نہ تو مذہبی قدامت پسندی اور نہ ہی کوئی اور وجہ لڑکیوں کو اسکولوں سے دور رکھ سکی ہے۔ 'گلوبل جینڈر گیپ انڈیکس' میں بنگلہ دیش 75 نمبر پر، سعودی عرب 127 پر، ایران 130 اور پاکستان 135ویں درجے پر آتا ہے۔اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ہم صنفی مساوات کے معاملے میں بنگاہ دیش سے کتنا نیچے ہیں۔

انڈونیشیا اور ملائیشیا کی کامیابی کی کہانیاں سبق ہیں کہ انسانوں پر کی جانے والی سرمایہ کاری بڑے نتائج

لاسکتی ہے۔ اور بنگلہ دیش ثابت کرتا ہے کہ اگر صنفی مساوات کو ترجیح دی جائے تو محدود اقتصادی صلاحیت کے باوجود تیز رفتار ترقی کا حصول ممکن ہے۔ یہ تینوں ممالک گویا یہ بھی ظاہر کرتے ہیں کہ مسلم معاشروں میں خواتین کی ترقی کی راہ میں نہ تو کم وسائل رکاوٹ بن سکتے ہیں اور نہ پدر سری نظام اس کا راستہ روک سکتا ہے۔ یہ چیز باقی مسلم دنیا کے لیے سبق یہ ہے کہ اگر ملک میں سب کے لیے تعلیم کے حصول پر سیاسی اتفاق رائے موجود ہو، تو اسکول کی تعلیم میں پائے جانے والے صنفی فرق کو کم کیا جا سکتا ہے۔ اس نوعیت کے اتفاق رائے کی کمی انتہا پسندی کو فروغ دے سکتی ہے اور ترقی کے سفر کو محدود کر سکتی ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ خواتین کو بااختیار بنانے کے امکانات بھی مزید محدود ہوتے جائیں گے۔

ملائیشیا میں خواتین کی تعلیمی شمولیت کے اثرات

لڑکیوں کی تعلیم کے حوالے سے ملائیشیا کا نقطہ نظر شروع میں زیادہ روایتی اور قدامت پسندی پر مبنی تھا۔ مگر جنوبی کوریا جیسی اعلیٰ کارکردگی دکھانے والی مشرقی ایشیائی معیشتوں کی کامیابی سے متاثر ہو کر ملائیشیا نے تعلیم کو سب کے لیے ترجیحی قرار دے دیا۔ ملائیشیا میں تعلیم کو عمومی حیثیت میں تو پہلے بھی کافی اہمیت حاصل تھی۔ معاشی شرح نمو میں دوگنے اضافے سے قبل بھی ملائیشیا کے تعلیمی اخراجات دوسرے ترقی پذیر ممالک کے مقابلے میں بہت زیادہ تھے۔ ورلڈ بینک کے ماتحت ادارے 'ورلڈ ڈویلپمنٹ انڈیکیٹرز' کے مطابق، 1970 تک ملائیشیا میں پرائمری اسکولوں میں خواتین کا مجموعی داخلہ نائیجیریا کے مقابلے میں تقریباً تین گنا زیادہ تھا۔ ملائیشیا کے اندر تعلیمی زمرے میں صنفی تفریق کے خاتمے، جمہوریت، ترقی اور مساوی معاشی امکانات نے ملک میں پر تشدد خیالات کو ختم کرنے میں مدد فراہم کی۔ یہ تجربہ بتاتا ہے کہ جمہوری اقدار، معاشی ترقی اور خواتین کی شمولیت شدت پسندی اور سخت گیر خیالات کی سطح کم کرنے میں معاون ثابت ہوتے ہیں۔

نائجیریا میں کیا ہوا؟

ملائیشیا میں مذہبی انتہا پسندی یا بوکو حرام جیسے "اسلامی" بنیاد پرست گروہ نہیں پھل پھول سکے، کیونکہ

عوام کو عملاً ترقیاتی پراسس کا حصہ بنادیا گیا۔ نائیجیریا میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ صحت اور تعلیم کی بنیادی خدمات سے طویل مدتی محرومی کا عکاس ہے۔ وافر قدرتی وسائل کے باوجود نائجیریا میں انسانی ترقی کبھی بھی ترجیح نہیں رہی۔ ملک کے تیل سے حاصل ہونے والے سرمایے کو سکولوں کی تعمیر اور شرح خواندگی کو بڑھانے کے لیے نتیجہ خیز طور پر استعمال نہیں کیا گیا۔ فعال جمہوری ڈھانچے کی عدم موجودگی، ناقص حکمرانی اور وسیع پیمانے پر بدعنوانی نے لوگوں میں داعیہ پیدا کیا کہ اسلامی نظام لایا جائے، اس سے ان چیزوں کا حل کیا جاسکتا ہے، مگر اصل میں اسلامی حکومت کے نام پر فعال گروہ آگے گئے، اور بوکو حرام جیسے انتہا پسند گروہوں کو پنپنے کا موقع ملا۔ بوکو حرام ابتدائی طور پہ نائیجیریا کے غریب ترین حصے میں ابھری، جہاں کی تقریباً تین چوتھائی آبادی انتہائی غربت میں زندگی گزار رہی ہے۔ نائیجیریا ان چند ترقی پذیر ممالک میں سے ایک ہے جہاں پرائمری اسکول جانے والے بچوں کی ایک بڑی تعداد اسکولوں سے باہر ہے۔

کیا شرعی حدود اور ضوابط خواتین کی تعلیم میں رکاوٹ بنتے ہیں؟

اِس وقت افغانستان کے اندر ایک حلقے میں یہ تاثر پیدا ہو گیا ہے کہ شاید شرعی نظام کا مطلب یہ ہے کہ خواتین کی تعلیم کو مکمل طور پہ ختم کردیا جائے۔ جبکہ ایک گروہ ایسا ہے جو حدود اور ضوابط کو لاگو کرنے کا مطالبہ کرتا ہے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ حدود اور ضوابط کے تحت تعلیم کو فی الوقت جاری رکھا جاسکتا ہے۔ شرعی نظام کے مطابق تعلیمی نظام پر زور دینے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ لڑکیوں کی تعلیم کا خاتمہ کیا جائے۔ طالبان رہنما اب لڑکیوں کی تعلیم کی ضرورت کو تسلیم کرتے ہیں، البتہ نظام میں مکمل صنفی علیحدگی پر اصرار کرتے ہیں۔ اس کی تصدیق کئی طالبان رہنماؤں کے بیانات سے ہوتی ہے جنہوں نے کہا کہ افغان خواتین بھی مردوں کی طرح یونیورسٹیوں میں جانے کا استحقاق رکھتی ہیں، البتہ اس شرط پر کہ یونیورسٹی کے کلاس روم الگ الگ ہوں اور اساتذہ کا بھی صنفی لحاظ سے الگ انتظام ہو۔ ان کے مطالبات میں تعلیمی اداروں کے اندر مخصوص لباس پر زور اور کھیلوں میں خواتین کی شرکت پر پابندی بھی شامل ہے۔

کیا صرف طالبان تعلیم میں شرعی ضوابط پر زور دیتے ہیں؟

طالبان اس دنیا میں اکیلے نہیں ہیں جو تعلیم کو مذہبی تناظر اور اقدار کی روشنی میں دیکھتے ہیں۔ اور لڑکیوں کے لیے ثقافتی طور پر ملکی وسماجی صورتحال کے مطابق تعلیم کا مطالبہ کرتے ہیں۔ بہت سے دیگر سرکردہ مسلم ممالک نے بھی اپنے ہاں مخلوط تعلیمی نظام پر پابندی لگا رکھی ہے اور پردہ لازمی قرار دے رکھا ہے۔ مثال کے طور پر، سعودی عرب میں، حکومت زیادہ تر صنفی اختلاط پر پابندی عائد کرتی ہے[1] اور یہاں تک کہ نجی بین الاقوامی اسکولوں کو بھی لڑکیوں کو مکمل طور پر صنفی علیحدگی والے ماحول میں تعلیم دینے کا پابند بنایا جاتا ہے۔ یونیورسٹی کی طالبات کے لیے فٹ بال جیسے کھیلوں کی بھی اجازت نہیں ہے۔ اس کے باوجود ان پابندیوں نے سعودی عرب میں خواتین کی تعلیم میں پیش رفت کو روکا نہیں ہے، اور وہاں اسکولوں اور یونیورسٹیوں میں لڑکے اور لڑکیوں کی یکساں تعداد پڑھتی ہے۔ اس کے علاوہ بھی کئی مثالیں ہیں کہ مسلم ممالک میں جہاں اسلامی تعلیم پر زور دیا جاتا ہے، مگر اس کے باوجود تعلیم میں صنفی برابری بھی دیکھی جاسکتی ہے۔ ایک مثال بنگلہ دیش کی بھی ہے، جہاں ہزاروں رجسٹرڈ مدارس کے ساتھ حکومتی شراکت داری کے سبب ثانوی تعلیم کی سطح پر صنفی برابری کا ہدف حاصل کیا گیا ہے۔ ایسے ہی دنیا کے سب سے زیادہ مسلم آبادی والے ملک انڈونیشیا میں بھی مذہبی مدارس نے خواتین کی تعلیم کے فروغ میں اہم کردار ادا کیا ہے۔

ایک اہم حقیقت یہ ہے کہ طالبان جب دوبارہ حکومت میں آئے ہیں تو ان کے سامنے ایک مختلف تعلیمی منظر نامہ سامنے تھا، جو اس سے بالکل مختلف ہے جیسا وہ چھوڑ کے گئے تھے۔ 2002 میں طالبان کی حکومت کے خاتمے کے بعد لاکھوں لڑکیاں اسکولوں میں واپس آئیں۔ اس دوران عوامی زندگی میں خواتین کی شراکت میں بھی اضافہ ہوا، سیاسی دفتر میں بھی ان کی بھرپور تقرریاں ہوئیں۔ حالیہ حکومت کی تبدیلی سے پہلے افغانستان کی آخری وزیر تعلیم ایک خاتون تھیں، محترمہ رنگینہ حامدی۔ یوں، کہا جاسکتا ہے کہ افغانستان کے اندر گزشتہ دو دہائیوں کے دوران اعلیٰ تعلیم میں خواتین

[1] - اگرچہ ابھی وقت کے ساتھ کچھ تبدیلیاں رونما ہی ہیں، لیکن مجموعی حیثیت میں وہاں تعلیمی شعبے میں اختلاط عام نہیں ہے۔

کی شراکت کی شرح میں بھی بہتری آئی تھی۔ لہذا، اب طالبان کے لیے بھی قدرے مختلف معاملہ ہے کہ وہ اس ساری پیش رفت کو بالکلیہ ختم نہیں کر سکتے اور سوچنے پر مجبور ہیں کہ خواتین کو تعلیم کے شعبے میں امکانات میسر کرنے پڑیں گے۔ اب نہ صرف بیرونی دباؤ ہے، بلکہ ملک کے اندر بھی خدشات پائے جاتے ہیں جنہیں افغان طالبان نظر انداز نہیں کر سکتے۔

اگرچہ گزشتہ دو دہائیوں کے دوران افغانستان میں خواتین کی تعلیم کے معاملے میں خاطر خواہ تبدیلی آئی، لیکن بہر حال جتنا اس شعبے کے لیے خرچ کیا گیا اور جو اہداف مقرر کیے گئے تھے وہ پھر بھی حاصل نہیں ہو سکے تھے۔ وجہ جنگی صورتحال، کمزور گورننس اور کرپشن تھی۔ افغانستان میں جنگ کے حالات، عوامی سطح پر غربت اور پہلے سے تعلیمی ڈھانچے کی عدم موجودگی کے باعث لڑکیوں کی تعلیم بہت متاثر رہی۔ 2001 سے افغانستان کی تعمیر نو کے لیے 2 ٹریلین امریکی ڈالرز کی سرمایہ کاری کے باوجود ملک میں دو تہائی لڑکیاں ثانوی تعلیم سے محروم رہیں۔ افغانستان اب پرائمری تعلیم میں صنفی برابری کے حوالے سے اس مقام پر ہے جہاں تیس سال پہلے ہندوستان تھا۔ مگر حالیہ پابندیوں کے بعد خواتین کے لیے تعلیم کے مسائل اور بھی زیادہ ہیں۔

کامیاب مثالیں

بہت سے مسلم والدین کے لیے یہ قابل قبول ہوتا ہے کہ، لڑکیاں دینی مدارس میں تعلیم حاصل کر لیں۔ پدرانہ معاشروں میں سماجی روایات کے سبب خواتین کی گھر سے باہر نقل و حرکت پر پابندی ہوتی ہے، مگر دینی مدارس ایک ایسی جگہ ہیں جہاں سے خواتین کی شرح خواندگی کو بڑھایا جاسکتا ہے، اور اس کے لیے کامیاب مثالیں موجود ہیں۔ یہ دینی مدارس سماجی روایات کو توڑے بغیر تعلیم حاصل کرنے کا موقع فراہم کرتے ہیں۔ کیونکہ پردے کا خیال کرتے ہوئے لڑکیوں کے مدرسوں میں جانے کو گاؤں کے معاشروں میں مخالفت کا سامنا نہیں کرنا پڑتا۔

بنگلہ دیش کے اندر رجسٹرڈ دینی مدارس کی بڑی تعداد ہے جہاں گزشتہ کچھ سالوں کے دوران خواتین کے داخلوں میں بہت زیادہ اضافہ ہوا۔ دینی مدارس کی طرف سے ریاست پر کیے جانے والے انحصار

نے، بنگلہ دیش میں عالیہ مدارس میں پچھلی دو دہائیوں کے دوران ثانوی اسکولوں میں خواتین کے اندراج میں بڑا اضافہ کیا ہے۔

تاریخی طور پر، بنگلہ دیش میں زیادہ تر مدارس مردوں کے لیے تھے۔ 1990 کی دہائی کے اوائل تک، بنگلہ دیش میں لڑکیوں کے تعلیمی اندراج کی مجموعی سطح انتہائی کم تھی۔ اُس وقت تک ثانوی سطح پر مدارس کے اندر خواتین کے اندراج کی شرح 7.7 فیصد تک تھی۔ 1994 میں 'فیمیل سیکنڈری سکول سکالرشپ پروگرام' (FSSSP) کے متعارف کرانے کے بعد، حکومت نے طالبات کے لیے عالیہ مدارس کھولنے کی ترغیب دی اور ان کے لیے مالی مراعات کا اعلان کیا۔ محض ایک دہائی کے اندر ہی پانسہ پلٹ گیا، اور 2008 تک، حکومت کے ساتھ اندراج شدہ ثانوی مدارس کے طلبہ میں سے تقریباً نصف لڑکیاں تھیں۔ اسی عرصے کے دوران، 'فیمیل سیکنڈری سکول سکالرشپ پروگرام' (FSSSP) کی وجہ سے، رجسٹرڈ مدارس میں خواتین اساتذہ کی تعداد میں بھی اضافہ دیکھا گیا۔ وقت کے ساتھ ساتھ نہ صرف خواتین کے اندراج کی شرح میں مسلسل اضافہ ہوا ہے، بلکہ آج رجسٹرڈ پرائمری دینی مدارس میں لڑکوں کے مقابلے لڑکیاں زیادہ ہیں۔ یہاں تک کہ غیر رجسٹرڈ شدہ مدارس میں بھی، 24% داخلہ لینے والی لڑکیاں ہیں۔

مدارس کے اندر صنفی مساوات کا ایسا ہی رجحان انڈونیشیا کے معاملے میں بھی دیکھا گیا ہے۔ تمام تعلیمی درجات میں، ریاست کے ساتھ رجسٹرڈر مدارس میں صنفی برابری واضح ہے، بلکہ اعلیٰ اور ثانوی تعلیمی درجات میں، لڑکوں کی تعداد لڑکیوں کے مقابلے میں کم ہے۔

ملائیشیا میں بھی ریاست کی طرف سے تسلیم شدہ دینی مدارس میں بھی اسی طرح کا رجحان نظر آتا ہے۔ پرائمری اور ثانوی دونوں سطح پر صنفی توازن موجود ہے۔ تاہم، غیر رجسٹرڈ شدہ روایتی دینی مدارس میں صنفی حوالے سے تناسب کا کوئی ڈیٹا دستیاب نہیں ہے، کیونکہ یہ مدارس زیادہ تر کوئی واضح ریکارڈ یا ڈیٹا نہیں رکھتے۔

مدارس کا خواندگی اور خواتین کی سماجی فعالیت پر اثر

اگرچہ دینی مدارس میں تعلیم تک رسائی لڑکیوں کو بااختیار بنانے کی صلاحیت رکھتی ہے، لیکن اصل میں بہت کچھ مدارس میں فراہم کی جانے والی تعلیم کی نوعیت اور ساخت پر منحصر ہے۔ تاہم، مجموعی نتائج کی روشنی میں دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ثانوی سطح کے دینی مدارس میں لڑکیوں کے بڑھتے ہوئے اندراج نے ایشیا کے قدامت پسند علاقوں میں خواتین کی نقل و حرکت پر سماجی پابندیوں کو کم کرنے میں مدد دی ہے۔ اس طرح، مدارس کا سماجی اثر محض خواندگی کے درجے سے کچھ آگے بڑھ جاتا ہے، کیونکہ پردے میں ہونے کے باوجود، معاشرے میں خواتین کی نقل و حرکت میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ دوسری طرف، ایک اور مختلف پہلو یہ ہے کہ خواتین کو اپنی ذاتی پسند سے ماورا مخصوص لباس قبول کرنے کا پابند بنایا جاتا ہے، جو ایک روایتی پدرانہ سماجی ڈھانچے کو مضبوط بنانے کی شکل ہے۔ اس کے ساتھ ہی کئی مدارس اس پر بھی زور دیتے نظر آتے ہیں کہ خواتین تعلیم حاصل کرنے کے بعد بھی گھرداری کو ترجیح دیں۔

جنوبی ایشیا کے مقابلے، جنوب مشرقی ایشیا میں تعلیمی سطح پر صنفی عدم مساوات کم ہے۔ انڈونیشیا اور ملائیشیا میں صنفی تناسب متوازن ہے اور ہندوستان اور پاکستان میں یہ توازن کافی متاثر ہے۔ دینی مدارس کے پھیلاؤ اور ان کی پالیسیوں میں علاقائی تغیرات اور حالات کا بھی بڑا عمل دخل ہے۔ جیسا کہ پہلے ذکر کیا گیا، غریب اور کمزور معاشروں میں، دینی مدارس خواتین کے اسکولوں کی محدود تعداد کے چیلنج پر قابو پانے میں مدد کرتے اور متبادل بنتے ہیں۔ چونکہ بہت سے علاقوں میں ان مدارس کی تعداد کم ہے، سہولیات موجود نہیں، تو ان کی محدود مالیاتی صلاحیت کے پیش نظر، عالمی بینک اور ایشیائی ترقیاتی بینک جیسے بین الاقوامی ترقیاتی اداروں نے بھی ان مدارس کے ساتھ حکومتی اور نجی اداروں کی شراکت داری کی وکالت کی ہے، تاکہ ان علاقوں میں خواتین کی شرح خواندگی کو بڑھایا جا سکے۔

بہت سے ایشیائی ممالک کی حکومتوں نے پسماندہ کمیونٹیز سے تعلق رکھنے والی خواتین تک رسائی کے لیے غیر ریاستی اداروں اور نمائندگان کے ساتھ تعاون کیا ہے اور ان کے ساتھ شراکت داری قائم کی

ہے۔ آج، بہت سی جگہوں پر مدرسہ نظام تعلیم کے حصول کے لیے کم لاگت کے پلیٹ فارم کے طور پر کام کرتا ہے اور مسلم اکثریتی ممالک میں شرح خواندگی میں صنفی مساوات کو بہتر بنانے کا سبب ہے۔ تاہم اس معاملے میں زیادہ سے زیادہ یہ کوشش کرنے کی ضرورت ہے کہ شراکت داری کی پالیسی میں خواتین کے لیے زیادہ سے زیادہ مراعات اور کام کرنے کے حوالے سے امکانات کو بڑھایا جائے۔

پاکستان اور افغانستان جیسے مسلم اکثریتی ممالک کی طرح، انڈونیشیا اور بنگلہ دیش جیسے بڑے ممالک میں بھی مدارس بڑی تعداد میں کام کرتے ہیں۔ نسبتاً دیکھا جائے تو ملائیشیا جیسے ممالک میں، ان کی موجودگی اگرچہ ہے، مگر محدود ہے۔ بنگلہ دیش اور انڈونیشیا، تو ایسی دو بڑی کامیاب مثالیں ہیں کہ جہاں ریاستی شراکت داری کے ساتھ مدارس کے پلیٹ فارم سے پرائمری اور ثانوی تعلیم میں صنفی فرق کو کم کیا گیا ہے۔ ایشیا کے کئی علاقوں میں جہاں غربت کی شرح زیادہ ہے اور کچھ جگہوں پر سرکاری اسکولوں کی تعداد کم ہوتی ہے، تو وہاں خواتین کی بنیادی تعلیم کے لیے مدارس ایک اہم متبادل ذریعہ سمجھے جاتے ہیں۔ ایسے ہی، ایشیا کے جن ممالک میں سرکاری اسکولوں کا معیار تسلی بخش نہیں ہے، وہاں بھی دینی مدارس ایک نمایاں متبادل ہیں، جو نہ صرف پدرسری مزاج کے خلاف نہیں ہیں اور لوگ ان پر اعتماد کر لیتے ہیں۔

البتہ اعداد و شمار اور رپورٹس یہ بتاتی ہیں کہ غیر رجسٹرڈ مدارس میں صنفی مساوات کا تناسب رجسٹرڈ مدارس کے مقابلے میں کم ہے۔ ایک تو اس لیے کہ ان کے پاس سہولیات کم ہیں، اور ان کے پاس خواتین اساتذہ کی مناسب تعداد بھی نہیں ہوتی۔ تعلیم و تدریس کے لیے اساتذہ کی بہتر تربیت کی کمی بھی ایک وجہ ہے، اور اس کے ساتھ یہ بھی مسئلہ ہے کہ غیر رجسٹرڈ مدارس میں صنفی تعصب پر مبنی نصاب شامل ہوتا ہے۔ جبکہ مڈل کلاس خواتین کو دینی روایات کے مطابق پڑھانا بھی چاہتی ہے اور صنفی تعصب کو بھی ختم کرنا چاہتی ہے۔ یہ رجسٹرڈ مدارس وہ ہیں جو حکومت کے ساتھ شراکت داری کرتے ہیں، جیسا کہ انڈونیشیا اور بنگلہ دیش میں۔ اگر دینی مدارس میں اساتذہ خواتین ہوں، اور سہولیات بھی اچھی ہوں تو نتائج سے ثابت یہ ہوا ہے کہ اس سے صنفی تعلیم کے فرق کو ختم کیا جا سکتا ہے۔

خواتین کی تعلیم کے فروغ میں مدارس اور این جی اوز شانہ بشانہ: بنگلہ دیش کا منفرد ماڈل

رباب زینب

1990 کی دہائی کے بعد سے بنگلہ دیش نے نے اپنے ہاں صنفی مساوات کے تناسب کو بہتر بنانے میں نمایاں پیش رفت کی ہے۔بنگلہ دیش میں 2015 سے پہلے ہی پرائمری اور سیکنڈری اسکولنگ میں صنفی برابری کے بین الاقوامی معیار کے ہدف کو حاصل کر لیا گیا۔ اب یہ ایک ایسا ملک ہے جو ثانوی تعلیم تک خواتین کی تعلیم کے لیے مواقع فراہم کرنے کے حوالے سے مسلم دنیا کے کئی ممالک کے لیے ایک اہم مثال بن گیا ہے۔توجہ طلب امر یہ ہے کہ اس مقصد کے حصول کے لیے جو طریق کار اور ماڈل اختیار کیا گیا اور اس کی حوصلہ افزائی کی گئی وہ کافی منفرد ہے۔ یوں کہہ سکتے ہیں کہ اس ضمن میں بنگلہ دیش کی حکومت نے بھی جہاں کوششیں کیں، وہیں اس کے ساتھ بڑا کردار نجی تعلیمی سیکٹر کا رہا ہے۔زیرنظر مضمون میں نجی تعلیمی سیکٹر کے اثرات کا جائزہ لیا گیا ہے۔ مضمون نگار ’وائس میڈیا نیٹ ورک‘ کی سربراہ ہیں۔

دو متوازی نظامِ تعلیم ایک ساتھ

نجی تعلیمی سیکٹر جس کے سب ملک میں تعلیمی سطح پر صنفی تفریق ختم ہوئی،اس میں حیران کن طور پر دو متوازی نظام تعلیم شامل حال رہے ہیں۔ پرائمری سطح کی تعلیم تک این جی او کے شعبے نے نمایاں کردار ادا کیااور اس کے بعد ثانوی درجے تک دینی مدارس کا کردار اہم رہاہے۔اور یہ جو تعلیمی انقلاب آیااس کا دورانیہ نوے کی دہائی سے لے کر موجودہ وقت تک کا ہے۔ 1980 کی دہائی کے دوران بنگلہ دیش میں رجسٹرڈ مدرسوں میں زیادہ تر تعداد لڑکوں کی تھی- مدارس میں تعلیم حاصل کرنے والی خواتین کی تعداد محض 7 فیصد تھی۔ تاہم، یہ منظر نامہ صرف ایک دہائی کے اندر تبدیل ہوگیا۔1990 کی دہائی کے دوران تعلیمی اداروں میں خواتین کے اندراج میں تیزی آئی۔ مدارس میں خواتین کی تعداد جو کل طلبہ کا 7 فیصد تھی 1990 کے بعد بڑھ کر سال 2008 میں 52 فیصد ہو گئی۔. رجسٹرڈ غیر

سرکاری ثانوی مدارس اور اسکولوں میں آج ہر لڑکے کے مقابلے میں ایک لڑکی کا داخلہ ہو رہا ہے۔

'دیہی ترقیاتی کمیٹی برائے بنگلہ دیش'

مدارس سے ہٹ کر، پچھلی دو دہائیوں کے دوران ملک میں این جی اوز کے تحت چلنے والے پرائمری اسکولوں میں بھی غیر معمولی اضافہ دیکھا گیا۔1990 کی دہائی کے اوائل سے لے کر اب تک این جی او اسکولوں کی تعداد میں چار گنا اضافہ ہوا ہے اور آج ملک میں پرائمری اسکولوں میں داخل ہونے والے بچوں کی ایک بڑی تعداد اسی نجی سیکٹر کے تعلیمی اداروں سے تعلق رکھتی ہے۔

بنگلہ دیش میں نجی تعلیمی ادارے چلانے والی سب سے بڑی این جی او 'دیہی ترقیاتی کمیٹی برائے بنگلہ دیش' (Bangladesh Rural Advancement Committee:BRAC) ہے۔ بنگلہ دیش میں پرائمری اسکول کے شعبے میں داخلے کا تقریباً 80 فیصد حصہ سرکاری اور ریاستی امداد یافتہ غیر سرکاری اسکولوں میں ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ غیر سرکاری تنظیمیں کام کرتی ہیں جو ملک کے پسماندہ اور معاشی طور پہ کمزور گروہوں کے لیے غیر رسمی اسکولوں کا نیٹ ورک چلاتی ہیں۔ بنگلہ دیش میں 400 سے زیادہ این جی اوز لوگوں کو بنیادی تعلیم فراہم کرنے کے کام سے وابستہ ہیں۔ BRAC ملک کی سب سے بڑی این جی او ہے جو پرائمری تعلیم کے فروغ پر کام کر رہی ہے اور یہ این جی او نجی سطح پر چلنے والے پرائمری سکولوں کے 76 فیصد ادارے چلاتی ہے۔ BRAC کا غیر رسمی پرائمری تعلیم پروگرام 1984 میں 22 تجرباتی اسکولوں کے ساتھ شروع ہوا تھا۔ یہ پروگرام ان دیہی علاقوں میں شروع کیا گیا جہاں تعلیم کے کوئی مناسب انتظامات نہیں تھے۔ 1990 کی دہائی کے آخر تک، اس ادارے نے تقریباً 35000 اسکول کھول لیے تھے جو ملک کے کل 84000 دیہاتی علاقوں میں سے 50000 علاقوں تک پھیلے ہوئے تھے۔ 2008 تک یہ ادارے 38000 تک ہو گئے، جن میں دس لاکھ سے زیادہ بچے تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ BRAC اسکولوں کی متعدد امتیازی خصوصیات ہیں۔ ایک تو وہ ترجیحی طور پہ ان بچوں کو لیتے ہیں جو پہلے کبھی سکول نہیں گئے ہوتے، یا جنہوں نے اسکول چھوڑ دیا ہوتا ہے۔ مدارس کی طرح، یہ ادارہ بھی بچوں کے زیادہ تر تعلیمی

اخراجات خود برداشت کرتا ہے۔اس کے پرائمری اسکولوں میں طلباء کی اکثریت غریب ترین آبادی سے ہوتی ہے۔دوسرا، ان اسکولوں میں پڑھنے والے 70فیصد طلبہ لڑکیاں ہوتی ہیں۔ تیسری خصوصیت یہ ہے کہ ،BRAC اسکولوں میں تدریس سے وابستہ 97فیصداساتذہ خواتین ہیں جو اسی گاؤں سے ہوتی ہیں جہاں اسکول واقع ہوتا ہے۔

ثانوی تعلیم اور خواتین کے مدارس

بنگلہ دیش میں پرائمری درجے تک تو بہت سے ایسے اسکول موجود ہیں، مگر ثانوی سطح پر این جی او سکولوں کی کوئی خاص موجودگی نہیں ہے۔ بلکہ ثانوی تعلیم سرکاری اسکولوں میں،اور سرکاری امداد یافتہ اسکولوں اور مدارس کے ذریعہ فراہم کی جاتی ہے۔ سرکاری اعداد و شمار کے ریکارڈ کے مطابق،جو دینی مدارس ثانوی سطح کی تعلیم فراہم کررہے ہیں وہ بنگلہ دیش کے کل ثانوی اسکولوں کالگ بھگ 32 فیصد بنتا ہے۔یہ سب رجسٹرڈ مدارس ہیں جنہیں ریاست امداد فراہم کرتی ہے۔دیہی علاقوں میں ثانوی تعلیم پانے والے 90فیصد طلبہ مدارس سے ہوتے ہیں۔

بنگلہ دیش میں آج 90فیصد سے زیادہ رجسٹرڈ ثانوی مدارس طلباء کو داخلہ دیتے ہیں اور ان میں داخلہ لینے والے طلباء میں سے نصف لڑکیاں ہوتی ہیں۔

خواتین کے مدارس میں اضافے کے اسباب

دینی مدارس میں خواتین کے داخلوں میں اضافے کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ سابقہ مردانہ، غیر رجسٹرڈ مدارس کی ایک بڑی تعداد کو حکومتی رجسٹرڈ مراکز میں تبدیل کر دیا گیا۔ سب سے پہلے، حکومت نے ان رجسٹرڈ مدارس میں اساتذہ کی تنخواہ کی ذمہ داری اٹھالی،اور نصاب میں جدید مضامین شامل کرنے کی شرط عائد عائد کردی۔اس کے ساتھ ہی حکومت نے بنگلہ دیش کے دیہی علاقوں میں ثانوی تعلیم میں داخلہ لینے والے طلبہ کے گھرانوں کے لیے چھوٹاسا مشروط وظیفہ مقرر کردیادیا،تاکہ وہ اپنی بیٹیوں کو کسی بھی رجسٹرڈ تعلیمی ادارے (سرکاری، نجی، مذہبی) میں بھیج سکیں۔اس ضمن میں داخلہ لینے، باقاعدہ حاضری،اور پاسنگ گریڈ کی کچھ شرائط عائد کردی گئی تھیں۔مزید برآں اس پراجیکٹ کا حصہ

بننے والے ہر ادارے کے لیے حکومت نے خواتین کی تعداد کے لحاظ سے مالی امداد جاری کر دی۔اس ترغیب کے بعد وہ مدارس جو پہلے صرف مرد طلبہ کے لیے مخصوص تھے،وہ بھی زیادہ سے زیادہ خواتین کی تعلیم کے لیے اپنے دروازے کھولنے لگے۔

بنگلہ دیش میں نصابی اصلاحات کی اسکیم جو اصل میں 1980 کی دہائی کے اوائل میں شروع کی گئی تھی اس نے روایتی دینی مدارس کے ڈھانچے کو تبدیل کرنے میں مدد دی۔یہ مدارس پہلے بہت کوشش سے عوام سے فنڈز اکٹھا کرتے تھے،اور جدید مضامین کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں تھے۔مگر اصلاحاتی اسکیم کے بعد 1980 سے 1994 کے درمیان رجسٹرڈ ہونے والے مدارس میں اضافہ ہوااور نصاب میں بھی تبدیلی آنے لگی۔1994 کے بعد کے سالوں میں،خواتین طالبات کے داخلوں میں بھی حیران کن اضافہ ہونے لگا۔وہ مدارس جو صرف لڑکوں کو تعلیم دے رہے تھے،اب لڑکیوں کو بھی ترجیح دینے لگے۔یہاں تک کہ 2008 تک، مدارس میں ثانوی تعلیم کے شعبے میں خواتین کے داخلوں میں 35 فیصد تک اضافہ ہو گیا۔

یہ بھی قابل توجہ ہے کہ،ملک میں سیکولر تعلیمی اداروں کے مقابلے مدرسوں میں خواتین کے اندراج میں اضافہ کئی گنا زیادہ ہے۔یہ پاکستان جیسے مسلم جنوبی ایشیائی ممالک کے لیے ایک سبق ہے کہ جہاں دینی مدارس کی ایک بڑی تعداد ہونے کے باوجود ان میں خواتین طلبہ کی تعداد بہت کم ہے،اور نصاب بھی اب تک پرانااور روایتی ہے۔لہٰذا، مدارس میں خواتین کے اندراج میں اضافے کی نوعیت اور عمل کو سمجھنے کے لیے بنگلہ دیش کے نظام کو سامنے رکھنا بہت ضروری ہے۔یہ نتائج بنگلہ دیش کے دیہی علاقوں میں تعلیمی شعبے کے اندر صنفی تفاوت کو کم کرنے میں مذہبی اداروں کے کردار کو بھی واضح کرتے ہیں۔

حکومت کی اس پالیسی اور اسکیم کے کامیاب ہونے کی وجہ صرف یہ نہیں تھی کہ اس نے مدارس کو فنڈز کی فراہمی کا معاہدہ کیا، بلکہ کئی عوامل مل کر اس ماڈل کو کامیاب بناتے ہیں۔ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ دیہی علاقوں میں دینی مدارس کو لڑکیوں کی تعلیم کے لیے محفوظ سمجھا جاتا ہے اور والدین ان پر اعتماد کرتے ہیں۔اسی طرح یہ بھی وجہ ہے کہ غریب اور دیہی علاقوں کے گھرانے ویسے بھی دینی

تعلیم کی طرف زیادہ مائل ہوتے ہیں۔ پھر اس کے ساتھ ان گھرانوں کی مالی معاونت بھی ایک سبب ہے۔

بہر حال، بنگلہ دیش مدارس کی تعلیم، خصوصا خواتین کے حوالے سے مسلم دنیا کا ایک منفرد ماڈل رکھتا ہے جو ان ممالک کے لیے استفادے کے کئی مواقع رکھتا ہے جو خواتین کی تعلیم اور ان کی شرح خواندگی میں اضافہ چاہتے ہیں۔

ترکی میں خواتین کی دینی تعلیم: رجحانات اور خدمات

بشریٰ علی

سلطنت عثمانیہ کے خاتمے کے طویل عرصے بعد ترکی جیسے ملک کا پھر سے ایک مضبوط معیشت، دنیاوی اور دینی تعلیم اسی طرح ٹیکنالوجی کے میدان میں دنیا کے صف اول کے ممالک کے ساتھ کھڑا ہونا ایک معجزہ سے کم نہیں۔ دراصل کسی بھی قوم کی ترقی میں مردوں کے ساتھ عورتوں کا شانہ بشانہ کھڑا ہونا اور اپنی خدمات پیش کرنا نمایاں کردار کا حامل ہوتا ہے۔ چنانچہ دنیاوی امور سے متعلق تمام شعبہ ہائے زندگی میں ترک خواتین کا اپنی خدمات پیش کرنے کے ساتھ ساتھ دینی اور سماجی سرگرمیوں میں بھی ان کا کردار قابل ستائش ہے۔اس ملک میں خواتین کے اندر دینی تعلیم کے حصول کا رجحان بھی کافی بڑھا ہے۔اس مضمون میں اسی پہلو پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ مضمون نگار 'انٹرنیشنل ریسرچ کونسل برائے مذہبی امور' میں پراجیکٹ مینیجر ہیں۔

ترکی کے اندر سرکاری اور عوامی اوقاف کے زیر انتظام چلنے والے تمام اداروں کی تعلیمی بنیادوں سے لے کر علمی فضاؤں تک ہر جگہ خواتین اپنے حصے کی محنت جاری رکھی ہوئی ہے۔اس محنت اور کاوش کی بنیادی وجوہات میں سے ایک، حجاب پر سے پابندی کو اٹھانا ہے۔اس لیے چاہے امام حاطب سکول اور کالجز ہوں (جس میں عصری علوم کے ساتھ ساتھ قرات، تجوید، تفسیر، حدیث، فقہ، سیرت وغیرہ جیسا دینی مواد بھی بکثرت پایا جاتا ہے)، چاہے یونیورسٹیوں میں شعبہ علوم اسلامیہ ہو اور اسی طرح ہزاروں کی تعداد میں قرآن کورس کے نام سے بنائے گئے سرکاری مراکز ہوں یا انفرادی اور تنظیموں کے زیر انتظام تعلیمی ادارے ہوں ان تمام اداروں میں خواتین کی شرکت اور خدمات کا تناسب مردوں کے مقابلے میں بہت زیادہ ہے۔

دینی اداروں میں خواتین کی اکثریت کے اسباب

دینی اداروں میں عورتوں کی اکثریت کی بنیادی وجوہات جو سامنے آئی ہیں ان میں سے دو وجوہات زیادہ قابل ذکر ہیں۔ وہ یہ کہ ترک خواتین ماسٹر لیول تک تعلیم حاصل کرنے پر اپنی ازدواجی زندگی نبھانے

پر زیادہ توجہ مرکوز رکھتی ہیں۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ تعلیم کے حصول کے بعد نئی نسل کی دینی تعلیم کی فکر دامن گیر ہوتی ہے جس کے لئے وہ مختلف مراکز میں خدمات سرانجام دیتی ہیں کیونکہ ان کے سامنے اس بات کا قوی اندیشہ موجود ہے کہ اگر اپنی اولاد کو دینی تعلیم سے روشناس نہیں کرایا تو پھر سے وہ وقت دوبارہ پلٹ سکتا ہے جس میں دینی تعلیم کے حصول پر ہر طرف سے پابندیاں تھیں۔

دینی تعلیم کے حصول کے لیے اداروں کی تقسیم

ترکی میں خواتین کے لیے دینی تعلیم کا حصول دو صورتوں میں ممکن ہوتا ہے۔ ایک تو سرکاری اور رسمی اداروں میں ہے، جن میں مخلوط اور غیر مخلوط امام حاطب سکول اور کالجز (جن کے نصاب میں عصری تعلیم کے ساتھ ساتھ قرات، تجوید، تفسیر، حدیث، سیرت، فقہ وغیرہ جیسا دینی مواد بھی بکثرت پایا جاتا ہے)، اور ان کے بعد یونیورسٹیوں میں الٰہیات (علوم اسلامیہ) کے نام سے مختلف دینی علوم میں پی ایچ ڈی تک کی تعلیم حاصل کی جاسکتی ہے۔ ان تعلیمی اداروں میں خواتین کے شرکت کا تناسب مردوں کے مقابلے میں بہت زیادہ ہے۔ اور خاص طور پر تعلیمی اداروں میں حجاب پر سے پابندی اٹھائی جانے کے بعد اس تعداد میں خاطر خواہ اضافہ دیکھنے میں آیا ہے۔ اس کے علاوہ سرکاری سطح پر قرآن کورس کے نام سے لڑکیوں کے لیے بھی تعلیمی مراکز قائم کیے گیے ہیں، جن میں ناظرہ قرآن، حفظ قرآن، بنیادی دینی علوم کی تدریس کی جاتی ہے۔ خواتین کے لیے مخصوص ان رہائشی اور غیر رہائشی اداروں میں بچیوں اور خواتین کی تدریس کی خدمات خواتین معلمات ہی سرانجام دیتی ہیں۔

دوسری شکل انفرادی، یا تنظیموں کے زیر انتظام تعلیمی اداروں کی ہے جن میں خواتین کے لیے ناظرہ قرآن، تجوید اور حفظ قرآن کا انتظام ہے۔ دینی علوم کے مختصر کورسز کے ساتھ ساتھ، طویل المعیاد دینی کورسز بھی پڑھائے جاتے ہیں۔ جن کی تدریس کی مکمل ذمہ داری خواتین کے ہاتھوں میں ہے۔

ان سرکاری اور غیر سرکاری تعلیمی اداروں کے علاوہ انفرادی سطح پر بھی خواتین دین کی نشرواشاعت میں سرگرم عمل ہیں۔

ترکی کی جامعات میں خواتین کی تعلیم اور دینی خدمات

ترکی میں اس وقت سرکاری، غیر سرکاری جامعات کی تعداد 206 ہے، جن میں تقریباً 87 جامعات میں کلیات علوم اسلامیہ (الہیات) دینی خدمات سرانجام دے رہے ہیں۔ ان جامعات میں دیگر کلیات کے مقابلہ میں علوم اسلامیہ کے شعبہ میں ایم اے لیول تک کی تعلیم کے حصول میں لڑکوں کے مقابلے میں لڑکیوں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ لیکن اس کے برعکس ایم فل اور پی ایچ ڈی کی سطح پر کم ہے۔ اس کی بنیادی وجوہات میں سے ایک یہ ہے کہ اسلامی علوم پڑھنے والی لڑکیاں ایم اے تک کی تعلیم مکمل کرنے کے بعد ازدواجی زندگی کو ہی ترجیح دیتی ہیں جس کی وجہ سے ان کے لیے آگے تعلیم جاری رکھنا بہت مشکل ہو جاتا ہے۔ دوسری بنیادی وجہ یہ ہے کہ عصر حاضر میں ترکی حکومت کی طرف سے ہر شہر میں سینکڑوں کی تعداد میں لڑکیوں کے لیے قرآن کورسس کے نام سے ادارے بنائے گئے ہیں جس میں لڑکیوں کو قرآن کی تعلیم کے ساتھ اسلام کی بنیادی اور شعبہ ہائے زندگی سے متعلق موضوعات کی تعلیم دی جاتی ہے۔ جب کہ اس میں پڑھانے والی معلمات کے لیے ایم اے اسلامیات تک کی تعلیم کا مکمل کرنا ضروری ہوتا ہے۔ اس وجہ سے ایم اے اسلامیات کرنے بعد لڑکیوں کے لیے سرکاری سطح پر پڑھانے کے مواقع زیادہ ہوتے ہیں جس کی وجہ سے لڑکیوں کی اکثریت آگے مزید تعلیم جاری رکھنے کی بجائے شادیوں کے ساتھ ساتھ ان اداروں میں پڑھانے اور کام کرنے کو ہی ترجیح دیتی ہیں۔ لیکن پھر بھی لڑکیوں کی ایک بڑی تعداد علوم تفسیر، حدیث، فقہ، تصوف، کلام اور دیگر موضوعات میں ایم اے کے بعد ایم فل اور پی ایچ ڈی تک کی تعلیم مکمل کر چکی ہیں۔

البتہ کچھ سالوں سے اعلی تعلیم کے حصول کے میدان میں لڑکیوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا ہوا نظر آرہا ہے۔ اس کی بنیادی وجہ ترکی کی موجودہ حکومت کی طرف تعلیم کے حصول کے مواقع کا فراہم کرنا ہے۔ ترکی کی موجودہ حکومت سے پہلے جامعات میں سکارف پہننا ممنوع تھا جس کی وجہ سے دینی علوم کی طرف لڑکیوں کا رجحان کافی کم تھا لیکن سکارف کی پابندی کے ختم ہونے کے بعد لڑکیوں کے لیے دینی ماحول میں رہ کر آسانی اور خوشی کے ساتھ دینی علوم کا حصول ممکن ہوا جس کی بناء پر آجکل شعبہ

علوم دینیہ میں لڑکیوں کی تعداد لڑکوں کے مقابلے میں زیادہ ہے۔

عصری جامعات میں دینی علوم کے شعبے

ترکی کی اسلامک فیکلٹیز (الہیات) شعبہ جات کے حوالے سے بہت وسیع ہیں، چنانچہ الہیات کی فیکلٹی میں بنیادی طور پر تین شعبہ جات ہیں پھر ان میں مزید بہت سارے شعبے قائم ہیں۔

پہلا شعبہ ''اسلام کے بنیادی علوم'' کے نام سے ہے۔ اس میں پھر یہ 8 شعبے ہیں: شعبہ تفسیر، حدیث، فقہ، کلام، تصوف، عربی، قرآن کریم اور علم قرآت۔

دوسرا شعبہ ''فلسفہ اور مذہبی علوم'' کے نام سے ہے۔ اس میں پھر یہ 8 شعبے ہیں: شعبہ علوم دینیہ، شعبہ دینی فلسفہ، شعبہ مذہبی نفسیات، شعبہ مذہبی سماجیات، شعبہ مذاہب کی تاریخ، شعبہ تاریخ فلسیہ، اسلامی فلسفہ اور شعبہ منطق۔

تیسرا شعبہ ''تاریخ اسلام اور آرٹ'' کے نام سے ہے۔ اس میں 4 شعبے ہیں: شعبہ تاریخ اسلام، ترکی میں پرنٹ کی تاریخ، ترک اسلامی ادبیات اور ترک دینی میوزک۔

الہیات کی فیکلٹی نے شعبے تو بہت قائم کیے ہیں لیکن طلبہ اور طالبات کا رجحان تفسیر، حدیث اور فقہ کی طرف زیادہ ہے۔

ترکی کی جامعات سے فارغ التحصیل طالبات کی دینی خدمات اور سماجی سرگرمیاں

ترکی میں ایم اے اسلامیات، ایم فل اور پی ایچ ڈی تک تعلیم مکمل کرنے والی لڑکیاں اگر سرکاری سطح پر دینی خدمات ادا کرنا چاہیں تو ان پانچ مقامات میں سے کسی ایک میں دینی خدمات خوش اسلوبی کے ساتھ سرانجام دے سکتی ہے:

1. قرآن کورسس کے نام سے بنائے گئے اداروں میں تدریسی خدمات سرانجام دے سکتی ہیں۔
2. وفاقی ادارہ شعبہ علوم دینیہ کے مراکز میں (یہ مراکز تقریباً ہر شہر میں قائم ہیں)۔

3. شعبہ دعوت و تبلیغ میں (ان اداروں میں کام کرنے والی معلمات شہروں میں جگہ جگہ عورتوں کے لئے وعظ اور نصیحت کے نام سے پروگرام منعقد کرتی ہیں)۔
4. جامعات کے شعبہ علوم اسلامیہ میں ریسرچ اسسٹنٹ لیکچرار اور پروفیسر کے عہدوں پر تدریس کے فرائض انجام دے سکتی ہیں۔
5. امام حاطب کے نام سے قائم کئے سرکاری سکولز اور کالجز میں بطور معلمات کے دینی خدمات سرانجام دے سکتی ہیں۔

دینی علوم میں اختصاص کے ادارے

ترکی میں دینی علوم میں مہارت اور متخصص ہونے کے لیے الگ سے بھی دینی مدارس قائم کیے گیے ہیں چنانچہ اس سلسلے میں 1970 میں استنبول میں سب سے پہلا ادارہ قائم ہوا۔ رفتہ رفتہ دیگر بڑے شہروں میں بھی قائم ہوئے۔ ابھی اس وقت ٹوٹل 10 ادارے قائم ہیں، جن میں صرف 2 ادارے خواتین کی تعلیم کے لیے خاص ہیں۔ البتہ سب اداروں میں تعلیم کا دورانیہ، کتابیں، امتحانات، درس، تدریس کا انتظام وغیرہ ایک جیسا ہے۔

ان اداروں میں داخلے کی بنیادی شرائط چار ہیں:

1. ایم اے اسلامیات تک کی تعلیم کا مکمل ہونا ضروری ہوتا ہے۔
2. سرکاری طور پر کسی سکول، کالج میں اور یا کسی قرآن کورس میں پڑھاتی ہو (یعنی حاضر سروس ہونا ضروری ہے) کیونکہ ایسی صورت میں حکومت کی طرف سے اعلی تعلیم حاصل کرنے کے لیے 3 سال چھٹی مع تنخواہ دی جاتی ہے۔
3. 40 سال سے عمر زیادہ نہ ہو۔
4. ادارے کی طرف سے داخلے کے لیے تحریری اور زبانی امتحانات کا پاس کرنا ضروری ہوتا ہے۔

ان اداروں سے تعلیم مکمل کرنے والی خواتین کی مستقبل میں ذمہ داریاں

ان اداروں سے فارغ التحصیل خواتین کئی جگہوں میں سرکاری طور پر دینی خدمات سرانجام دے سکتی ہیں۔

دار الافتاء میں بطور نائب مفتی کام کرسکتی ہیں۔ عصر حاضر میں ترکی کی سرکاری دادالافتاء میں خواتین کے لیے بھی کوٹہ رکھا ہوا ہے تاکہ خواتین کے مسائل کو صحیح طریقے سے حل کرسکے۔ جبکہ آجکل عملی طور پر ہر دار افتاء میں تعیناتی کا سلسلہ شروع کیا گیا ہے۔

ترکی میں خواتین کی خصوصی تربیت کے لیے جگہ جگہ وعظ اور نصیحت کے عنوان سے سیمینار منعقد کئے جاتے ہیں جس کے لئے خصوصی طور پر خواتین مبلغین مقرر ہوتی ہیں۔ تو ان اداروں سے فارغ التحصیل خواتین بطور خطیب کے کام کرسکتی ہیں۔

وفاقی مذہبی امور کے زیر نگرانی ادارہ امور دیانت کے مراکز میں دنی خدمات سرانجام دے سکتی ہیں۔ 2017 میں پہلی بار ایک خاتون (جو اسلامک سٹڈیز میں پی ایچ ڈی ڈاکٹر بھی ہیں) ادارہ امور دیانت کے مدیر کی پرسنل سیکرٹری مقرر کی گئی ہے۔

خلاصہ یہ کہ ترکی کے دینی مراکز میں ترک خواتین کی دینی اور سماجی سرگرمیاں آج کل اپنے عروج پر ہیں۔ خواتین مبلغین، خواتین کی خصوصی تربیت کے لیے جگہ جگہ وعظ اور نصیحت کے عنوان سے سیمینار منعقد کرتی ہیں۔ خواتین کے مسائل کے لیے الگ سے خواتین مفتیان کرام کا انتظام کرنا ایک ایسا قدم ہے جو کہ آج کل بہت سے اسلامی ممالک میں ناپید ہو چکا ہے۔ اس کے علاوہ تصنیفات کے میدان میں بھی ترک خواتین اپنا لوہا منوانے کے لئے دن رات ایک کئے ہوئے نظر آتی ہیں۔ ترکی کے دینی مراکز میں خدمات سرانجام دینے والی خواتین کے اندر پائی جانے والی صفات میں سے ایک اہم صفت ان خواتین کا دینی علوم کے ساتھ دنیاوی علوم سے کافی حد تک روشناس ہونا ہے جس کی وجہ سے وہ دنیاوی زندگی سے متعلق تمام سرگرمیوں میں دیگر خواتین سے کسی حد تک پیچھے نہیں رہتی۔ اس لئے دور حاضر میں ترکی کے ماحول میں دینی اور سماجی پہلو سے سامنے آنے والے فوائد اور اثرات کسی صاحب علم سے پوشیدہ نہیں۔

انڈونیشیا میں مذہبی مدارس اور خواتین کی تعلیم: طالبان کے لیے سبق

محمد نیاز اسداللہ

جب سے افغانستان میں طالبان کی حکومت قائم ہوئی ہے،اس وقت سے تسلسل کے ساتھ خواتین کی تعلیم کا مسئلہ دنیا میں ہر جگہ زیربحث ہے۔وہاں کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ خواتین کی تعلیم ضروری نہیں ہے، یا بعض حلقے خواتین کی تعلیم کو شریعت کے منافی خیال کرتے ہیں۔جبکہ ایک گروہ ایسا بھی ہے جو شرعی حدود و ضابط کے اندر رہتے ہوئے خواتین کی تعلیم کا حامی ہے،جس میں بنیادی چیز غیرمخلوط نظام اور حجاب ہے۔اگر خواتین شرعی ضوابط کے اندر رہتے ہوئے تعلیم حاصل کرنا چاہیں تو یہ کتنا ممکن ہے اور کیا یہ مفید ثابت ہوسکتا ہے۔اس مضمون میں انڈونیشیا کی مثال سامنے رکھتے ہوئے افغانستان کی رہنمائی کی گئی ہے اور عالمی برادری کو بھی کچھ تجایز دی گئی ہیں۔مضمون نگارماہر تعلیم ہیں اور ملائشیا کی ایک یونیورسٹی میں پروفیسر ہیں۔یہ مضمون ’دی ڈپلومیٹ‘ میں شائع ہوا۔

اِس وقت افغانستان میں کتنے دینی مدارس ہیں،اس بابت حتمی معلومات موجود نہیں ہیں۔البتہ گزشتہ حکومت میں کچھ مدارس ایسے تھے جنہیں افغان حکومت نے سرکاری طور پہ رجسٹر کیا تھا۔اُس وقت ان رجسٹرڈ کی تعداد 5 ہزار تھی۔ان میں سے 250 مدارس کابل میں کام کررہے تھے۔ان پانچ ہزار مدارس میں طلبہ کی تعداد 380000 تھی۔ان میں سے 55ہزار خواتین تھیں۔ان رجسٹرڈ مدارس میں نصاب کا70 فیصد حصہ مذہبی تعلیم پر مرکوز تھا،جبکہ باقی 30 فیصد تعلیمی مواد جدید تعلیم پر مشتمل تھا۔تاہم اب جبکہ ملک میں پچھلے ڈھائی برسوں سے طالبان کی حکومت آچکی ہے، تو اس وقت معلومات نہیں ہیں، کہ مدارس کی تعداد میں مزید کتنا اضافہ ہوا ہے،رجسٹرڈ مدارس اوران کے نصاب کی کیاصورتحال ہے۔

پچھلی حکومت کے اعدادوشمار کو دیکھا جائے تواُس وقت بھی رجسٹرڈ دینی مدارس میں خواتین کا تناسب

بہت کم تھا۔اب خواتین کے تعلیمی ادارے تقریبا بند ہو چکے ہیں۔ طالبان کو خواتین کی تعلیم پر کچھ خدشات ہیں۔اس لیے انہوں نے پابندی عائد کر رکھی ہے۔طالبان کے اس اقدام پر مسلم ممالک کی طرف سے تنقید کی گئی ہے، کہ اسلامی لحاظ سے اس کی کوئی بنیاد نہیں ہے۔اسلام میں خواتین کی تعلیم کو غیر مخلوط نظام کے تحت اور الگ فریم ورک میں جاری رکھنے پر پابندی نہیں ہے۔اس کی سب سے بڑی مثال انڈونیشیا کی ہے جس سے طالبان استفادہ کر سکتے ہیں۔

انڈونیشیا میں دنیا کا سب سے بڑا اسلامی نظام تعلیم پایا جاتا ہے۔ غیر ریاستی مذہبی تنظیمیں مدارس کا ایک وسیع ملک گیر نیٹ ورک چلاتی ہیں۔ان اسلامی اسکولوں نے دور دراز اور پسماندہ کمیونٹیز میں، خاص طور پر لڑکیوں کے لیے اسکول کی تعلیم کے مواقع کو بڑھانے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔انڈونیشیا کا تجربہ افغانستان کے لیے کارآمد ہو سکتا ہے جہاں طالبان کی اقتدار میں واپسی کے بعد سے تعلیم کے شعبے کی "اسلامائزیشن" پر تشویش بڑھ رہی ہے۔طالبان کی جانب سے صنفی حوالے سے الگ الگ نظام تعلیم نافذ کرنے، خواتین کی گھروں سے باہر سرگرمیوں کو محدود کرنے، حجاب کے اصولوں کو نافذ کرنے اور اسکولوں کو روایتی مدارس سے تبدیل کرنے کے منصوبوں کی اطلاعات موصول ہو رہی ہیں۔

دنیا بھر میں، لاکھوں لڑکیوں کو اسی طرح کے نظام میں تعلیم دی جا رہی ہے، جہاں شرعی قانون کی تشریحات لاگو ہیں۔ خاص طور پر، انڈونیشیا طالبان کے لیے ایک اہم ماڈل کے طور پر کام کر سکتا ہے کہ کس طرح مسلم ممالک اور مذہبی تنظیمیں لڑکیوں کی تعلیم کو آگے بڑھانے میں اہم کردار ادا کر سکتی ہیں۔

انڈونیشیا کی وزارت مذہبی امور نے ملک کی دو سرکردہ مسلم تنظیموں، اصلاح پسند سنی تنظیم 'نہضۃ العلماء'، اور تعلیمی و سماجی خیراتی ادارے 'محمدیہ' کے ساتھ مل کر مدارس سے تعلیم یافتہ خواتین کا ایک ملک گیر نیٹ ورک بنایا ہے۔ نظریاتی اختلافات کو ایک طرف رکھتے ہوئے، دونوں تنظیموں نے تاریخی طور پر ہمیشہ طالبات کو مدارس میں خوش آمدید کہا ہے۔اگرچہ ان مدارس کے نظام و نصاب سے جڑے پہلوؤں پر بحث ہوتی رہی ہے، لیکن انڈونیشیا کے مدارس نے تعلیمی سطح پر صنفی برابری کا

ہدف حاصل کیا ہے۔ وہاں ثانوی سے اوپر کے درجات میں لڑکوں کے مقابلے لڑکیوں کی تعداد زیادہ ہے۔ یہاں تک کہ غیر رسمی یا روایتی اسلامی رہائشی مدارس (پیسنٹرین) میں بھی تعلیم کے حوالے سے صنفی توازن موجود ہے۔

افغانستان کے اندر کئی علاقے ایسے ہیں جو بالکل الگ تھلگ اور دور دراز جگہوں پر واقع ہیں۔ وہاں ناقص انفراسٹرکچر، ڈیجیٹل سہولیات کی عدم فراہمی اور سرکاری مروج اسکولوں کی کمی کا مطلب ہے کہ ان کے پاس مدارس ہی لڑکیوں کی تعلیم کو جاری رکھنے کا واحد قابل عمل آپشن ہیں۔ امریکی حکومت کی طرف سے اربوں ڈالرز کی سرمایہ کاری کے بعد بھی، افغانستان میں ثانوی اسکول جانے کی عمر کی تقریباً دو تہائی لڑکیاں اسکول جانے سے محروم تھیں۔ انڈونیشیا کا ماڈل ریاستی حکام کے لیے لڑکیوں کے لیے تعلیمی مواقع پیدا کرنے کے لیے ایک کم لاگت حل ہو سکتا ہے۔

ایسے ہی، ایک اور مسلم ملک بنگلہ دیش نے بھی سرکاری سطح پر مدارس کے ساتھ شراکت داری کے انڈونیشی ماڈل کی پیروی کی ہے۔ آج بنگلہ دیش میں ثانوی تعلیم میں لڑکیوں کی تعداد لڑکوں سے زیادہ ہے۔ مزید یہ کہ، طالبان نے تو غیر مخلوط تعلیمی نظام اور مخصوص لباس کے ساتھ خواتین کی تعلیم کی بات اب کی ہے، انڈونیشیا کی حکومت نے 2014 میں اسکول کی لڑکیوں پر بھی اسی طرح کے مخصوص لباس پر مبنی ضابطے نافذ کیے تھے۔ لہٰذا، دنیا کے سب سے بڑے مسلم اکثریتی ملک کے طور پر انڈونیشیا سے افغانستان کے لیے ایک اہم سبق یہ ہے کہ شرعی قوانین کی بھی لڑکیوں کو اسکول میں تعلیم دینے کے مقصد میں حائل نہیں ہو سکتے، بلکہ ان کا لحاظ رکھا جا سکتا ہے۔

بہتر یہ ہے کہ دنیا تعلیم سے جڑے دیگر سماجی و شہری حقوق سے جڑے امور کو طالبان اور افغانستان کے عوام کے مابین چھوڑ دے، وہ وقت کے ساتھ ان کو کیسے حل کرتے ہیں، اس کا انتظار کیا جا سکتا ہے۔ لڑکیوں کو تعلیمی نظام میں لانا، البتہ اس وقت اہم اور اولین ترجیح ہونی چاہیے، کیونکہ تعلیم یافتہ خواتین خود مستقبل کی سماجی تبدیلی کے لیے بہترین قوت ثابت ہوں گی۔

انڈونیشیا میں، حال ہی میں متعدد خواتین اور والدین نے مختلف مقامات پر حجاب کے اصولوں کو نافذ

کرنے کے حکومتی فیصلے کے خلاف آواز اٹھائی۔ اس طرح کا احتجاج اگرچہ بڑی سطح پر نہیں ہوتا، لیکن یہ ظاہر کرتا ہے کہ اگر تعلیم جاری رہے، تو لوگوں میں پڑھنے اور شعور حاصل کرنے کی راہ بنی رہتی ہے۔ انڈونیشیا نے 1970 کی دہائی سے بڑے پیمانے پر تعلیم میں سرمایہ کاری کی ہے۔ اس کے نتیجے میں انڈونیشیا کی لڑکیوں اور خواتین میں شہری سرگرمیوں، آواز اٹھانے اور بااختیار ہونے کے احساس میں اضافہ ہوا ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ، وقت کے ساتھ ساتھ، تعلیم یافتہ خواتین میں ایک ایسا حلقہ تشکیل پالیتا ہے جو مشترکہ مفادات کے لیے متحرک ہو سکتا ہے اور اپنی خواندگی کو ریاستی حکام کے ساتھ بہتر حقوق کے حصول میں بات چیت کے لیے استعمال کر سکتا ہے۔ مثال کے طور پر، انڈونیشیا میں احتجاج کے مسلسل چھوٹے چھوٹے اقدامات کے نتیجے میں رواں سال کے شروع میں ایک تاریخی فیصلہ ہوا، جب انڈونیشیا کی حکومت نے ملک بھر کے سرکاری اسکولوں میں لڑکیوں کو حجاب پہننے پر مجبور کرنے پر پابندی لگا دی۔

انڈونیشیا تجربہ ہمیں یاد دلاتا ہے کہ صرف اسلامی روایات ہی خواتین کی ترقی میں رکاوٹ نہیں ہیں۔ لہٰذا، افغانستان میں، جو کہ جنگ سے تباہ حال ملک ہے اور جہاں معاشی ترقی کا طویل سفر کرنا باقی ہے، عالمی برادری کو طالبان سے بس یہ مطالبہ کرنا چاہیے کہ وہ لڑکیوں کو تعلیمی نظام میں لے آئیں۔ اگرچہ اسلامی روایات اور قوانین کے تحت ہی کیوں نہ ہو۔ دنیا کو چاہیے کہ وہ تعلیم کو مذہب سے جوڑ کر نہ دیکھے اور نہ اس کی کسی خاص شکل پر ہی زور دے۔ اس سب سے قطع نظر، بس تعلیم کو ترجیح دی جانی چاہیے۔ اگر خواتین کو تعلیم کی آزادی مل جائے تو یہ چیز افغان خواتین کو رفتہ رفتہ بااختیار بنائے گی اور انہیں مستقبل میں مزید جامع تعلیمی نظام کے لیے بات چیت پر مزید متحرک کرنے میں مدد دے گی۔

انڈونیشیا میں خواتین کی تعلیم: دورہ انڈونیشیا کے کچھ مشاہدات

حیا حریم

انڈونیشیا میں مدرسوں کا بڑا وسیع جال پھیلا ہوا ہے، ان کی تنظیم، تشکیل اور نگرانی کا کام قومی اسلامی تنظیموں کے دم قدم چل رہا ہے۔ ان تنظیموں میں:نہضۃ العلماء، محمدیہ اور سیفیہ کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ البتہ بعض جزائر میں مقامی تنظیمات بھی یہ خدمت انجام دے رہی ہیں۔ یہ مدارس ابتدائی، ثانوی اوربعض جگہ ڈگری سطح تک تعلیم کا اہتمام کرتےہیں۔ اس سب میں خوشگوار پہلو یہ ہے کہ دینی تعلیم و تبلیغ کے پورے ڈھانچے میں خواتین بھی ان جماعتوں میں برابر کی شریک ہیں۔انہوں نے مساجد کے نظام سے لے کر جامعات تک میں اپنا کردار نمایاں رکھا ہوا ہے۔ان جماعتوں کے خواتین ونگ بہت فعال ہیں،بلکہ دعوتی میدان میں وہ زیادہ آگے نظر آتی ہیں۔ اس مضمون میں خواتین کی شراکت کے ذاتی مشاہدات پیش کیے گئے ہیں۔ مضمون نگار اسلامی علوم کی ماہر اور معروف دینی ادارے'مرکز الحریم' کی سربراہ ہیں۔

رواں سال انڈونیشیا کے مختلف شہروں میں جانے کا موقع ملااور متعدد تعلیمی اداروں میں خواتین کے ساتھ ملاقاتیں اور نشستیں رہیں،ان تمام نشستوں میں خواتین کے تعلیمی رجحانات اور میسر وسائل و ماحول کے حوالے سے گفتگو زیرِ بحث رہی۔

انڈونیشیا کے تعلیمی اداروں میں واضح محسوس کیا جاسکتا ہے کہ تعلیم کے حوالے سے مرد وزن کے مابین کوئی صنفی امتیازات نہیں ہیں۔خواتین کو تمام شعبوں میں تعلیم حاصل کرنے کے مساوی مواقع اور حقوق حاصل ہیں۔اس سے زیادہ حیران کن ہے کہ خواتین کے مساوی حقوق اور تعلیم کی فراہمی کے لئے خواتین کی بہت سی جدوجہد کارفرما ہے۔کچھ سالوں قبل ان خواتین کے مطابق وہ صنفی بے اعتدالی کا شکار رہی ہیں، جس کے نتیجے میں کئی ایسی تحریکیں وجود میں آئیں جنہوں نے خواتین کے حق میں آواز اٹھائی،اور کم عمری کی شادی، خواتین پر گھریلو تشدد اور خواتین کے لئے صنفی امتیازات کے حوالے سے پُر زور احتجاج کیا جو کہ تاحال جاری ہے،البتہ ان تحریکات کے نتیجے میں انڈونیشیا کی خواتین میں شعور آچکا ہے۔کسی حد تک وہاں کی عام خواتین میں اپنے حقوق کے حوالے سے آگاہ ہیں۔

مذہبی اعتبار سے انڈونیشیا میں محمدیہ اور نہضۃ العلماء دونوں جماعتیں اثر ورسوخ رکھتی ہیں۔البتہ جدید اجتہادات اور معاشرتی عرف کو قابل قبول بنانے میں نہضۃ العلماء کا بہت کردار ہے۔انڈونیشیا مشرقی جاوا میں نہضۃ العلماء کا گہرا اثر دیکھا جاسکتا ہے جو کہ انڈونیشیا میں 31 جنوری 1926 میں قائم ہونے والی، سنی مسلمانوں کی ایک تنظیم ہے۔اس کے اراکین کے تعداد 30 ملین سے زائد ہے۔ یہاں کے مقامی علماء کرام، مدارس اور مذہبی تحریکیں بھی نہضۃ العلماء کے منہج اور فتاوی کو تسلیم کرتی ہیں،اور اسے سرکاری طور پر بھی مقبولیت حاصل ہے۔ان کا ماننا ہے کہ یہ منہج جدید دور کے تقاضوں کے مطابق ہے اور اس میں اس بات کا خیال رکھا گیا ہے کہ کیسے ہر شخص کو اسلام کے قریب کیا جائے۔

نہضۃ العلماء نے بابِ اجتہاد تک کلی رسائی رکھی ہے اور اسے عُرف کے مطابق بنانے کی کوشش اور اس پر عمل درآمد کیا ہے۔ ان کے مطابق خواتین اس معاشرے کا حصہ ہیں اسی لئے تعلیم، درس گاہ ، تجارت و سیاست میں خواتین کا کردار واضح ہے۔ انڈونیشیا کے مختلف شہروں میں بہت سے ایسے تاریخی مقامات موجود ہیں، جو پڑھی لکھی ایسی خواتین کی یاد میں بنائے گئے ہیں جنہوں نے قوم کی قیادت و سیادت کی ذمہ داری اٹھائی، عوام ان خواتین سے آج تک عقیدت رکھتی ہے اور انہیں دیگر خواتین کے لئے بطور اسوہ پیش کرتی ہے۔

مختلف شہروں کے مدارس میں جانے سے اندازہ ہوا کہ خواتین دینی تعلیم سمیت دنیاوی علوم وفنون پر بھی دسترس رکھتی ہیں، دینی تعلیم کی تدریس کا آغاز فجر سے پہلے ہو جاتا ہے، قرآن و حدیث کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد دن میں انہیں اجازت ہوتی ہے کہ وہ عصری علوم وفنون میں مہارت حاصل کریں۔ یہاں چند شہروں میں تعلیمِ بنات کے حوالے سے اپنا تجزیہ ذکر کروں گی:

جے پارہ:

جے پارہ انڈونیشیا کے صوبے سامارانگ میں واقع ہرا بھرا شہر ہے، اس شہر میں مدرسہ ہاشم الاشعریہ کے نام سے موسوم خواتین کی تعلیم کا ایک بہت بڑا مدرسہ واقع ہے۔ یہاں دینی تعلیم کے ساتھ سائنس، فزکس، بیالوجی وغیرہ کے علوم لازمی پڑھائے جاتے ہیں۔ اس مدرسے میں لائبریری کے

ساتھ سائنس لیبارٹری بھی موجود ہے۔ یہاں نہضۃ العلماء کی فکر کی ترویج واشاعت ہوتی ہے۔ ماہانہ بنیادوں پر ملک بھر سے خواتین کے اجتماعات اس مدرسے میں کئے جاتے ہیں۔ اس مدرسے میں خواتین کو لکڑی کی صنعت و حرفت سکھائی جاتی ہے۔ یہاں کئی طالبات کو دیکھا کہ وہ اپنے ہاتھوں سے لکڑی کے فریم اور مختلف نمونے بنارہیں تھیں۔ یہاں علمی اجتماعات میں جمع ہونے والی خواتین کی تعداد ہزاروں سے تجاوز کر جاتی ہے، خواتین کو مختلف جگہوں میں مختلف موضوعات پر علمی حلقات میسر ہوتے ہیں، جس میں اپنی دلچسپی کے موضوعات میں شرکت کر سکتی ہیں، انہیں سوال کرنے کی مکمل آزادی ہوتی ہے۔

جگ جا/یوک یکارتہ:

یہ شہر جے پارہ سے چھ گھنٹے کے سفر کی مسافت پر واقع ہے، اس شہر کو تعلیم کا شہر کہا جاتا ہے۔ انڈونیشیا بھر میں پھیلے ہوئی مختلف مذہبی و سماجی شخصیات اسی شہر کے کسی مدرسے میں دینی علوم سے فیضیاب ہوچکی ہیں۔ اس شہر کے ہر محلے میں بے شمار مدارس واقع ہیں، یہاں تک کے شہر "ملانگ" کی ایک گلی میں سولہ مدرسے میں نے خود دیکھے ہیں، جن میں طلباء و طالبات کی تعلیم کا مخلوط ماحول موجود ہے۔ ان کے نزدیک ہر انسان کی اخلاقی تربیت بہت زیادہ ضروری ہے۔ دیگر دنیا کے احوال سے یہ لوگ زیادہ باخبر نہیں ہوتے لیکن ان کے اپنے شہر کے بیشتر افراد اعلی تربیت واخلاق کے حامل ہوتے ہیں۔ ان کے نزدیک مدرسہ تربیت کا نام ہے، جہاں پڑھنے والی ہر طالبہ معاشرے میں بہترین اخلاقی و تربیتی کردار ادا کر سکے۔ اس علاقے کے تمام مدرسوں میں بچے اپنی چار دیواری میں محدود نہیں تھے۔ سب مدرسوں کے بچے ایک دوسرے سے ملتے ہیں اور آنا جانا کرتے ہیں۔ نہوں نے بتایا کہ دو ہزار سولہ میں جاوا میں نہضۃ العلماء نے ایک تحریک چلائی تھی جس کا سلوگن تھا "اپنے بچوں کو مدرسہ بھیجو" اس تحریک کے بعد بے تحاشا بچوں نے مدارس کا رخ کیا۔ یہی وجہ ہے کہ جاوا انڈونیشیا کے بہت کم بچے ایسے ہوں گے جو مدرسے نہ جاتے ہوں۔

یہاں مدارس کے علاوہ بازاروں اور گلیوں میں موجود مساجد میں خواتین کے لئے تعلیمی حلقات کا

اہتمام کیا جاتا ہے۔ان حلقات میں مرد وزن کے درمیان موضوعات کی کوئی تخصیص نہیں ہے۔جو مرد سیکھتے ہیں وہی خواتین کو بھی سکھایا جاتا ہے، میراث و فلکیات جیسے موضوع ہوں یا بیوع و طہارت کے مضامین ہوں، خواتین کے نصاب ودروس میں یکساں شامل ہیں۔

اس شہر میں خواتین کے حقوق کو اجاگر کرنے کی تحریکیں زوروں پر ہیں اور یہی وجہ ہے کہ نہضۃ العلماء ایسے نصاب کو فروغ دے رہی ہے جس میں خواتین کے مسائل اور ان کا ذکر بھی اسی حد تک ہو جس قدر مردوں کا ذکر شامل ہیں۔مذہبی خواتین چاہے مسلمان ہوں یا غیر مسلم، ان سب کو ہی اپنی مذہبی تعلیم کی مکمل آزادی میسر ہے اور اس پر کوئی قدغن نہیں ہے۔مسجد کے پہلو میں چرچ اور دیگر مذاہب کی عبادت گاہیں موجود ہیں جن سب میں خواتین کی اکثریت نمائندگی کر رہی ہے۔

ساما رانگ:

یہ شہر خواتین کی پیشہ ورانہ ترقی کے نام سے پہچانا جاتا ہے۔اپنے شہروں سے تعلیم حاصل کرنے والی خواتین عصری تعلیم یا دیگر پیشہ ورانہ امور میں مزید آگے بڑھنے کے لئے اس شہر کا رخ کرتی ہیں۔ یہاں انہیں تجارت و کاروبار کو فروغ دینے کے مواقع میسر آتے ہیں۔اس شہر کی مختلف درسگاہوں میں پیشہ ورانہ صلاحیتوں کی تربیت ہوتی ہے۔صوبے کے وزیر اعظم اکثر ایسے اجتماعات میں حاضر ہوتے ہیں اور خواتین کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں اور انہیں مزید آگے بڑھنے کی تجاویز سمیت مواقع فراہم کرنے میں کوشاں رہتے ہیں۔

باندہ آچے:

سماترا آئرلینڈ میں واقع باندہ آچے انڈونیشیا کا ساحلی علاقہ کہلاتا ہے۔اس شہر کو شریعت کے نفاذ کا علم بردار مانا جاتا ہے۔یہاں خواتین کی دینی تعلیم میں فقہ اور تفسیر کو بطورِ خاص نصاب کا حصہ بنایا گیا ہے ۔یہاں خواتین کی تعلیمی درس گاہوں میں فقہ کو اہمیت حاصل ہے، یہی وجہ ہے کہ خواتین بہت سے مسائل میں اجتہاد کر رہی ہیں اور انہیں عرف کے مطابق اپنا رہی ہیں، فقہ اور شرع کا جاننا سب کے لئے ضروری ہے۔

خواتین کا شعبہ ءافتاء:

جکارتہ شہر میں گذشتہ دس سالوں سے خواتین کی ایسی تحریکات کام کر رہی ہیں جو خواتین کو فتوی دینے کی اہلیت کے منصب پر لا سکیں۔ یہاں تک کہ یہ تحریک سرکاری سطح پر منظور کی جا چکی ہے اور گذشتہ پانچ سالوں سے انہیں حکومتی امداد و سرپرستی بھی فراہم ہو رہی ہے۔اس تحریک سے وابستہ خواتین مختلف شہروں میں خواتین کے مسائل زیرِ غور لا رہی ہیں اور ان کے مطابق جدید اجتہادی فتاوی کا صدور ہو رہا ہے۔ ان کے فتاوی کو اہمیت حاصل ہو رہی ہے اور یہ تحریکات دن بدن مقبول عام بھی ہو تی جا رہی ہیں۔ اب تک ان کی خواتین کی طرف سے تین اہم مسائل پر باقاعدہ فتاوی جاری کئے جا چکے ہیں۔ جن میں جنسی تشدد، کم عمری کی شادی اور موحولیاتی مسائل شامل ہیں۔ ان مسائل کی مختلف جہات کا ادراک کیا جا رہا ہے اور باقاعدہ طور پر ایسے نصاب تیار کئے گئے ہیں جو ان مسائل کے حوالے سے آگاہی دیں۔

بچیوں کی ابتدائی تعلیم:

گذشتہ دس سالوں سے بچیوں کو اسکول اور تعلیمی اداروں میں بھیجنے کا رجحان بہت بڑھ گیا ہے۔ سرکاری اعداد و شمار کے مطابق ابتدائی تعلیم حاصل کرنے والے لڑکوں کی تعداد 92.7 فیصد ہے۔ جبکہ لڑکیوں کی تعداد 92.8 فیصد ہے۔

علاوہ ازیں ابتدائی تعلیمی اداروں یعنی اسکولوں میں طلباء و طالبات کو مختلف مضامین اختیار کرنے کا موقع دیا جاتا ہے، ایک لگا بندھا نصاب سب طلبہ پر لازم نہیں کیا جاتا، بلکہ کچھ مضامین ان کی دلچسپی پر منحصر ہوتے ہیں۔

وزارتِ تعلیم کی جانب سے ماہانہ بنیادوں پر اسکول جانے والے طلبہ و طالبات کے والدین سے مشاورت اور اجلاس ہوتے ہیں، ان کا کہنا ہے کہ تعلیمی ڈھانچے میں وہی طالبِ علم مکمل آسکتا ہے جس کے والدین اس پر بھرپور توجہ دیں۔

خلاصہ:

انڈونیشیا میں قومی و صوبائی سطح پر خواتین کے حقوق کی بے شمار تنظیموں کی فعالی اور تحریکات کے کردار، نیز نہضۃ العلماء کی اس میں بھرپور دلچسپی کی بناء پر گذشتہ دس سالوں سے زائد کے عرصے میں یہ خواتین کا تعلیمی رجحان اور شعور واضح طور پر دیکھا جاسکتا ہے۔ سرکاری و غیر سرکاری سطح پر خواتین کی نمائندگی تقریباً مساوی ہی ہے، البتہ اس میں ایک خلا یہ محسوس کیا جاسکتا ہے کہ عالمی دنیا سے وہاں کے طلبہ و طالبات کا رابطہ بہت ہی کم ہے۔ جس باعث انہیں دیگر ثقافتیں، تہذیبیں اور مذاہب کے نشیب و فراز سے واقفیت بہت ہی کم ہے، بلکہ یوں کہا جائے کہ آٹے میں نمک کے برابر ہے تو یقیناً بے جا نہ ہوگا۔ بین الاقوامی علمی دنیا سے رابطہ نہ ہونے کی وجہ سے ان کے ہاں جامعات میں اصل و اساس کا کردار ادا کرنے والے مرد و خواتین اساتذہ بھی عربی، انگریزی زبانوں سے ناواقف ہیں۔ دوسری طرف بین الاقوامی اسلامی دنیا کے اہل علم، انڈونیشیا کے گہرے اجتہادات، عرف کی چھاپ اور شریعت کی تفہیمات سے متاثر ہونا شروع ہوگئے ہیں۔ جس کے لئے ضرورت ہے کہ انڈونیشیا میں ایسے مقامی افراد و خواتین تیار ہوسکیں جو بین الاقوامی زبانوں میں راہ نمائی و روابط بحال رکھنے میں مدد کرسکیں۔ امید کی جاسکتی ہے کہ آئندہ کچھ سالوں میں انڈونیشیا عالمی سطح پر روابط بحال کرنے میں مؤثر کردار ادا کرسکے گا۔

عصری اداروں میں مذہبی تعلیم

پاکستان کے مدارس اور عصری جامعات میں دینی علوم:
بین الاقوامی اسلامی جامعات کے تناظر میں تقابل

مولانا ڈاکٹر نثار اختر

جس طرح پاکستان کے دینی مدارس میں مذہبی علوم پڑھائے جاتے ہیں، اسی طرح ملک کی عصری اعلی جامعات میں بھی شعبہ علوم اسلامیہ میں دینی علوم پڑھائے جاتے ہیں اور ان پر تحقیق ہوتی ہے۔یہ جاننے کی ضرورت تھی کہ دینی مدارس اور عصری جامعات کے نصابات کا تحقیقی تقابل کیا جائے اور ان دینی نصابات کو عالمی شہرت یافتہ بین الاقوامی اسلامی جامعات کے تناظر پر پرکھا جائے، تاکہ معلوم ہوسکے کہ وطن عزیز کے مدارس اور جامعات کا دینی نصاب کس سطح پر ہے۔اس کے لیے مختلف اسلامی علوم کا الگ الگ تجزیہ کیاجاتا ہے کہ ان شعبوں میں کیا پڑھایا جاتا ہے اور اس کا دائرہ کیا ہے۔اس مضمون میں مخصوص جامعات ک تقابلی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ مضمون نگار جامعہ دارالعلوم کراچی میں استاد ہیں۔

پاکستان اور پاکستان سے باہر کی معروف جامعات میں اسلامیات کے مضمون سے متعلقہ کئی علوم پڑھائے جاتے ہیں۔ان شعبوں میں نصاب کی صورتحال کیا ہے اور کون کون سی کتب زیردرس ہیں،ذیل میں اس کا ایک خلاصہ پیش کیا جاتا ہے۔اس تقابلی مطالعے کے لیے پاکستان کی چار مشہور جامعات: جامعہ کراچی، پنجاب یونیورسٹی، انٹرنیشنل اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد اور علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی کو شامل کیا گیا ہے۔ جبکہ بین الاقوامی جامعات میں سے جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ اور جامعہ ازہر کے بی ایس علوم اسلامیہ کے نصاب کو منتخب کیا گیا ہے۔

قرآن مجید (متن)

منتخب پاکستانی جامعات میں سے کسی یونیورسٹی کے کلیہ علوم میں سے اسلامیہ کے شعبہ جات کے نصاب میں نہ تو قرآن مجید کی کوئی سورت بطور ناظرہ طلبہ کو پڑھائی جاتی ہے اور نہ ہی حفظ کروائی جاتی ہے، جبکہ وفاق المدارس العربیہ پاکستان کے تحت ملحقہ مدارس میں طلبہ کو ناظرہ قرآن پڑھایا جاتا ہے

اور حفظ قرآن مجید بھی کرایا جاتا ہے، حفظ کی تکمیل پر وفاق کی طرف سے باقاعدہ طور پر حفاظ طلبہ کا امتحان لیا جاتا ہے اور کامیاب طلبہ کو حفظ کی سند بھی دی جاتی ہے۔

بین الاقوامی جامعات یعنی جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ کے بی ایس لیول میں طلباء کو قرآن مجید کے ابتدائی دس پارے حفظ کروائے جاتے ہیں جبکہ جامعہ ازہر قاہرہ مصر میں مصری اور عربی طلباء کو مکمل قرآن مجید حفظ کروایا جاتا ہے جبکہ دوسرے ممالک سے تعلق رکھنے والے طلباء کو آٹھ پارے حفظ کروائے جاتے ہیں۔

علوم القرآن

علوم القرآن کے موضوع پر منتخب پاکستانی جامعات کے نصاب میں زیادہ تر صرف تعارفی مواد شامل ہیں، ایم اے اسلامیات پنجاب یونیورسٹی کے نصاب میں علوم القرآن کے موضوع پر کسی قسم کی بحث نہیں کی گئی ہے جبکہ اس موضوع پر شعبہ علوم اسلامیہ کراچی یونیورسٹی کے نصاب میں ایک کورس اور کلیہ معارف اسلامیہ علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی کے نصاب میں دو کورسز شامل ہیں تاہم ان میں صرف تعارفی ابحاث ہیں۔ البتہ کلیہ اصول الدین انٹرنیشنل اسلامک یونیورسٹی اسلام آباد کے نصاب میں اس موضوع پر قدرے تفصیل سے بحث کی گئی ہے اور چار کورسز نصاب میں شامل کیے گئے ہیں۔ اس کے برعکس وفاق المدارس العربیہ کے نصاب میں علوم القرآن کے موضوع پر علامہ صابونیؒ کی تصنیف التبیان فی علوم القرآن شامل ہیں جس میں علوم القرآن کے مختلف اقسام پر بحث کی گئی ہے، اس کے علاوہ طلبہ کو ابتدائی درجات میں علم تجوید کا مفصل نصاب بھی پڑھایا جاتا ہے، وفاق سے ملحق بعض مدارس میں علم قرات کا مفصل کورس طلبہ کو پڑھایا جاتا ہے۔ جامعہ دارالعلوم کراچی میں بھی طلبہ کو درس نظامی کے ضمن میں درجہ ثالثہ سے درجہ سادسہ تک چار سالوں میں قرات عشرہ مفصل طور پر پڑھایا جاتا ہے، اس کے علاوہ درس نظامی سے فراغت کے بعد دو سالہ تخصص فی قرات بھی کروایا جاتا ہے جس میں علم قرات کے مختلف موضوعات پر مفصل تحقیق کی جاتی ہے۔

بین الاقوامی جامعات میں سے جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ کے نصاب میں علم قرات مفصل طور پر شامل

ہے،اس کے علاوہ اعجاز قرآن پر بھی مفصل بحث نصاب کا حصہ ہے جبکہ جامعہ ازہر قاہرہ مصر کے نصاب میں علم تجوید،علوم القرآن،اعجاز قرآن اور متشابہات قرآن پر مناسب بحث کی گئی ہے۔

ترجمہ و تفسیر قرآن مجید

پاکستانی جامعات میں قرآن مجید کی بعض منتخب سورتوں کا تفسیری مطالعہ نصاب میں شامل کیا گیا ہے، طلبہ سے ان منتخب سورتوں کی تفسیر کے مطالعہ کی روشنی میں امتحان لیا جاتا ہے جبکہ وفاق المدارس العربیہ پاکستان کے نصاب میں درجہ ثانیہ سے درجہ خامسہ تک چار سال کے دورانیہ میں مکمل قرآن مجید کا ترجمہ اور تفسیر طلبہ کو درساً پڑھایا جاتا ہے اور اس کے بعد درجہ سادسہ میں مکمل تفسیر جلالین طلبہ کو درساً پڑھائی جاتی ہے۔اس کے علاوہ درجہ سابعہ (موقوف علیہ) میں تفسیر بیضاوی کا منتخب حصہ طلبہ کو درساً پڑھایا جاتا ہے۔

بین الاقوامی جامعات میں سے جامعہ ازہر قاہرہ، مصر کے نصاب میں مکمل قرآن مجید کی تفسیر شامل ہے جبکہ جامع اسلامیہ مدینہ منورہ میں قرآن مجید کی چند منتخب بڑی سورتوں کی تفسیر شامل ہے جو کہ تقریباً چار پارے بنتے ہیں۔

حدیث شریف

حدیث شریف کے عنوان سے کلہ معارف اسلامیہ پنجاب یونیورسٹی کے نصاب میں فواد عبدالباقی کی کتاب اللؤلؤ المرجان کے 70 ابواب کی منتخب احادیث شامل ہیں۔ شعبہ اصول الدین کلیہ معارف اسلامیہ کراچی یونیورسٹی کے نصاب میں صحاح ستہ کے 83ابواب کی منتخب احادیث شامل ہیں۔علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی کے شعبہ حدیث کے نصاب میں احادیث کے موضوع پر لکھی گئی 26 مختلف کتابوں کے منتخب ابواب سے احادیث یکجا جمع کی گئی ہیں اور ایک کتاب مطالعہ حدیث کے عنوان سے مرتب کی گئی ہے، اس کتاب کا مطالعہ نصاب میں شامل ہے۔جبکہ کلیہ اصول الدین انٹر نیشنل اسلامک یونیورسٹی اسلام آباد کے شعبہ حدیث کے نصاب میں صحاح ستہ کے 157 منتخب ابواب کی احادیث شامل ہیں۔ بین الاقوامی جامعات میں سے کلیہ حدیث جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ کے نصاب

میں علامہ شوکانی کی کتاب نیلالادوطار سے 865 حدیثیں اور صحاستہ سے 204 حدیثیں(1569 حدیثیں) نصاب میں شامل ہیں، اس کے علاوہ علاموابن البادی کی کتاب المحرر فی الحدیث کی 411 حدیثیں طلبہ کو حفظ کروائی جاتی ہیں جبکہ کلیہ اصول الدین جامعہ ازہر قاہرہ مصر کے شعبہ حدیث کے نصاب میں صحاح ستہ کی 50 حدیثوں کی مفصل تشریح اور 43 مختلف موضوعات پر دوسری کتب احادیث سے لی گئی حدیثوں کی تشریح شامل ہے۔

منتخب قومی اور بین الاقوامی جامعات کے مقابلے میں حدیث شریف کے موضوع پر وفاق المدارس العربیہ پاکستان کے درجہ عالمیہ کا نصاب انتہائی مفصل اور جامع ہے۔ وفاق المدارس العربیہ پاکستان کے عالمیہ کے نصاب میں صحاح ستہ اور مشکوۃ المصابیح طلبہ کو مکمل درساً پڑھائی جاتی ہیں، جبکہ موطاامام مالک، موطا امام محمد، شرح معانی الآثار کے انتخب ابواب طلبہ کو درساً پڑھائے جاتے ہیں، گویا وفاقالمدارس العربیہ پاکستان کے نصاب میں ہر موضوع سے متعلق احادیث شامل ہیں۔

علم الصرف والنحو

علم الصرف اور علم النحو کے موضوع پر کوئی بھی کورس نہ تو مستقل طور پر منتخب پاکستانی جامعات کے نصاب میں شامل ہے اور نہ ہی ان موضوعات پر کسی اور مضمون کے تحت ضمناً بحث کی گئی ہے، حالانکہ وطن عزیز کی جامعات کے علوم اسلامیہ کے نصاب میں ان دونوں موضوعات پر مفصل ابحاث شامل کرناانتہائی ضروری ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ دونوں علوم دراصل عربی گرائمر کے قبیل سے ہیں اور دین کاعلوم کاوسیع تر حصہ عربی زبان میں پایاجاتاہے، بنابریں جب تک ان دونوں علوم کے متعلق طلبہ کو آگاہی حاصل نہیں ہوگی اس وقت تک عربی زبان میں لکھی ہوئی کتابوں کو تو سمجھنا کجا عربی عبارت کوپڑھنا بھی ان طلبہ کے لیے مشکل ہوگا۔

پاکستانی جامعات کی طرح ان دونوں موضوعات پر جامعہ ازہر کے نصاب میں بھی کوئی کورس شامل نہیں ہے، تاہم چونکہ وہاں کے باسیوں کی مادری زبان عربی ہے جس کی وجہ سے عربی زبان پر ان کو مکمل عبور حاصل ہے، بنابریں جامعہ ازہر کے نصاب میں ان مضامین کو شامل نہ کرنے میں کوئی

مضائقہ نہیں، البتہ جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ کے نصاب میں ان دونوں موضوعات پر ایک ایک کورس شامل کیا گیا ہے، جس میں انتہائی اختصار کے ساتھ صرف و نحو کے قواعد پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

منتخب قومی اور بین الاقوامی جامعات کے برعکس وفاق المدارس العربیہ پاکستان کے ابتدائی چار سالہ نصاب (درجہ اولی سے درجہ رابعہ تک) میں ان دونوں موضوعات پر کافی مفصل بحث کی گئی ہے اور کم و بیش 16 کتابیں ان دونوں موضوعات پر طلبہ کو درساً پڑھائی جاتی ہیں اور ان کا اجراء بھی کرایا جاتا ہے۔

علم فقہ واصول فقہ

علم فقہ اور اس کے اصول بنیادی اور اہم مضامین ہیں۔ ان کے متعلق جاننا ایک طالب علم کے لئے عموماً اور علوم اسلامیہ کے شعبہ سے تعلق رکھنے والے طلبہ کے لئے خاص طور پر بہت ضروری ہے۔ پاکستانی جامعات کے نصاب میں اس موضوع پر انتہائی کم مواد شامل کیا گیا ہے۔ کلیہ اصول الدین انٹرنیشنل اسلامک یونیورسٹی کے چھ شعبہ جات میں سے کسی بھی شعبہ کے نصاب میں علم فقہ پر کوئی کورس شامل نہیں کیا گیا ہے جبکہ اصول فقہ کے موضوع پر صرف ایک کورس نصاب میں شامل ہے۔ کراچی یونیورسٹی کے ایم اے اسلامیات کے نصاب میں فقہ اور اصول فقہ پر ایک ایک کورس نصاب میں شامل ہے تاہم ان میں فقہ کے چند موضوعات پر مختصر بحث کی گئی ہے اور زیادہ تر علم فقہ کے تاریخی پہلو پر روشنی ڈالی گئی ہے جبکہ پنجاب یونیورسٹی اور علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی کے ایم اے اسلامیات کے نصاب میں اصول فقہ پر مستقل طور پر کوئی کورس نصاب میں شامل نہیں ہے، صرف ضمنی طور پر علم فقہ کے موضوع کے تحت اصول فقہ پر کچھ روشنی ڈالی گئی ہے، علم فقہ پر اگرچہ علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی کے نصاب میں کچھ موضوعات پر مفصل بحث کی گئی ہے تاہم وہاں تعلیمی سلسلہ صرف مطالعہ تک محدود ہے جو کہ حقیقت میں طالب علم کی صوابدید پر ہوتا ہے۔

علم فقہ اور اصول فقہ پر بین الاقوامی جامعات میں سے جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ کا نصاب اتنہائی مفصل اور جامعہ ہے، جامعہ اسلامیہ کے نصاب میں علامہ ابن رشد کی کتاب بدایۃ المجتہد کا مفصل حصہ طلبہ

کو درساً پڑھایا جاتا ہے جس کے بعد طلباء کی استعداد میں فقہی اعتبار سے نمایاں بہتری آجاتی ہے۔ اسی طرح اصول فقہ سے متعلق دو مضامین اصول الفقہ اور القواعد الفقہیہ کے عنوان سے نصاب میں شامل ہیں، ان دونوں مضامین کا نصاب بھی ماشاءاللہ انتہائی مفصل اور جامع ہے، اور اگر یہ بات کہی جائے تو اس میں شاید کوئی مبالغہ نہ ہو کہ کلیۃ الشریعہ جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ کے نصاب میں اصول فقہ کے تمام ضروری اور اہم مباحث پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

منتخب قومی اور بین الاقوامی جامعات کے مقابلے میں علم فقہ اور اصول فقہ کے موضع پر وفاق المدارس العربیہ کا نصاب نہ صرف یہ کہ زیادہ مفصل اور جامعہ ہے بلکہ ایک مثالی نصاب ہے، علم فقہ کے موضوع پر قدوری، کنزالد قائق، شرح وقایہ سے لیکر ہدایہ کی چاروں جلدیں جبکہ اصول فقہ پر اصول الشاشی، نورالانوار، حسامی سے لیکر توضیح و تلویح تک مفصل کتابیں نصاب میں شامل ہیں، ان کتابوں میں علم فقہ اور اصول فقہ کے ہر موضوع پر سر حاصل بحث کی گئی ہے جس سے طلبہ میں ایک خاص فقہی ملکہ پیدا ہو جاتا ہے۔

علم منطق

پاکستانی جامعات میں سے صرف کلیہ اصول الدین، انٹر نیشنل اسلامک یونیورسٹی اسلام آباد کے شعبہ عقیدہ و فلسفہ کے نصاب میں علم منطق کے حوالے سے تین کورسز المنطق القدیم، المنطق الجدید و مناہج البحث اور نقد المنطق القدیم کے عنوانات سے شامل ہیں۔ اس کے علاوہ کسی بھی جامعہ کے نصاب میں علم منطق کے موضوع پر کوئی کورس شامل نہیں ہے، جبکہ بین الاقوامی جامعات میں سے صرف کلیہ اصول الدین جامعہ ازہر قاہرہ مصر کے شعبہ عقیدہ وفلسفہ کے نصاب میں علم منطق کے موضوع پر ایک کورس المنطق الحدیث و مناہج البحث کے عنوان سے شامل ہے۔

علم منطق کے موضوع پر وفاق المدارس العربیہ پاکستان کے نصاب میں درجہ ثانیہ سے درجہ رابعہ تک تین سالوں میں پانچ کتابیں طلبہ کو درساً پڑھائی جاتی ہیں جن میں علم منطق کے تمام موضوعات پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔

عربی زبان وادب

عربی زبان وادب کے عنوان سے منتخب پاکستانی جامعات میں سے کراچی یونیورسٹی اور پنجاب یونیورسٹی کے ایم اے اسلامیات کے نصاب میں ایک ایک کورس جبکہ علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی کے نصاب میں دو کورسز شامل کئے گئے ہیں، جن میں صرف عربی زبان کی ابتدائی تعارفی ابحاث پر کچھ مختصر روشنی ڈالی گئی ہے اور وہ بھی زیادہ تر مطالعہ کی حد تک محدود ہے۔انٹر نیشنل اسلامک یونیورسٹی اسلام آباد میں اگرچہ عربی اور انگریزی زبان میں تعلیم دی جاتی ہے لیکن عربی ادب پر کوئی بھی کورس ایم اے اسلامیات کے نصاب میں شامل نہیں ہے،اس کے برعکس وفاق المدارس العربیہ سے الحاق شدہ مدارس میں جہاں قسم العربی کے طلبہ کو عربی زبان میں تعلیم دی جاتی ہے اس کے ساتھ ساتھ درجہ اولی سے لیکر درجہ سادسہ تک چھ سالہ نصاب میں ہر سال عربی زبان و ادب پر کوئی نہ کوئی کتاب نصاب کا جز ہے جو کہ طلبہ کو درساً پڑھائی جاتی ہے اور اجراء بھی کرایا جاتا ہے۔

علم میراث

علم میراث کے موضوع پر پاکستانی جامعات کے نصاب میں کوئی کورس شامل نہیں ہے جبکہ بین الاقوامی جامعات میں سے صرف جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ کے نصاب میں اس موضوع پر ایک کورس نصاب میں شامل کیا گیا ہے،اسی طرح وفاق المدارس العربیہ پاکستان کے نصاب میں بھی فن میراث پر ایک کتاب سراجی کے نام سے نصاب میں شامل ہے۔

علم الکلام

پاکستانی جامعات میں سے صرف کلیہ اصول الدین انٹر نیشنل اسلامک یونیورسٹی اسلام آباد کے شعبہ عقیدہ فلسفہ کے نصاب میں علم الکلام پر مفصل روشنی ڈالی گئی ہے، اس کے نصاب میں علم کلام کا مفصل تعارف اور علم کلام کے ذیلی موضوعات یعنی المقدمات والالھیات، النبوات والسمعیات اور قضایا و نصوص کے موضوعات پر مفصل بحث کی گئی ہے اس کے علاوہ بقیہ جامعات اور دونوں بین

الاقوامی جامعات کے نصاب میں علم کلام کے موضوع پر بالکل بحث نہیں ہوئی ہے۔جبکہ وفاق المدارس العربیہ پاکستان کے نصاب میں علم الکلام کے موضوع پر ایک کتاب شرح عقائد کو نصاب میں شامل کیا گیا ہے جس میں علم کلام کے مختلف اموضوعات پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔

تحریک پاکستان کی پہلی مسلم ایجوکیشن سکیم

ڈاکٹر اکرام الحق یاسین

مسلم دنیا میں مذہبی تعلیم کے ماڈل کے سلسلے میں اس مضمون کا موضوع صرف مذہبی نہیں بلکہ 'مسلم تعلیم' ہے جس میں اس بات کا مطالعہ کیا گیا ہے کہ کسی شخص کو بطور مسلمان کیسے نظام تعلیم کی ضرورت ہوتی ہے۔ جدید دنیا میں پالیسیاں بنانے کے لیے سروے اور ڈاٹا جمع کرنے کی بہت اہمیت مانی جاتی ہے اورجمع شدہ ڈیٹا کا تجزیہ کرکے سوالات طے کرنے اور پھر ان کے حل تلاش کے لیے تحقیق کرنے کو کامیاب پالیسی کا ذریعہ سمجھاجاتاہے۔ اس مضمون میں سروے، رپورٹ اور تجاویز شامل ہیں جس پر تحریک پاکستان کے ابتدائی ایام میں مسلم قائدین نے کام کیا۔ سروے کا پس منظر بیان کرنے کے بعد دو رپورٹوں کو اس مضمون کی بنیاد بنایا گیا ہے۔ ایک کو 'پیر پور رپورٹ' اور دوسری کو 'نواب کمال یار جنگ رپورٹ' کہاجاتا ہے۔ مضمون نگار اسلامی نظریاتی کونسل کے جنرل سیکرٹری ہیں۔

انگریزی استعمار کے تحت مسلم نظام تعلیم کی تبدیلی بر صغیر کے مسلمانوں کے لیے ایک بڑے تہذیبی، ثقافتی انقلاب کا پیش خیمہ ثابت ہوئی۔ اس پر رد عمل کے طور پر ایک طرف مدارس دینیہ کا نظام متحرک ہوا تو دوسری طرف علی گڑھ کا نظام تعلیم متعارف ہوا۔ نظام مدرسہ کا مقصد دینی علوم اور اسلامی ماحول کا تحفظ تھا جبکہ علی گڑھ کا مقصد انگریز اور مسلمانوں کے درمیان تناؤ کو ختم کرنا یا کم کرنا تھا۔ اس خلیج کو پاٹنے کے لیے مسلم فضلا کو انگریزی تعلیم کے ذریعے انگریز کے ساتھ افہام و تفہیم کے قابل بنانا اور انہیں ملازمتیں حاصل کرنے کے قابل بنانا پیش نظر تھا۔ اس میں کامیابی یا ناکامی کا تناسب معلوم کرنا ایک الگ تجزیاتی مطالعہ کا متقاضی ہے۔ اس سلسلے میں جو مطالعات کلی یا جزوی اس سے قبل ہوئے ہوں ان کی تنقیح اور تجزیہ بھی مطالعہ کا ایک اہم موضوع بن سکتا ہے۔ ہمارا مضمون اس کے بعد والے مرحلے سے متعلق ہے۔

یہ مرحلہ متحدہ ہندوستان میں قانون حکومت ہند ۱۹۳۵ کے تحت ہونے والے صوبائی انتخابات کے بعد سے شروع ہوتا ہے۔ ۱۹۳۷ء کی صوبائی حکومتیں قانون حکومت ہند ۱۹۳۵ء کے صوبائی حصے کے

تحت قائم ہوئی تھیں اور کانگریسی وزارتوں نے اسی دستوری حق اکثریت کو استعمال کرتے ہوئے تعلیمی اور تہذیبی تبدیلیاں کی تھیں۔ کانگریس کی واردھا سکیم کی وجہ سے مسلمانوں کو محسوس ہوا کہ انہیں تعلیمی و تہذیبی نقصانات ہوئے ہیں۔

افسر شاہی کے بعد مسلمانوں کے لیے خطرہ

ان حالات میں مسلم لیگ نے جو اسلام اور مسلم تہذیب و ثقافت کے تحفظ کے لیے جدوجہد شروع کی اس کا ایک اہم حصہ مسلم نظام تعلیم میں اصلاحات بھی تھیں۔ قائد اعظم نے ۵ فروری ۱۹۳۸ء کو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے اجلاس میں تقریر کرتے ہوئے اس کا اشارہ یوں دیا: "پہلے افسر شاہی (Bureaucracy) تھی۔ وہ سمجھتے تھے کہ انھیں مسلمانوں پر طے شدہ حق حاصل ہے۔ وہ کہتے تھے کہ اگر یہ جناح آگیا تو مسلمان ہمارے ہاتھوں سے نکل جائیں گے۔ یہ کام ہو بھی گیا کہ اللہ کا شکر ہے اب مسلمان ان کے ہاتھوں سے باہر ہیں۔ مگر اب طاقت ان سے نکل کر کافی حد تک اکثریتی آبادی کے ہاتھوں میں چلی گئی ہے۔ اب یہ بات واضح ہے کہ انگریز حکومت کی طرف سے ایسی کوئی علامات نہیں دکھائی جارہی ہیں کہ وہ مسلمانوں کی مدد کو آئے گی بلکہ وہ تو انھیں بھیڑیوں کے آگے ڈال رہی ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ ابھی تک معاملات قابو میں ہیں۔ کافی حد تک مسلم لیگ نے مسلمانوں کو برطانوی حکومت کی ہتھکڑیوں سے آزاد کرالیا ہے، مگر اب ایک اور طاقت ہے جس کا دعوی ہے کہ وہ برطانوی حکومت کی جانشین ہے۔ آپ اسے جو بھی نام دے لیں، مگر یہ ہندو ہیں، اور ہندو حکومت ہے"[1]۔

پیرپور کمیٹی کی تشکیل

انڈین نیشنل کانگریس کی صوبائی حکومتوں کے زیر اثر قائم شدہ نئی تعلیمی سکیم میں مسلمانوں کے تہذیبی و تعلیمی نقصانات کا اندازہ لگانے کے لیے ۲۸/مارچ ۱۹۳۸ء کو پیرپور[2] کے 'راجہ سید محمد مہدی صاحب'

---

[1]- Yusufi: Khursheed ; p. 724- 725

[2]- پیرپور، ہندوستانی ریاست اترپردیش، فیض آباد ڈویژن میں ضلع باڑابانکی کے 'ڈیوا بلاک' میں ایک چھوٹا سا گاؤں ہے۔ یہ نجا

کی سربراہی میں ایک خصوصی کمیٹی تشکیل دی گئی۔ راجہ صاحب کے علاوہ اس میں سید تقی ہادی، سید اشرف احمد، مولوی عبد الغنی، سید ذاکر علی اور میاں غیاث الدین بطور رکن شامل تھے اور اے بی حبیب اللہ اس کے سیکرٹری تھے۔ اس کے ذمے کانگریسی وزارتی حکومتوں والے سات صوبوں بہار، صوبہ ہائے متحدہ (یوپی)، مرکزی صوبہ جات (سی پی) وغیرہ میں کانگریسی حکومتوں کے مظالم اور ان نقصانات کا مطالعہ کرنے کا کام لگایا گیا جن کا مسلمانوں کو سامنا کرنا پڑا۔ کلکتہ کے اجلاس مؤرخہ ۱۷، اپریل ۱۹۳۸ء میں قائد اعظم نے اس کمیٹی کی اطلاع یوں دی کہ 'لیگ کی کونسل نے مسلمانوں کی اقتصادی، تعلیمی و اخلاقی اصلاح' کے لیے ایک کمیٹی مقرر کی ہے۔ خورشید احمد خان یوسفی نے قائد اعظم کے صدارتی خطبے میں 'لیگ اور صوبائی قانون ساز اسمبلیاں' کے تحت اس کمیٹی کا یوں ذکر کیا ہے: "مرکزی دفتر مظالم (Central office of the hardship) میں بہت سی زبانی اور تحریری شکایات پہنچی ہیں، جن میں ان بد سلوکیوں اور بے انصافیوں کا ذکر کیا گیا جن کا سامنا مختلف کانگریسی صوبوں کے مسلمانوں کو کرنا پڑا، خصوصاً جو آل انڈیا مسلم لیگ کے کارکن تھے یا رکن تھے۔ اس لیے کونسل نے اپنی ذمہ داری سمجھتے ہوئے 'راجہ محمد مہدی صاحب' کی سربراہی میں ایک خصوصی کمیٹی تشکیل دی ہے"[3]۔ کمیٹی کی رپورٹ ۱۵ / نومبر ۱۹۳۸ء کو شائع ہوگئی اور ۲۶ دسمبر ۱۹۳۸ء میں مسلم لیگ کے اجلاس منعقدہ پٹنہ میں پیش کی گئی[4]۔ اسے پیرپور رپورٹ کہا جاتا ہے۔

پیرپور رپورٹ کا خلاصہ

رپورٹ میں بتایا گیا کہ واردھا سکیم میں مسلمانوں کی مسلم شناخت کو بگاڑنے کا پروگرام بنایا گیا ہے۔ اس کے لیے کمیٹی نے روس کی مثال دی جہاں نظام تعلیم اور اس سے متعلقہ سرگرمیوں کے ذریعے

واڑا پنچائت کے تحت آتا ہے۔ اس زمانے میں یہ ریاست 'اترپردیش' کی بجائے 'صوبہ ہائے متحدہ' کہلاتی تھی اور اس میں زیادہ علاقے شامل تھے۔ اترپردیش کی کے ایک اور ضلع کھیری (Kheri)، تحصیل لکھیم پور (Lakhimpur) میں بھی 'پیرپور' نام کے ایک گاؤں کا ذکر ملتا ہے۔ خلاصہ از ویب سائٹس۔

[3]- Yusufi, Khurshed; p.789.

[4]- Yusufi, Khursheed; p.789, https://www.epaperpdf.com/wp-content/uploads/ 2021/12/Pirpur-Report.pdf

مسلمانوں کو دین سے دور کر دیا گیا۔انہوں نے تمام ادیان کی اقدار کو جمع کر کے ایک دین قرار دینے پر بھی تنقید کی۔ رپورٹ میں واضح کیا گیا کہ اسلام کی حیثیت مسلمانوں کے لیے ہندومت سے بہت مختلف ہے۔ ہندومت کی تعلیم برہمنوں تک محدود ہوتی ہے جب کہ اسلام تمام مسلمانوں کے لیے ضابطۂ حیات ہے۔ اسلامی تاریخ اور امیر خسرو، کبیر، اکبر اور دارا شکوہ جیسی تاریخی شخصیات کو مسلمانوں کا ہیرو قرار دے کر انہیں غلط رنگ میں پیش کیا گیا کہ انہوں نے ہندومت کے ساتھ اختلاط کا رویہ اپنایا۔اس کے ساتھ ساتھ اس سکیم میں ہندو ہیروز؛ ہارشا، پرتھوی راج، شیواجی اور رنجیت سنگھ کو عظیم شخصیات بنا کر دکھایا گیا اور دوسری سے چوتھی جماعت تک دوسری قدیم اقوام کے ذکر کے ساتھ پورے تین سال صرف ہندو تاریخ پڑھانے کے لیے مختص کر دیے گئے۔اس سکیم نے متحدہ ہندوستانی قومیت کی بھی وکالت کی اور دین کی بجائے وطن کے ساتھ محبت کا درس دیا، گانے اور رقص کی تعلیم بھی اس میں شامل کی گئی اور ہندو ایام منانے کو تعلیم کا حصہ بنا دیا گیا۔اس سے بھی بڑھ کر یہ مسلمانوں کو ہریجنوں کی طرح قرار دیا گیا۔ کمیٹی نے سکیم میں شامل معاشرتی علوم کے نصاب کو بھی خلاف اسلام قرار دیا۔ پیر پور رپورٹ اس نتیجے پر پہنچی کہ کانگریس اور 'ہندو مہا سبھا' دونوں کا مقصد ایک ہی ہے، البتہ ان میں فرق یہ ہے کہ ہندو مہا سبھا رویے اور الفاظ میں سخت ہے اور کانگریس نرم الفاظ اور سیاسی رویہ اپنائے ہوئے ہے۔انہوں نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ کانگریس ہندوستانی مسلمانوں کو ان کی اسلامی شناخت سے محروم کر دینا چاہتی ہے۔

غیر اسلامی شعائر کی پابندی

مسلمان طلبہ و طالبات کے لیے 'بندے ماترم' کا ترانہ لازم قرار دیا گیا جس میں مسلم دشمن عبارات واضح طور پر شامل تھیں۔ کئی مقامات پر یہ کہہ کر اذان دینے پر پابندی لگا دی گئی کہ اس سے اشتعال پیدا ہوتا ہے۔ سی پی اور بہار میں سکولوں کے مسلمان طلبہ کو السلام علیکم کے بجائے 'نمستے' اور 'رام جی کی جے' کہنے کے علاوہ 'سرسوتی دیوی' کے سامنے ہاتھ جوڑ کر پوجا کرنے پر مجبور کرنے کے واقعات بھی ہوئے۔ ایک مراسلہ کے ذریعے صدر مدرسین کو ہدایت کی گئی کہ گاندھی جی کے یوم پیدائش پر ان کی تصویر کے سامنے کھڑے ہو کر پوجا کریں۔ اردو کو مسلمانوں کی زبان قرار دے کر 'ہندوستانی' کو

ذریعۂ تعلیم بنایا گیا۔ گائے کے ذبح پر پابندی لگائی گئی اور گاؤکشی کے مقدمات قائم کر کے مسلمانوں پر عرصۂ حیات تنگ کیا گیا۔ 'ودیا مندر' یعنی 'مندر مدرسہ' کا منصوبہ شروع کر کے مسلمان بچوں کو تعلیم سے محروم رکھنے کا ایک اور اقدام کیا گیا[5]۔

سکولوں میں اسلام کی لازمی تعلیم کی اہمیت

کمیٹی نے دینی تعلیم کی جگہ اخلاقی تعلیم متعارف کرانے پر اعتراض کرتے ہوئے حوالہ دیا کہ اس مسئلے پر ۱۹۱۶ میں بھی غور کیا گیا تھا اور بالآخر یہی فیصلہ ہوا تھا کہ 'اسلام کی تعلیم' مسلمانوں کی تعلیم کا جزو لاینفک ہے، اس لیے صوبوں کو انہیں مستقل اسلامی ادارے قائم کر کے دینی تعلیم فراہم کرنے کی ہدایت کی گئی تھی۔ انہوں نے اس کے علاوہ بھی مسلمانوں کے بارے میں واردھا سکیم کی دیگر خرابیوں کا بھی ذکر کیا گیا۔ رپورٹ میں یہ بھی بتایا گیا کہ 'شمال مغربی سرحدی صوبے' کے علاوہ تمام صوبے اس نظام تعلیم سے متاثر ہوئے۔

اسی کانفرنس میں قرارداد پاس کی گئی کہ یہ نظام تعلیم نافذ کرنے سے مسلمانوں کا جو فکری نقصان ہوا اس کا فوری ازالہ کیا جائے اور مسلم لیگ کی 'ورکنگ کمیٹی' کو اختیار کیا گیا کہ جہاں راست اقدام کی ضرورت محسوس ہو، کیا جائے۔ رپورٹ میں مطالبہ کیا گیا کہ مسلمانوں کے لیے الگ تعلیمی ادارے قائم کیے جائیں جن کا نظم و نسق بھی مسلمانوں کے ہاتھ میں ہو تاکہ مسلمانوں کی تعلیم کا نظام ان کے اپنے ہاتھ میں رہے۔ اس مقصد کے لیے 'سنٹرل مسلم ایجوکیشن بورڈ' قائم کیا جائے اور مکمل طور پر مسلمانوں کی زیر نگرانی اور مسلمانوں کے زیر انتظام صوبائی سطح پر بھی تعلیمی بورڈ قائم کیے جائیں۔ ان کے اخراجات چلانے کے لیے اسمبلیوں میں موجود مسلم نمائندے حکومت سے فنڈ فراہم کرنے کا مطالبہ کریں، نیز مسلم اوقاف اور عوام سے بھی مدد کی اپیل کریں۔

---

[5] - روزنامہ جنگ، اتوار ۱۳ جون ۲۰۰۴، بھارت کی تاریخ میں تحریف کا اعتراف، قمرالدین خان بلاگ۔ رئیس احمد جعفری نے پیرپور رپورٹ مکمل اپنی کتاب بعنوان RARE DOCUMENTS میں صفحہ نمبر ۱۵۱ تا ۲۲۴ بھی شامل کی ہے۔ یہ کتاب ۱۹۶۷ میں محمد علی اکیڈمی لاہور سے شائع ہوئی۔

اسی زمانے میں صوبہ بہار میں ایک ایسی تحقیق 'شریف رپورٹ' کے نام سے بھی منظر عام پر آئی۔ حکیم اسرار احمد کُراوی کی کتاب 'سی پی میں کانگریس راج'، فضل الحق کا ایک پمفلٹ اور مسلم لیگ کا ایک کتابچہ بھی اسی موضوع پر شائع ہوئے[6]۔

پیرپور رپورٹ کا خلاصہ قائداعظم کی زبانی

۲۶/ دسمبر ۱۹۳۸ء کو آل انڈیا مسلم لیگ کے ۲۶ ویں سالانہ اجلاس منعقدہ پٹنہ میں 'پیر پور رپورٹ' پیش کی گئی تو قائداعظم نے اپنے صدارتی خطبہ میں اس کی تفصیلات بیان کیں۔ انہوں نے 'ہندو نشاۃ ثانیہ' کے لیے گاندھی جی کے پروگرام پر روشنی ڈالی اور 'پیرپور رپورٹ' کا خلاصہ اپنے الفاظ میں بیان کرتے ہوئے کہا: 'صورت حال کا خلاصہ ایک جملے میں سمویا جاسکتا ہے۔ "آج ہندو ذہنیت اور ان کے نقطۂ نظر کو پالا پوسا جارہا ہے اور مسلمانوں کو مجبور کیا جارہا ہے کہ نئی صورت حال کو قبول کریں اور کانگریسی رہنماؤں کے احکامات کے سامنے سر جھکادیں۔ یہ ہندو نقطۂ نظر آئے روز مسلمانوں کی روزمرہ زندگی میں دخل اندازی کررہا ہے'[7]"۔

علی گڑھ کی تعلیمی خدمات اور روزگار سے آگے کا مرحلہ

مسلم لیگ کی قیادت زیادہ تر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے فضلا اور متعلقین کے ہاتھوں میں تھی۔ جب مسلم لیگ نے نشاۃ ثانیہ کے لیے اپنا حتمی نصب العین طے کرلیا تو قائداعظم نے ۵/اپریل ۱۹۳۹ء کو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے سٹاف کی طرف سے استقبالیہ سے خطاب کرتے ہوئے کہا: "علی گڑھ مسلمانوں کے لیے امید اور جذبہ حاصل کرنے کا ذریعہ تھا۔ وہ عوامی زندگی سے اپنے آپ کو علیحدہ کرچکے تھے مگر جب اسلام کے نام پر انھیں پکارا گیا تو وہ اس سے الگ نہیں رہ سکے[8]۔ مسلمان بے نامی زمین میں کھڑے نہیں تھے، بلکہ وہ خود بے نامی زمین تھے، مسلمان کی اپنی کوئی حیثیت نہیں

---

[6]- https://www.studypool.com/documents/11588891/pakistan-movement-p0119

[7]- Yusufi, Khurshed; p.858- 859.

[8]- قائداعظم اپنی بات کررہے ہیں کہ مجھے اسلام کے نام پر پکارا گیا تو میں برطانیہ چھوڑ کر واپس آگیا۔

تھی۔ کسی قوم کی نشو و نما کے لیے دو اہم ذرائع ہوتے ہیں: ایک ماں اور دوسرا استاد۔ یہ ایک ایسا اہم ہدف تھا جو بہت زیادہ ذمہ داری کا تقاضہ کرتا ہے۔ مجھے اعتراف ہے کہ آپ لوگوں نے اپنی حدود کے اندر رہتے ہوئے اپنی بہترین کوشش کی ہے۔ علی گڑھ کے لوگ جہاں گئے، انھوں نے اپنے آپ کو باعزت طریقے سے اس کے اہل ثابت کیا۔ تاہم اب بھی بہت سا کام کرنا باقی ہے۔ ہندوستان میں تدریس کے یقینی نتائج سامنے آئے ہیں۔ ہمارے پڑھے لکھے لوگ روزگار کے قابل ہو کر ایسے نکل رہے ہیں جیسے کسی فیکٹری میں مال تیار ہو رہا ہو۔ ان میں سے اکثر کے سامنے سب سے اہم مقصد روزگار کے قابل ہونا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ان کا مقصد محض روزگار کا حصول رہا، خواہ افسر شاہی کے دائرے میں ہو یا کانگریس کے دائرے میں۔ انھیں ان دونوں میں سے ہی کسی کی تلاش کرنا ہوتی تھی۔ انھیں برطانوی دائرے میں روزگار بھی مل سکتے تھے، القابات بھی اور ترجیحات بھی۔ ان کے علاوہ کچھ ایسے تھے جو نیشنلسٹ مسلمان بننے کا مظاہرہ کر کے کانگریس کیمپ کے پیروکار بن گئے، اور کانگریس بھی ان کی سرپرستی کرنے لگی۔

نئی ذہن سازی کی ضرورت

میں آپ سے پوچھتا ہوں، اے اساتذۂ کرام! کیا اب یہ سلسلہ ختم نہیں ہونا چاہیے؟ اہل فکر و دانش کی نئے سرے سے ذہن سازی کی فوری ضرورت ہے۔ آج صورت حال یہ ہے کہ ہم پورے صاحب استعداد لوگوں پر بھی اعتماد نہیں کر سکتے۔ میں نے اس مسئلے پر بہت غور و فکر کیا ہے، مجھے یہ پتہ چلا ہے کہ اس میں ایک اہم عنصر کی کمی ہے۔ اہل فکر و دانش ایک اصول پر عمل نہیں کر پائے - خود اعتمادی اور اخلاقی، ثقافتی اور سیاسی خود شعوری۔ کوئی قوم اس وقت تک کچھ بھی حاصل نہیں کر سکتی جب تک اس کے اہل فکر و دانش قربانی دینے کے لیے تیار نہ ہوں۔ میں اس حقیقت کو راز میں نہیں رکھنا چاہتا کہ مسلمان اور ہندو دو قومیں ہیں، اور مسلمان اس وقت تک اپنی حیثیت برقرار نہیں رکھ سکتے جب تک وہ قومی خود شعوری اور خود اعتمادی حاصل نہ کر لیں۔ مسلم دماغ شکست خوردگی میں مبتلا ہے۔ خوف، حوصلہ شکستگی، گداگری ہم میں سے کئی ایک کے دل و دماغ پر چھائی ہوئی ہے۔ جب تک ہماری شکست خوردہ ذہنیت برقرار رہتی ہے، ہمارے لیے امید کی کوئی کرن نہیں۔ ہاں اب ہم نے اپنے

فرائض کو جاننا شروع کر دیا ہے۔ ہم ایک قوم کی طرح زندگی بسر کریں گے، اور ایک قوم کی طرح اپنا کردار ادا کریں گے"[9]۔

دستوری تحفظ کے لیے گورنر جنرل کو بریفنگ

۴/ جولائی ۱۹۳۹ء کو بمبئی میں مسلم لیگ کی ورکنگ کمیٹی کے اجلاس میں کانگریس اور 'ہندو مسلم' مسئلہ، ہندوستانی تارکین وطن، فلسطین فنڈ، مسلم نیشنل گارڈز، ہندوستانی نوابی ریاستوں کے مسلم شہری، حیدر آباد احتجاج، مسلم لیگ بہار کی درخواست اور وار دھا سکیم وغیرہ جیسے مسائل پر غور کیا گیا۔ کمیٹی میں 'وار دھا' سکیم کے بارے میں جو فیصلہ کیا گیا تھا، قائد اعظم نے اسے یوں بیان کیا: " کمیٹی نے کانگریسی حکومتوں والے صوبوں میں مسلمانوں کی حالت پر غور کیا۔ اب چوں کہ گورنر جنرل کو حال ہی میں مکمل بریفنگ دی جاچکی ہے، اس لیے کمیٹی نے فیصلہ کیا کہ اس معاملے پر مزید کام کو آئندہ اکتوبر تک مؤخر کر دیا جائے۔ یہ بھی فیصلہ کیا گیا کہ کوئی متعین قدم اٹھانے سے پہلے گورنر جنرل کی طرف سے کسی کارروائی کا انتظار کر لیا جائے۔ کمیٹی امید کرتی ہے کہ گورنر جنرل کو جو بریفنگ دی گئی ہے وہ اس پر غور کریں گے، اور مسلمانوں کے حقوق اور مفادات کے تحفظ کے بارے میں قانون کے ذریعے ان پر جو ذمہ داریاں عائد کی گئی ہیں ان کو ادا کرنے میں کامیاب ہوں گے "[10]۔

۳/ ستمبر ۱۹۳۹ء کو عالمی جنگ شروع ہو گئی تو تمام صوبائی حکومتوں کے اختیارات حکومت برطانیہ نے معطل کر دیے اور اس پر احتجاج کے طور پر گاندھی جی کی ہدایت پر اکتوبر- نومبر ۱۹۳۹ء میں کانگریس نے تمام صوبائی وزارتوں نے استعفادے دیے۔ اس واقعہ پر جناح صاحب کی ہدایت پر مسلم لیگ نے ۲۲/ دسمبر کو 'یوم نجات اور یوم تشکر منایا'۔ ان حالات میں دونوں جماعتوں کے درمیان تعاون کے امکانات معدوم ہو گئے[11]۔ دسمبر ۱۹۳۹ء میں جناح صاحب نے ایک اخباری بیان جاری کر کے مطالبہ

---

[9]- Yusufi: Khursheed; V-II, p.989-991.

[10]- Yusufi, Khurshed; p.1016.

[11]- پیر پور کمیٹی کی رپورٹ کا نسخہ نہیں مل سکا، اس لیے مختلف ویب سائٹس سے معلومات جمع کر کے خلاصہ لکھ دیا گیا ہے۔ قائد اعظم کی ایک تقریر میں بھی پیر پور کمیٹی کی اکثر سفارشات کا ذکر آ گیا ہے۔
Report of the Inquiry Committee appointed by the Council of the All-India

کیا کہ عالی قدر شاہ برطانیہ کے اپنے ہائی کورٹ کے جج صاحبان پر مشتمل ایک شاہی کمیشن تشکیل دیا جائے جس کی سربراہی پریوی کونسل کے ایک ماہر قانون رکن کر رہے ہوں، اور یہ کمیشن کانگریس کی وزارتوں کے خلاف مسلمانوں کی شکایات کی تحقیق کرے۔

آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی فکرمندی اور اقدام

قائدِ اعظم نے اکتوبر تک گورنر جنرل کی طرف سے کسی اقدام کا انتظار کرنے کی بات کی تھی۔ ۲۹/ دسمبر ۱۹۳۹ء کو کلکتہ میں آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس [12] منعقدہ ہوئی تو اس کی صدارت نواب کمال یار جنگ [13] نے کی۔ اپنے خطبۂ صدارت میں انہوں نے کانفرنس کی سابقہ خدمات کی تحسین کی اور اس وقت مسلمانوں کی تعلیمی و تہذیبی صورت حال پر تبصرہ کرتے ہوئے ان کی اصلاح کے لیے کمیٹی بنانے کی تجویز دی۔ نواب صاحب کے خطبۂ صدارت کے کچھ اقتباسات درج ذیل ہیں:

'آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس نے اپنے قابل یادگار تاریخی دور میں مسلمانانِ ہند کی عظیم الشان خدمات انجام دی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہم اس کے بانی اعظم سر سید احمد خان اور ان کے جانشینوں کی

Muslim League to enquire into Muslim Grievances in' 'congress Provinces (Pirpur Report) . 1958., Pakistan Journal of History & Culture, Vol.XXVI/2 (2005)۔

[12] - آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس دراصل 'آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس' ہی کا نام تھا جو سر سید احمد خان صاحب نے ۱۸۸۶ء میں علی گڑھ میں قائم کی تھی۔ اس کے سالانہ اجلاس ہندوستان کے مختلف شہروں میں منعقد ہوا کرتے تھے۔ اسی کے بیسویں سالانہ اجلاس منعقدہ ڈھاکہ کے اختتام پر اسی اجلاس میں آئے ہوئے مسلم عمائدین نے ۳۰، دسمبر ۱۹۰۶ء کو ڈھاکہ کے مقام پر 'آل انڈیا مسلم لیگ' کے قیام کا فیصلہ کیا تھا۔ اس لحاظ سے 'آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس' مسلم لیگ کی بنیاد بنی تھی۔ خلاصہ از وکی پیڈیا، انگریزی۔

[13] - نواب کمال یار جنگ بہادر کا تعارف کہیں یکجا نہیں مل سکا۔ مختلف ویب سائٹس سے جو معلومات ملی ہیں ان کے مطابق نواب صاحب کا اسم گرامی نواب میر کمال الدین حسین خان بہادر، کمال یار جنگ تھا، اور ان کے والد گرامی مرحوم حسام الملک خان خاناں تھے۔ وہ حیدر آباد کے حکمران گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ نواب کمال یار جنگ کی واحد صاحبزادی 'خدیجہ بیگم' جو کسی زمانے حیدر آباد دکن سٹاک ایکسچینج کی صدر بھی رہیں۔ ان کے تین بچے ہیں: ایک صاحبزادہ 'محمد انس خان'، پیدائش حیدر آباد ۲۲، جون ۲۰۰۱ء، دو صاحبزادیاں: صاحبزادی نورہ فاطمہ بیگم صاحبہ، پیدائش حیدر آباد ۲۵، جون ۱۹۹۹، صاحبزادی فنرلکہ فاطمہ صاحبہ، پیدائش حیدر آباد ۱۸، اگست ۲۰۰۳ء۔ آج کل ان کی فیملی برطانیہ میں رہائش پذیر ہے۔ مختلف ویب سائٹس سے اندازاً۔

یادتازہ رکھتے ہیں، جنھوں نے اس ادارہ کے ذریعے مسلمانانِ ہند کے ذہن میں اس امر کا بڑھتا ہوا شعور پیدا کیا کہ انھوں نے اس ملک کی ترقی میں کیا حصہ لیا ہے۔ لیکن اب اس ادارہ کو گزشتہ قائدین سے زیادہ ایک عظیم تر ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونا ہے۔

تعلیمی سکیم کا دستور سے تعلق

قانون حکومت ہند بابت ۱۹۳۵ء نے برطانوی ہند کے صوبجات میں خود مختاری نافذ کر دی ہے، جس سے ابنائے وطن کو اپنی تعلیمی پالیسی تشکیل دینے کا حق حاصل ہو گیا ہے۔ قانون مذکور کا وفاقی جزو ابھی رُوبہ عمل نہیں آیا۔ لیکن مستقبل قریب میں مرکزی حکومت میں کوئی نہ کوئی تغیر ناگزیر ہو گا۔ بہت ممکن ہے کہ اس قانون میں ترمیم ہو جائے، یا یہ سارا قانون مسترد ہو کر کوئی نیا قانون تشکیل پاجائے جو ملک کو آزادی کی منزل کی طرف ایک قدم آگے لے جائے اور عوام الناس کو اپنی پالیسی تشکیل دینے کے زیادہ سے زیادہ اختیارات حاصل ہو جائیں۔ ایسے عظیم الشان تغیر کے موقع پر وہ کون سی چیز ہے جو آپ کے لیے جاذب توجہ ہو۔

گزشتہ ڈھائی سال کے واقعات کی رفتار نے یہ ظاہر کر دیا ہے کہ صوبہ داری مجالس مقننہ میں ایک واحد مذہبی فرقہ ایک اکثریتی جماعت تشکیل دے سکتا ہے۔ اور اگر وہ ٹھان لے تو اپنی تہذیب کو جو اس کے مذہب کی آفریدہ ہے سارے صوبہ میں پھیلا سکتا ہے۔ ایسے حالات میں اقلیت خسارہ میں رہتی ہے، جیسا کہ مسلم جماعت رہی۔ کیا آئندہ تغیرات میں ایسے حالات دہرانے کی اجازت دیں گے۔ یا آپ عملی آدمیوں کی طرح اپنا تعلیمی لائحۂ عمل قبل از قبل مرتب کر کے اپنے تعلیمی نصب العین کو متعین کر دیں گے۔ اور اس بات پر اصرار کریں گے کہ آئندہ نظام میں اس نصب العین کا دستوری حیثیت سے تحفظ کیا جائے۔

تعلیمی سکیم اور اسلام کا اجتماعی نظام

میں اس امر سے بخوبی واقف ہوں کہ مسلمان ایک جماعت کی حیثیت سے ان تعلیمی سکیموں سے مطمئن نہیں ہیں جو مختلف گوشوں سے پیش ہوتی رہی ہیں۔ یہاں کسی خاص سکیم کا ذکر کرنا ضروری

نہیں ہے، لیکن ایک چیز کے متعلق مجھے یقین ہے کہ مستقبل میں کوئی نظام تعلیم قابل قبول نہ ہوگا جو ہم میں ایسے ذہنی، روحانی اور اخلاقی صفات نمو دینے سے قاصر رہے جن کی وجہ سے ہم اسلامی روح اور تہذیب کے محافظ بن سکتے ہیں، وہ اسلام جو نوع انسان کی ترقی کے لیے اپنا ایک پیام رکھتا ہے۔ جیسا کہ ہر مسلمان جانتا ہے، اسلام محض ایک جذبے کا نام نہیں، اور نہ یہ ایک ایسی مجرد خصوصیت ہے جو کسی فرد کی خانگی زندگی تک محدود رہے۔ یہ در حقیقت اِجتماعی زندگی کا ایک طریقہ ہے۔ اور اس کو ہر نظام تعلیم میں جگہ ملنی چاہیے جو ہمارے بچوں کے لیے مرتب کیا جائے۔ ڈاکٹر سید عبد اللطیف کے الفاظ میں:

"اسلام کا مقصد ایک ایسا اجتماعی نظام قائم کرنا ہے جو زندگی کے دو بنیادی حقائق پر زور دیتا ہو۔ ایک جس کو میں حرکت حیات سے تعبیر کرتا ہوں اور دوسرا وحدت حیات۔ اور یہ دونوں ایک ایسے لائحۂ عمل کی طرف اشارہ کرتے ہیں جس کو "شریعت" کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ آپ اس شریعت کو "قانون اسلام" بھی کہہ سکتے ہیں۔ اس قانون اور اس لائحۂ عمل کے حدود کے اندر ایک مسلمان کو زندگی بسر کرنی پڑتی ہے۔ یہ حدود در حقیقت تنگ نہیں ہیں جیسا کہ وہ ہماری موجودہ جہالت اور انحطاط کی حالت میں نظر آتے ہیں۔ تاریخ اسلام میں واقعات کی رفتار نے بار بار ثابت کر دیا ہے کہ جس حد تک زندگی کے یہ دو بنیادی حقائق حرکت و وحدت پیش نظر رکھے گئے، اس حد تک شریعت اسلام اپنے پیرؤں میں زندگی اور قوت پیدا کرتی رہی۔ پس یہ امر پیش نظر رہے کہ جس قسم کا تعلیمی نظام بھی آپ اپنے بچوں کے لیے مرتب کریں، اس کو زندگی کے ان عظیم الشان حقائق کے مطابق ہونا چاہیے جس کا اسلام علمبردار ہے۔ اگر ہمارے بچوں کی تعلیم میں ان حقائق تک پہونچنے کے لیے راستے مسدود کر دیے گئے تو ظاہر ہے کہ ایسی تعلیم بے ثمر ثابت ہوگی"[14]۔

---

[14]- خطبہ نواب کمال یار جنگ بہادر، آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس، اجلاس، کلکتہ ۲۹، ڈسمبر ۱۹۳۹ء، اعظم اِسٹیم پریس حیدر آباد دکن، ص ۲۵

تعلیمی نظام کا مقصد اور اس کے اسلامی خدوخال

آخر میں انہوں نے نظام تعلیم کا مقصد طے کرتے ہوئے اور اسے مرتب کرنے کی دعوت دی اور فرمایا: 'میری رائے میں اس کانفرنس کو چاہیے کہ اس امر کے متعلق ان حالات کے مد نظر جن میں ہم اس ملک میں گھرے ہوئے ہیں، ہمارے بچوں کے لیے کس قسم کی تعلیم موزوں ہو گی، اپنے خیالات فوراً مرتب کر لے۔ ہر نظام تعلیم میں جو مسلمانوں کے لیے تشکیل دیا جائے دو ابتدائی مقاصد پیش نظر رہنے چاہیے:

(۱)۔ اسلامی تہذیب کی امتیازی خصوصیات کا تحفظ۔

(۲)۔ اسلامی نظام اجتماعی کا استحکام۔

متذکرہ صدر مقاصد کے حصول کے لیے ایک نظام تعلیم تشکیل دینے کا کام ماہرین تعلیم کی ایک جماعت کے سپرد کیا جانا چاہیے۔ مثلاً تین ارکان کی ایک مختصر کمیٹی، جس کا یہ فرض ہو گا کہ ملک کے مختلف حصوں کا دورہ کرے، ہر مرکز پر مقامی ماہرین تعلیم و معاشیات سے مشورہ کرے اور اپنی رائے پیش کرے۔ اس کمیٹی کا کام یہ بتلانا بھی ہو گا کہ کس حد تک اور کن خاص مضامین میں مسلم اور غیر مسلم طلبہ کے لیے ایک مشترکہ نصاب تیار کیا جا سکتا ہے اور کن مضامین میں مسلمانوں کے لیے جداگانہ اور مستقل انتظام ضروری ہو گا۔

انھوں نے مزید وضاحت کی کہ "یہ مسئلہ بجائے تعلیمی یا سیاسی ہونے کے زیادہ تر معاشی نظر آئے گا۔ کیوں کہ وہ تعلیم ناقص ہے جو ہم میں سے فلاکت زدہ افراد کی معاشی ترقی میں معاون ثابت نہ ہو۔ پس یہ ضروری ہے کہ ہم اپنے معاشی ذرائع کے استحکام اور ہماری خیرات اور اوقاف کے مسئلہ پر توجہ کریں، تاکہ ان کو عامۃ المسلمین کی فلاح و بہبود کے لیے کام میں لایا جا سکے"۔

آئینی تحفظ کی ضرورت

نواب صاحب نے اپنی تقریر میں مزید فرمایا: اس امر کے متعلق رائے دینا بھی اس کمیٹی کا فرض

ہو گا کہ ایسے جداگانہ انتظام کو اطمینان بخش طریقہ پر روبہ عمل لانے کے لیے آئینی تحفظ کس حد تک ضروری ہو گا۔

ایسی اسلامی تعلیم جو معیشت کی بھی اصلاح کرے

حاضرین! ہندوستان میں مسلمانوں کی تعلیم کا مسئلہ خالص تعلیمی مسئلہ نہیں ہے۔ اگر آپ اس مسئلہ پر مسلمانوں کی موجودہ زندگی کے پس منظر میں غور کریں تو مسئلہ بجائے تعلیمی یا سیاسی ہونے کے زیادہ تر معاشی نظر آئے گا۔ کیوں کہ وہ تعلیم ناقص ہے جو ہم میں سے فلاکت زدہ افراد کی معاشی ترقی میں معاون ثابت نہ ہو۔ پس یہ ضروری ہے کہ ہم اپنے معاشی ذرائع کے استحکام اور ہماری خیرات اور اوقاف کے مسئلہ پر توجہ کریں، تاکہ ان کو عامۃ المسلمین کی فلاح و بہبود کے لیے کام میں لایا جاسکے۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ یہ ذرائع نظر انداز کرنے کے قابل نہیں۔ آپ ملک کے مختلف حصوں میں مختلف اوقاف پائیں گے جو قانون بیت المال کی غلط تعبیر کی وجہ سے یا تو مسلمانوں کے ہاتھوں سے نکل گئے ہیں یا ان کو حکومت نے ضبط کر لیا ہے۔ اور جہاں کہیں بھی یہ اوقاف مسلمانوں کے ہاتھ میں ہیں، ان کو دانشمندی سے استعمال نہیں کیا جا رہا ہے۔ اس کے علاوہ زکاۃ کو ہم نے بری طرح فراموش کر دیا ہے۔ یہ ایک اولین فرض ہے جو اسلام امراء پر عائد کرتا ہے تاکہ وہ غرباء کے ساتھ فوائد میں شریک رہیں اور احساس، اتحاد و مساوات کا ثبوت دیں۔ اگر ہم اسلام کے اس بنیادی حکم کے مطابق عمل کر سکیں تو مسلم عوام کی تعلیمی و معاشی سدھار کے اسکیموں کو کامیابی کے ساتھ چلانے کا مسئلہ بڑی آسانی سے حل ہو جائے گا۔ اس سلسلے میں آپ کی مخلصانہ غور و فکر کے لیے اس سکیم کا ذکر کرتا ہوں جو مسلم کلچر سوسائٹی حیدر آباد نے بیت المال کے عظیم الشان ادارہ کے اِحیا کے لیے مرتب کی ہے۔ اگر یہ روبہ عمل آجائے تو ہم اس ملک میں ایک آزاد اور باعزت زندگی بسر کر سکتے ہیں۔

اخراجات برداشت کرنے کی پیش کش

حاضرین! میں نے عمداً ان موضوعات کا ذکر کرنے سے گریز کیا ہے جو ہر سال آپ کی کانفرنس میں

بحث و تمحیص کے لیے پیش ہوتے ہیں۔ میں نے صرف ایک اہم ترین مسئلہ پر اپنی توجہ مرتکز کی ہے یعنی ایک ایسی جامع تعلیمی اسکیم کا مرتب کرنا جو نسبتاً چھوٹے چھوٹے مسائل پر بھی حاوی ہو۔ اب تک ہم نے ان اسکیموں سے ہم آہنگی پیدا کرنے کی کوشش کی جو دوسروں نے مرتب کر کے ہمارے سر تھوپی تھیں۔ اب وقت آگیا ہے کہ ہم خود اپنی ایک اسکیم تیار کرنے کی کوشش کریں اور یہ دیکھیں کہ ایسی اِسکیم ملک کے تعلیمی نظام سے کس طرح ہم ربط و مطابقت پیدا کر سکتی ہے۔ ایک تحقیقاتی کمیٹی کی تشکیل کے لیے جو میں نے تجویز کی ہے یقیناً کچھ مصارف ناگزیر ہیں اور اگر آپ اجازت دیں تو میں بخوشی یہ مصارف برداشت کروں گا۔ بقیہ امور میں میری دعا ہے کہ آپ کے غور و فکر میں فضل الٰہی شریک رہے[15]۔

نواب صاحب کے خطاب کا اثر

یہ معاملہ نواب صاحب کے صدارتی خطاب کے فوراً بعد لگاتار دو دن تک مختلف حلقوں میں غیر رسمی طور پر زیر بحث رہا اور اس طرح کی انکوائری کی ناگزیر ضرورت پر مکمل طور پر اتفاق رائے قائم ہو گیا۔ پھر اجلاس کے اختتامی روز نواب صدر یار جنگ[16] بہادر نے اسے عملی شکل دینے کے لیے قرارداد پیش کی، جس کی تائید عزت مآب جناب اے کے فضل الحق نے کی۔ یہ قرارداد متفقہ طور پر

15- خطبۂ صدارت، نواب کمال یار جنگ، کلکتہ ۲۹/دسمبر ۱۹۳۹ء، مطبوعہ اعظم اِسٹیم پریس حیدر آباد دکن، ص۶-۸، ۲۵

16- نواب صدر یار جنگ بہادر (۱۸۶۶-۱۹۲۶ء) کا اسم گرامی مولانا حبیب الرحمن خان شیروانی تھا۔ آپ علی گڑھ کے قریب موضع بھیکم پور میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم آگرہ کالج میں حاصل کی۔ اسی زمانے میں تصنیف و تالیف کا شوق پیدا ہوا۔ مختلف رسائل اور اخبارات میں مضامین لکھنے شروع کیے۔ ایک عرصہ تک "الندوہ" لکھنؤ کے ایڈیٹر رہے۔ ۱۹۱۸ء میں ریاست حیدر آباد میں "صدر الصدور امور مذہب" کے فرائض سونپے گئے۔ ۱۹۲۲ء میں نواب صدر یار جنگ بہادر کا خطاب سرکاری نظام سے ملا۔ ۱۳ سال بعد اپنے فرائض منصبی سے سبکدوش ہو کر علی گڑھ کے قریب اپنی ملکیت حبیب گنج میں واپس آ گئے۔ آپ فارسی اور اردو کے ادیب تھے۔ زندگی بھر قدیم کتابوں کے نسخے جمع کرتے رہے، 'کتب خانہ گنج' ان کے ذوق کا مظہر ہے۔ ان کے تحقیقی و تنقیدی مضامین اور تبصرے علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ، مخزن، زمانہ، معارف وغیرہ رسالوں میں شائع ہوتے رہے۔ ان پر شبلی اور حالی کے اثرات خاصے گہرے ہیں۔ تصانیف دو درجن کے قریب ہیں جن میں علمائے سلف اور "نابینا علما" خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ آپ دار العلوم ندوۃ العلماء کے استاد اور علامہ شبلی نعمانی کے رفیق تھے۔ آپ 1918 سے 1919ء تک جامعہ عثمانیہ کے پہلے وائس چانسلر تھے۔ خلاصہ از ویکی پیڈیا۔

منظور ہو گئی جس میں ملک کے مختلف نظام ہائے تعلیم کا سروے کر کے ایک جامع اور وسیع البنیاد تعلیمی اِسکیم تیار کرنے کا فیصلہ کیا گیا، جو مسلمانوں کی ثقافت اور سماجی نظام کی مخصوص خصوصیات کے تحفظ میں مددگار ثابت ہو۔

نواب کمال یار جنگ کی تعلیمی کمیٹی

اسی کانفرنس میں ایک اور قرارداد کے ذریعے مطابق نواب کمال یار جنگ بہادر کو کمیٹی کا صدر اور خان بہادر پروفیسر عبدالمجید قریشی[17] ایم اے کو اس کا سیکرٹری مقرر کیا گیا اور صدر کو یہ اختیار بھی دیا گیا کہ

[17]- عبدالمجید قریشی (۵، فروری ۱۸۸۵- تقریباً ۱۹۷۲ء) ولد عبدالکریم قریشی موجودہ ضلع سرگودھا، صوبہ پنجاب کے قدیمی تاریخی شہر بھیرہ (Bhera) میں پیدا ہوئے۔ ۱۸۹۳ سے ۱۹۶۰ء تک بھیرہ ضلع شاہ پور کے تحت رہا۔ عبدالمجید نے ۱۵، مئی ۱۹۰۳ء علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں داخلہ لیا اور ایف اے، بی اے اور ریاضی میں ایم اے ریاضی تک وہیں تعلیم حاصل کی۔ ان کے بڑے بھائی فضل حق قریشی اور منجھلے بھائی عبدالعزیز قریشی (متوفی ۱۹۳۶ء) بھی علی گڑھ کے فاضل تھے۔ عبدالمجید صاحب لکھتے ہیں کہ اس وقت علی گڑھ کالج کے پرنسپل جناب 'تھیوڈور ماریسن صاحب' تھے۔ وہ گھوڑے پر سوار ہو کر طلبہ سے نمازوں کی پابندی کرانے کے لیے خود چکر لگاتے تھے۔ قریشی صاحب کالج میں طلبہ یونین کے کیبنٹ رہے اور بی اے کے آخری سال میں اس کے سیکرٹری بنے۔ وہ سنیئر مانیٹر بھی رہے اور فٹ بال کے چیمپین بھی رہے۔ بی اے کے بعد ان کا نام ڈپٹی کلکٹر کے لیے منظور ہو گیا مگر انہوں نے ایم اے میں داخلہ لینے کو ترجیح دی۔ وہ سر ضیاء الدین احمد کے چہیتے اور قریبی شاگرد تھے۔ انہوں نے طالب علمی کے زمانے میں سر ضیاء الدین احمد کے حکم پر ریاضی کے مشہور پروفیسر، چکرورتی صاحب (بابو جادو چندر چکرورتی) کی چھٹیوں کے زمانے میں ان کی جگہ ریاضی بھی پڑھائی۔ یہاں بی اے سنیئر کی کلاس میں اپنے ہاسٹل کے ساتھیوں ہی کو پڑھانا پڑا۔ ڈاکٹر ضیاء الدین احمد اور کالج کے پرنسپل 'آرچیولڈ' نے چھپ کر ان کا پورا لیکچر سنا اور اطمینان کا اظہار کیا۔ آنریری سیکرٹری نواب وقار الملک صاحب نے انہیں کلکٹری کے مقابلے میں آدھی تنخواہ پر کالج میں پڑھانے کی پیش کش کی تو انہوں نے بڑی خوشی سے ایک سو پچیس روپے ماہوار پر علی گڑھ میں بطور ریڈر پڑھانا شروع کیا اور چوالیس سال علی گڑھ میں گزار دیے۔ انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں عبدالمجید صاحب کا تقرر کرتے ہوئے نواب صاحب مرحوم نے لکھا: "ڈاکٹر ضیاء الدین احمد نے بھی ڈپٹی کلکٹری کی نوکری پر کالج کی کم تنخواہ پر ملازمت اختیار کی تھی۔ میں دعا کرتا ہوں کہ جیسا ضیاء الدین احمد کا مستقبل شاندار رہا، ویسا ہی عبدالمجید قریشی کا بھی ہو"۔ عبدالمجید صاحب ۱۹۲۰ء میں شعبۂ ریاضی میں ریڈر ہوئے اور ۱۹۴۳ء میں پروفیسر ہوئے۔ ۱۹۴۲ء میں انہیں 'خان بہادر' کا لقب عطا ہوا۔ پھر ہیڈ آف دی ڈیپارٹمنٹ اور ڈین بھی رہے۔ جب سر ضیاء الدین وائس چانسلر تھے تو عبدالمجید صاحب ڈپٹی وائس چانسلر رہے۔ فروری ۱۹۴۷ء میں علی گڑھ سے ریٹائر ہوئے اور آزادی کے وقت چھ ماہ تک وائس چانسلر شپ کے فرائض سرانجام دیے۔ اس وقت کوئی وائس چانسلر نہیں تھا۔ وی ایم ہال کے چھ سال پرووسٹ رہے، ایس ایس ہال میں دو سال کے لیے دوبارہ تقرر ہوا۔ سنیئر موسٹ ہونے کی وجہ سے ای سی کے ممبر بھی رہے۔ عبدالمجید ۳۵ سال تک (۱)۔ ڈیوٹی سوسائٹی، (۲)۔ مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے ساتھ بھی منسلک رہے۔ یہاں ان کا منصب اسسٹنٹ سیکرٹری اور جوائنٹ سیکرٹری تھا۔ انہیں ۱۵، فروری ۱۹۳۷ء کو یوپی مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس منعقدہ جونپور کی صدارت کرنے اور صدارتی خطبہ پیش کرنے کا موقع بھی ملا۔ خان بہادر پروفیسر عبدالمجید قریشی صاحب نے یونیورسٹی کی کئی عمارتیں بنوانے میں شرکت کی، مرکزی عمارت سلطان جہاں بلڈنگ

وہ کمیٹی کے اہلکاروں کا انتخاب کریں۔ ممتاز ماہرین تعلیم اور عوامی رہنماؤں سے مشاورت کر کے صدر کمیٹی نے فیصلہ کیا کہ کمیٹی درج ذیل افراد پر مشتمل ہو گی:-

1. نواب کمال یار جنگ بہادر۔ صدر
2. علامہ عبداللہ یوسف علی، M.A., LL .M., C.B.E., I.C.S. (ریٹائرڈ)
3. سر شیخ عبدالقادر، Kt.، بیرسٹر-ایٹ لاء

(کانفرنس کی بلڈنگ) بھی انہوں نے بنوائی۔ وہ خواتین کی تعلیم کے بڑے حامی تھے اور سلسلے میں بڑی خدمات سرانجام دیں۔ علی گڑھ میں انہوں نے 'بیت المجید' کے نام سے اپنی کوٹھی بنوائی مگر قیام پاکستان کے بعد اپنے وطن واپس آگئے اور کئی سال سرگودھا میں رہے۔ پاکستان میں ضیاء الدین میموریل کمیٹی بنی تو اس کے سیکرٹری رہے۔ انہوں نے ایل کامت دونوائے کی کتاب 'ہیومن ڈسٹنی' کا ترجمہ 'مقدر انسانی' کے نام سے کیا جو ۱۱ اکتوبر ۱۹۵۹ء کو اکیڈمی آف ایجوکیشنل ریسرچ کراچی سے شائع ہوا۔ اس کے پیش لفظ میں سید الطاف علی بریلوی نے انہیں سرسید اور محسن الملک کے اول درجے کے اکابر علی گڑھ میں شمار کیا۔ انہوں نے اس سے قبل اس کتاب پر تبصرہ بھی لکھا تھا جو جنوری ۱۹۵۲ء میں سہ ماہی 'العلم' کراچی میں شائع ہوا تھا۔ انہوں نے 'چند عظیم علمائے جراثیم' کے نام سے ڈاکٹر پال ڈی کرائف کی کتاب کا ترجمہ کیا، یہ بھی اکیڈمی آف ایجوکیشن ریسرچ کراچی نے باشتراک مکتبہ فرینکلن لاہور-نیویارک شائع کیا۔ اس کے پیش لفظ میں ان کا پتہ عبدالمجید قریشی (سابق پروفیسر ریاضی، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ)، ۹۵ سول لائنز سرگودھا، ۱۸ء جنوری ۱۹۶۰ء لکھا ہے۔ عبدالمجید صاحب نے کولمبیا یونیورسٹی کے پروفیسر ایس سٹینز فیلڈ سارجنٹ کی کتاب کا بھی 'عظیم علمائے نفسیات' کے عنوان سے ترجمہ کیا جو کہ ضیاء پریس کراچی سے طبع ہو کر اکیڈمی آف ایجوکیشن ریسرچ کراچی سے ہی ۱۹۶۲ء میں شائع ہوا۔ اس کتاب پر مترجم کی تصویر بھی چھپی ہے اور نام یوں لکھا ہے: خان بہادر پروفیسر عبدالمجید قریشی، سابق صدر شعبۂ ریاضی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی۔ سعید صدیقی صاحب نے ۱۹۶۷ء میں نصاب تعلیم کے بارے میں ایک کانفرنس کا احوال لکھتے ہوئے لکھا کہ پروفیسر عبدالمجید قریشی ڈاکٹر نبی بخش بلوچ اور جناب حسن علی عبدالرحمن ریٹائرڈ جج بلوچستان ہائی کورٹ کے بھی استاذ تھے۔ عبدالمجید صاحب کی پہلی شادی بدایون میں ہوئی جس سے ۴ بچے ہوئے۔ دوسری شادی پنجاب میں ہوئی اور ان سے آٹھ (۸) بچے ہوئے۔ ایک صاحبزادے پروفیسر عبدالوحید قریشی (پیدائش ۱۹۱۶ء) علی گڑھ میں رہتے ہیں۔ وہ شعبۂ تاریخ سے منسلک رہے اور ۱۹۷۶ء میں ریٹائرڈ ہوئے۔ آپ نے بھی اپنی رہائش گاہ کا نام بیت المجید رکھا ہے۔ عبدالمجید صاحب کا انتقال ۸۷ سال کی عمر میں کراچی میں ہوا۔ سہ ماہی فکر و نظر، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، جلد ۲۴، جنوری ۱۹۸۷ تا جولائی ۱۹۸۸، ناموران علی گڑھ، تیسرا کارواں، جلد اول، پروفیسر عبدالمجید قریشی، مقالہ نگار ڈاکٹر جمال آراء نظامی، ص ۱۵۱-۱۵۷ بحوالہ زبانی معلومات از ڈاکٹر عبدالوحید قریشی صاحبزادۂ صاحب سوانح، نامہ ہائے صدق و صفا مطبوعہ رسائل و مکتوبات عبدالمجید قریشی صاحب، مرتب شدہ سید الطاف حسین بریلوی، شائع شدہ اکیڈمی آف ایجوکیشنل ریسرچ آف پاکستان—کراچی، طبع اول ۱۹۸۷ء۔ سرسید ہال ریویو، اولڈ بوائز نمبر، علی گڑھ میں میرے شب و روز، عبدالمجید قریشی، ص ۹۳-۱۰۰، سہ ماہی العلم، کراچی بابت ماہ اپریل تا جون ۱۹۶۳ء ایڈیٹر سید الطاف علی بریلوی، اکیڈمی آف ایجوکیشنل ریسرچ، آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس، 'علی گڑھ میں میرے چوالیس سال'، از پروفیسر عبدالمجید صاحب قریشی، قسط اول (کل تین اقساط)، ص ۹-۲۶۔ (باقی اقساط نہیں مل سکیں)، روزنامہ جنگ، 'ڈاکٹر نبی بخش بلوچ سے پہلی ملاقات'، از سعید صدیقی، ۱۰ اپریل ۲۰۱۱، سرسید ہال ریویو، اولڈ بوائز نمبر، بیادگار صد سالہ تقریبات یوم تاسیس مدرسۃ العلوم علی گڑھ ۱۹۷۵ء میں 'علی گڑھ میں میرے شب و روز' عبدالمجید قریشی۔ سہ ماہی فکر و نظر، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، ناموران علی گڑھ، دوسرا کارواں، بابو جادو چندر چکرورتی- مقالہ نگار ڈاکٹر ایم اے پٹھان، ص ۲۵۷-۲۶۱

4. عزت ماب سر ایم عزیز الحق، .Kt، C.I.E
5. ڈاکٹر سر احمد فضل الرحمن، .B.A (آکسن)، ایل ایل ڈی۔
6. ڈاکٹر خلیفہ شجاع الدین، ایم اے، ایل ایل ڈی، بار ایٹ لاء۔
7. ڈاکٹر عبدالعزیز پوری، ایم اے، پی ایچ ڈی۔ (لندن)
8. حاجی مولوی ابوالحسن، .I.E.S (ریٹائرڈ)۔
9. مولوی سید طفیل احمد
10. خان بہادر پروفیسر عبدالمجید قریشی، ایم اے- سیکریٹری۔
11. جناب خان فضل محمد خان، ایم اے (کنٹاب)۔

کمیٹی کا کام جلد از جلد شروع کرنے کی غرض سے نواب کمال یار جنگ بہادر نے کانفرنس ختم ہونے کے تقریباً فوراً بعد کمیٹی کا اجلاس جلد بلانے کے لیے ۴ جنوری ۱۹۴۰ء کو ایک خط جاری کر دیا۔ چناں چہ ۲۶ جنوری ۱۹۴۰ء کو کمیٹی کا پہلا اجلاس قصر خان خاناں، حیدر آباد (دکن) میں ہوا۔ کئی روز کے مسلسل غور وخوض کے بعد عوامی رائے کے حصول کے لیے ایک سوالنامہ جاری کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ سوالنامے کا مسودہ تیار کرنے کا کام عزت مآب سر ایم عزیز الحق کو سونپا گیا۔

گشتی کمیٹی کی تشکیل

سوالنامہ ملک کے مختلف حصوں میں تقسیم کر کے مسلمانوں کے حالات، ان کی تعلیمی ضروریات اور تجاویز جمع کرنی تھیں۔ اس مقصد کے لیے سر محمد عزیز الحق کی سربراہی میں ایک گشتی کمیٹی تشکیل دی گئی۔ اس کمیٹی کا کام مسلم تعلیم کے مقامی حالات کا مطالعہ کرنا، موجودہ نظام تعلیم کا جائزہ لے کر مسلمانوں کے سماجی نظام اور ثقافتی زندگی پر اثرات کا جائزہ لینا، اس بات کی تحقیق کرنا اور یہ کہ آیا کوئی منتشر اثر یا رجحان تو کام نہیں کر رہا ہے۔ رائے عامہ کے رہنماؤں اور دیگر نامور ماہرین تعلیم کے ساتھ عام طور پر مسلم تعلیم کے مسائل پر بحث کرنا۔ طے یہ ہوا کہ گشتی کمیٹی اپنی رپورٹ آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے آئندہ اجلاس میں پیش کرے گی۔ کانفرنس کا آئندہ اجلاس دسمبر ۱۹۴۰ میں

'پونا' میں ہوا، اس وقت تک چوں کہ گشتی کمیٹی کا کام مکمل نہیں ہوا تھا اس لیے اسے ایک سال کا مزید وقت دیا گیا۔ رپورٹ کے منسلک 'ب' میں مکمل سوالنامہ دیا گیا ہے۔ سوالنامے کے شروع میں جواب دہندگان سے درخواست کی گئی تھی کہ:

۱۔ اپنا نام مع اعلیٰ تعلیم کا درجہ یا دیگر القاب و خطابات ذکر کریں۔

۲۔ موجودہ عہدہ، منصب یا اس کے علاوہ اپنی حیثیت لکھیں۔

۳۔ اپنے تجربہ کا خلاصہ لکھیں جس کی بنیاد پر جواب دے رہے ہیں۔

۴۔ مکمل پتہ مع ڈاک خانہ و نام ضلع

یہ سوالنامہ کل ۱۰۰ (ایک سو) سوالات پر مشتمل تھا جن میں نظا تعلیم کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کیا گیا تھا۔ پہلا سوال یہ تھا: ''کیا آپ کی رائے میں موجودہ نظام تعلیم اپنے کسی تعلیمی مرحلے —یعنی پرائمری، سیکنڈری اور یونیورسٹی— پر اسلامی تہذیب اور روایات کے تحفظ کے لیے کام کر رہا ہے؟ کیا موجودہ تعلیمی نظام میں کوئی ایسی چیز ہے جس کا مقصد مسلم طلبہ کو اسلام سے دور کرنا ہو، یا کسی بھی طرح وہ مسلم سماجی نظم و نسق کو ربط توڑنے کی حوصلہ افزائی کرتا ہے؟''۔ باقی سوالات تقریبا اسی پر مبنی تھے۔ ان میں سے پہلے ۲۰ سوال عمومی نوعیت کے تھے مگر سب کا محور مسلمانوں کی دینی تعلیم ہی تھا۔ اگلے آٹھ سوال (۲۱-۲۸) یونیورسٹی کی تعلیم کے بارے میں تھے پھر پانچ سوال (۲۹-۳۳) ثانوی تعلیم کے بارے میں تھے۔ اس کے بعد پندرہ سوال (۳۴-۴۸) پرائمری تعلیم کے بارے میں تھے، تین سوال (۴۹-۵۱) فنی اور صنعتی تعلیم کے بارے میں تھے، چھے (۵۲-۵۷) صرف لڑکیوں کی تعلیم کے بارے میں تھے اور اس کے بعد دس سوال (۵۸-۶۷) خالص مشرقی تعلیم (Oriental Education) کے بارے میں تھے۔ ان میں خصوصیت سے دینی تعلیم اور دینی موضوعات پر تحقیق کے متعلق سوالات پوچھے گئے تھے۔ پھر تین سوال (۶۸-۷۰) انتظامیات کے بارے میں تھے، دس سوال (۷۱—۸۰) بے روزگاری کے بارے میں، تین (۸۱-۸۳) تعلیمی وظائف کے بارے میں دو (۸۴-۸۵) مسلم طلبہ کے لیے رہائشی سہولیات کے بارے

میں، آٹھ سوال (۸۶-۹۳) مختلف امور کے بارے میں، تین (۹۴-۹۶) تعلیمی اداروں کو ملنے والی گرانٹ کے بارے میں، ایک سوال (۹۷) تعلیمی انجمنوں کے بارے میں اور آخری تین سوال (۹۸-۱۰۰) مع ذیلی سوالات مندرجہ بالا تمام عناصر کے اعداد و شمار کے بارے میں تھے۔

کمیٹی کی رپورٹ اور اس کی سفارشات

اس کمیٹی نے زبردست محنت کی اور ۱۹۳۹ء میں اس کی ایک رپورٹ 'تعلیمی نظام پر' شائع ہو کر منظر عام پر بھی آئی۔ رپورٹ انگریزی میں تھی، تعارف کے ۲۱ صفحات اور متن کے ۳۸۳ صفحات پر مشتمل تھی اور اس کا عنوان: Report of the Kamal Yar Jung Education Committee تھا۔ اس رپورٹ کو ایک تعارف، دو اجزا اور ضمیموں میں تقسیم کیا گیا تھا۔ رپورٹ کے پہلے حصے میں مسلم ایجوکیشن کے بارے میں سروے اور دوسرے حصے میں جائزہ اور کمیٹی کی سفارشات پیش کی گئیں۔ یہ سفارشات ہر تعلیمی مرحلے کے لیے تھیں۔ کمیٹی نے ہندوستان کے دینی مدارس میں تعلیم کی صورت حال کا جائزہ بھی پیش کیا اور تجاویز دیں اس کا جائزہ Oriental Education کے عنوان سے پیش کیا گیا۔ رپورٹ کے آخر میں ضمیموں کے عنوان سے رپورٹ کے تمام اجزا سے متعلق ضروری ریکارڈ بہم پہنچایا گیا ہے[18]۔ ان اجزا کا خلاصہ درج ذیل ہے:

تعارفی حصہ

رپورٹ کے تعارفی حصے میں نواب کمال یار جنگ بہادر کی کمیٹی کی تشکیل، اس کے اجلاسوں، گشتی کمیٹی کی تشکیل، اس کی کارگزاری، کام کرنے میں مشکلات؛ سوالنامے کی تیاری میں مشکلات، سوالنامے کا خاکہ، سوالنامے کی تقسیم، صوبائی اور مقامی کمیٹیوں کی تشکیل کے لیے صدر کمیٹی کا گشتی مراسلہ، گشتی سفر کا پروگرام اور تیاری، مشرقی ہند ریلویز کی طرف سے ریل کی سہولت،

---

[18]- اصل رپورٹ، نسخہ محفوظ شدہ سنٹرل سیکرٹریٹ لائبریری، گورنمنٹ آف انڈیا، نیو دہلی۔

دورے کے لیے طے شدہ مقامات، شخصی مشکلات، ریل کے سفر کی مشکلات، شمال مغربی ریلویز میں مشکلات، کشمیر جانے میں مشکلات، مقامی مشکلات کی وجہ سے پروگراموں میں تعطل اور توقفات، دیگر مشکلات، مہمان نوازیوں کا تذکرہ، رپورٹ کی تیاری اور اسے پیش کرنے میں تاخیر کی وجوہات، مسلم ایجوکیشن کے سروے کے حوالے سے خاص مشکلات کے ذکر سمیت کمیٹی کی کارکردگی کی پوری روئیداد درج ہے۔ رپورٹ پہلے حصے میں مسلم ایجوکیشن کے بارے میں سروے تھا۔

رپورٹ کا حصہ اول

پہلے حصے کی ابتدا مدراس میں 'مسلم ایجوکیشن' کے سروے سے کیا گیا۔ جس میں مدراس کے مسلمانوں کی تعداد، صوبے میں اسلامی تعلیم کی تاریخ، مدراس یونیورسٹی کے قواعد وضوابط میں مسلم تعلیم کے لیے مشکلات اور مدراس میں کانگریس کی صوبائی حکومت سے متلعقہ امور کا جائزہ لیا گیا۔ مدراس کے بعد مرکزی صوبجات (Central Province- CP) اور برار (Berar) کی تاریخ اور یہاں اسلامی تہذیب کے اثر رسوخ کا جائزہ لیا گیا۔ اس کے ساتھ ساتھ "ودیا مندر سکیم"، اس صوبے میں کانگریس کی صوبائی حکومت اور ناگپور یونیورسٹی کے بارے میں سروے کیا گیا۔ تیسرے نمبر پر بمبئی اور سندھ میں اسلامی تعلیم کا سروے ہوا، یہاں واردھا سکیم کا جائزہ لیا گیا اور اس عمل کے خلاصے کے طور پر اس صوبے اور اس میں موجود نوابی ریاستوں کے بارے میں یادداشت اور شواہد پیش کیے گئے۔

حصہ دُوم

رپورٹ کے دوسرے حصے میں سروے کے حقائق پر تبصرہ اور سفارشات پیش کی گئیں۔ سب سے پہلے یونیورسٹی سطح کی تعلیم پر تبصرہ اور سفارشات پیش کی گئیں، مرکزی ادارہ تحقیقات اسلامی کی تجویز دی گئی، پھر ثانوی تعلیم کی بات ہوئی اور پھر پرائمری کی۔ اس کے بعد رپورٹ کا اختتامیہ ہے اور نمایاں شرکائے سروے کے نوٹ ہیں۔

منسلکات وملحقات

رپورٹ کے اخر میں ۹ ضمیمے ہیں (A تا I)۔ پہلا ضمیمہ صدارتی مراسلہ ہے، دوسرا سوالنامہ ہے، تیسرا تقسیم سوالنامہ کی فہرست ہے، چوتھا مقامی کمیٹیوں کے بارے میں صدارتی مراسلہ ہے، پانچواں سفری لائحۂ عمل ہے، چھٹا کلکتہ یونیورسٹی میں 'اسلامی تاریخ وتہذیب کا نظرثانی شدہ نصاب' ہے، ساتواں ثانوی تعلیمی نظام اور اس کا نصاب ہے، آٹھواں پرائمری نظام تعلیم اور اس کا نصاب ہے اور نواں شماریاتی نقشہ ہے۔

سروے کے اہم نتائج

مختلف صوبوں میں مسلم آبادی بھی مختلف تھی اور تعلیمی سہولیات بھی مختلف۔ اس لیے کمیٹی نے آبادی کے لحاظ سے سروے کے نتائج اور سفارشات پیش کیں۔ سب سے پہلے یونیورسٹیز میں مسلم تعلیم پر تبصرہ کیا گیا:

یونیورسٹی سطح کی تعلیم کا جائزہ اور تجاویز

اس وقت یونیورسٹیز کی کل تعداد اٹھارہ تھی۔ اس مقصد کے لیے انہیں دو علاقوں کے لحاظ سے شمالی ہندوستان کی یونیورسٹیاں اور جنوبی ہندوستان کی یونیورسٹیاں میں تقسیم کیا گیا شمالی ہندوستان میں آٹھ یونیورسٹیز تھیں۔ عثمانیہ، میسور اور ٹراونکور ہندوستان کی نوابی ریاستوں کی یونیورسٹیاں تھیں:

رپورٹ میں ان میں سے حیدرآباد کی عثمانیہ یونیورسٹی کو ایک منفرد یونیورسٹی قرار دیا گیا، جس میں اعلیٰ مراحل تک تمام مراحل تعلیم میں تدریسی زبان ایک ہندوستانی زبان یعنی اردو تھی اور انگریزی کو ایک ذیلی زبان کے طور پر اختیار کیا جاتا تھا۔ عثمانیہ محققین سائنس اور آرٹس کے متعلقہ مختلف شعبہ ہائے زندگی میں کثیر الجہت تحقیقات بجالاتے تھے اور عثمانیہ یونیورسٹی ہندوستان کی تمام یونیورسٹیز کے لیے ایک قائدانہ حیثیت رکھتی تھی۔ بیس سال قبل تک ہندوستان میں کم ہی کوئی اعلیٰ تعلیم کا ایسا ادارہ مل سکتا تھا جس میں ذریعۂ تعلیم کوئی ہندوستانی زبان ہوتی۔

میسور یونیورسٹی میں عربی، فارسی اور اردو کی تعلیم کا انتظام موجود تھا مگر ٹراونکور یونیورسٹی میں ایسا کوئی انتظام نہیں تھا۔ ان جامعات میں مسلم طلبہ و طالبات کی تعداد بھی کوئی بہت زیادہ نہیں تھی۔

جنوبی ہند میں مسلم طلبہ کی زیادہ تر تعداد وہاں کی پانچ یونیورسٹیز میں تھی مگر سروے سے ثابت ہوا کہ ان جامعات میں عربی فارسی اور اردو کو وہ مقام نہیں دیا گیا جو دیگر زبانوں کو دیا گیا تھا۔ کئی جامعات میں ثانوی اور بی اے کی سطح پر ایک ثانوی زبان بطور لازمی مضمون پڑھنا پڑتی تھی مگر ان زبانوں میں عربی، اردو یا فارسی کا اختیار کم ہی دیا گیا تھا۔ ان صوبوں کی دیگر جامعات میں بھی عربی، اردو اور فارسی کے ساتھ قریب قریب یہی سلوک کیا جارہا تھا۔

خلاصہ

جنوبی ہند کی پانچوں جامعات میں مسلم طلبہ کو نہ تو عربی فارسی اور اردو میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کی کوئی سہولت دی گئی تھی نہ ہی تحقیق کی۔ جس کی وجہ سے مسلم طلبہ کے چھ صدیوں پر محیط اس اسلامی دور کے حالات معلوم کرنے اور علوم سے استفادہ کرنے سے محروم تھے جب عدالتی زبان فارسی ہوا کرتی تھی۔ عربی تعلیم مسلمانوں کی دینی زبان ہے اور ان کا تعلق دین کے ساتھ قائم رکھنے کے لیے بہت اہم ہے۔ مسلم طلبہ کو عربی کی تعلیم سے محروم کرنا انہیں دین سے دور کرنے کے مترادف ہے۔ اسی طرح اردو ہندوستانی زبانوں میں ایک نمایاں مقام رکھنے کے ساتھ ساتھ جنوبی ہند کے اکثر مسلمانوں کی مادری زبان ہے اور ایجوکیشنل سسٹم میں مادری زبان کی اہمیت مسلم ہے۔ ملک بھر کی سیاسی دانست کے مطابق ہر قوم کو اپنی تہذیب و ثقافت کے تحفظ کا حق حاصل ہے مگر اس طرح مسلم طلبہ کو اسلامی تاریخ اور تہذیب و ثقافت سے مطلع ہونے کا کم ہی موقع ملتا ہے۔ اس کے مقابلے میں ہندی، سنسکرت اور دیگر زبانیں، تاریخ و تہذیب، فلسفہ اور دینی مضامین پڑھنے پڑھانے کے مواقع میسر تھے۔

تجویز

ان جامعات میں ان زبانوں کی اعلیٰ تعلیم کو کماحقہ حیثیت دی جائے جس سے پورے ملک کے اعلیٰ

تعلیم کے اداروں پر اثر پڑے گا۔اس علاقے میں مسلم تاریخ کا مطالعہ بھی نصاب تعلیم کا حصہ ہو[19]۔

شمالی ہند کی جامعات کی صورتحال

شمالی ہند کی جامعات میں علی گڑھ، بنارس، دہلی، پنجاب، الٰہ آباد، آگرہ، لکھنؤ، پٹنہ، کلکتہ اور ڈھاکہ کی یونیورسٹیاں شامل ہیں۔ان میں سے پہلی دو جامعات کو سروے رپورٹ سے مستثنیٰ رکھا جاسکتا ہے کیوں کہ ان کی ایک خصوصی نوعیت ہے اور دہلی یونیورسٹی کو بھی فی الحال اس میں شامل نہیں کیا جاسکتا کیوں کہ وہ ابھی ابتدائی مراحل میں ہے اور محدود دائرے کے اندر کام کر رہی ہے۔ شمالی ہند کی دیگر جامعات کے بارے میں عمومی رائے یہ ہے کہ ان میں یونیورسٹی سطح پر اساتذہ فراہم کرنے کی حد تک عربی، فارسی اور اردو کو تسلیم دیا جاتا ہے اگرچہ بہت اچھی سہولیات حاصل نہیں ہیں۔اسی طرح تمام یونیورسٹیوں سے متعلقہ علاقوں میں ایم عربی، فارسی اور اردو کے لیے ملحقہ کالج کئی علاقوں میں میسر نہیں۔

میٹرک اور انٹر میڈیٹ میں درس وتدریس اور امتحان کے لیے مادری زبان مقرر کی گئی ہے۔اس صورت میں جہاں مسلمانوں کی زبان اردو کے علاوہ ہو وہ توکسی نہ کسی درجے میں مادری زبانوں میں شامل ہوتی ہے مگر جہاں ان کی مادری زبان اردو ہو، وہاں مسلم طلبہ کے لیے مشکلات آتی ہیں۔

یونیورسٹی کی سطح پر اردو عربی اور فارسی کی تعلیم، اور اس سے نچلے درجوں میں مادری زبانوں میں اردو شامل نہ ہونے کی وجہ سے مسلمانوں کو تعلیم حاصل کرنے میں بھی مشکلات ہیں اور وہ اپنی تہذیب وثقافت کا مطالعہ کرنے سے بھی محروم رہتے ہیں۔

پھر محض اردو عربی اور فارسی کی تعلیم کا مسئلہ حل ہو جانا بھی مسلم تعلیم کے مسئلے کا مکمل حل نہیں ہے۔ان جامعات کے نصاب میں مسلمانوں کو اسلامی تاریخ اور ثقافت سے کم ہی آمنا سامنا ہوتا ہے۔ صرف زبان کی تعلیم کو اس کا متبادل سمجھ لینا ایک سخت غلطی اور بدقسمتی کی بات ہے۔یہ الگ بات ہے کہ ان زبانوں کی تعلیم کے بھی تمام صوبوں میں مناسب انتظامات موجود نہیں۔ بعض اوقات کسی

---

[19]- Report Kamal Yar Jang Committeee on Education p. 227- 230

کالج میں یہ سبجیکٹ تو آفر کر دیا جاتا ہے مگر اسے پڑھانے کے لیے اساتذہ اور مناسب سہولیات فراہم نہیں کی جاتیں۔ جہاں ان مضامین کی تعلیم کی کسی حد تک سہولت ہو وہاں بھی اس کا نصاب اس معیار کا نہیں ہوتا جو دوسرے مضامین کا ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر بی اے آنرز کی سطح پر ایک یونیورسٹی سنسکرت کا مضمون پیش کرتی ہے تو اس میں سنسکرت کی قدیم تاریخ، رسم الخط اور تمام دینی نصوص کا مطالعہ کرایا جاتا ہے جبکہ وہی یونیورسٹی اگر عربی میں بی اے آنرز آفر کرتی ہے تو اس میں برائے نام کچھ چیزیں شامل ہوتی ہیں۔ سنسکرت کا طالب علم اپنے مذہب کا اچھا خاصا مطالعہ کر لیتا ہے مگر ایک مسلمان عربی میں تخصص کرتے ہوئے بھی اپنے دین کا مطالعہ کرنے سے محروم رہتا ہے۔ فلسفہ، تاریخ منطق وغیرہ کے عام مضامین میں بھی مسلمان نقصان میں ہی رہتے ہیں کیوں کہ انہیں دیگر ہندوستانی اقوام کی طرح اپنے رہنماؤں اور دینی مفکرین کے نتائج فکر کے مطالعہ کا موقع نہیں ملتا۔ ان کی سکیم آف سٹڈی دیگر اقوام سے بالکل مختلف اور سطحی بنائی جاتی ہے۔ اس طرح عربی اور دو، فارسی اور مسلم تہذیب و تاریخ کا معاملہ تو اپنی جگہ رہا پورے ہندوستان میں مسلمانوں کو منطق، فلسفہ، تاریخ، جغرافیہ کے مضامین میں بھی نسبتاً اپنے دین یا دینی نصوص کا مطالعہ کرنے کا موقع کم ہی ملتا ہے۔

مغربی ممالک کی تاریخ زمانوں کے لحاظ سے پڑھائی جاتی ہے اور ان زبانوں میں ہندوستانی مذاہب پر وسیع پیمانے میں تحقیقی کام بھی ہو رہا ہے جس میں قدیم ہند سے لے کر جدید ہند تک تاریخ، جغرافیہ، علوم، ایجادات، آثار قدیمہ وغیرہ تمام پہلوؤں کا احاطہ کیا جاتا ہے مگر جب باری اسلام کی آتی ہے تو اس کے بارے میں نہ تو اس سطح کی تحقیق ہو رہی ہے جس سطح کی دیگر مذاہب کے بارے میں ہو رہی ہے نہ دین کے بارے میں، نہ تخلیقات و ایجادات کے بارے میں، نہ تاریخ و تہذیب کے بارے میں۔ مسلمان طلبہ اسلامی تاریخ کے خاکوں سے بھی ناواقف رہتا ہے، دیگر ممالک میں اسلامی عصریات اور ہندوستان کے تہذیبی ورثہ میں اسلام کے حصہ کا مطالعہ کرنا تو دور کی بات ہے۔ حالانکہ اسلامی ورثہ معیار، مقدار اور تنوع کے لحاظ سے انتہائی غنی ہے۔ اس کا مطالعہ جہاں مسلمانوں کے لیے یہ قابل فخر ورثہ ہے، وہیں یہ غیر مسلم ہندوستانیوں کے لیے ہندوستانی تہذیب کے مطالعہ میں خاص اہمیت رکھتا ہے۔ بمبئی یونیورسٹی میں حال ہی میں اسلامک کلچر میں ایم اے شروع ہوا ہے مگر اس کے نہ سٹاف ہے

نہ سہولیات۔ البتہ پچھلے دو سالوں سے کلکتہ یونیورسٹی میں اسلامی تاریخ وثقافت میں اعلیٰ تعلیم کا انتظام کر دیا گیا ہے اور اسلامی تہذیب کا مضمون بی اے اور ایف کی سطح پر بھی نصاب میں شامل کر دیا گیا ہے۔ اس میں دین اسلام: فلسفہ، تاریخ، اسلامی تاریخ ہندوستان میں، اسلامی قانون کے مضامین شامل ہیں۔ پھر تفصیل میں ہندوستان میں اسلامی قانون کی تاریخ، ہندوستان کے علاوہ اسلامی قانون کی تاریخ، برطانوی استعمار کے زیر انتظام اسلامی قانون کی تاریخ اور اسلامی قانون کے مکاتب فکر وغیرہ شامل ہیں۔ ڈھاکہ یونیورسٹی میں یہ سہولت پہلے سے موجود ہے۔ علی گڑھ یونیورسٹی کا معاملہ بھی دیگر جامعات سے مختلف ہے۔ یہاں تو اسلامی تاریخ، تہذیب اور دینی نصوص پڑھنے کے بڑے مواقع ہیں[20]۔ اس زمانے میں میٹرک، ایف اے، بی اے اور ایم اے سب کے امتحانات یونیورسٹی میں ہی ہوتے تھے۔

مسلمانوں کے لیے تعلیمی مشکلات میں سے ایک یہ بھی تھی کہ میڈیکل اور انجنیر نگ کے داخلہ ٹیسٹ میں ایسے سوالات شامل کیے جاتے جن سے مسلمان وقف نہیں ہوتے تھے، اس لیے انہیں یہاں داخلے کا موقع کم ہی ملتا تھا۔ صرف یہی نہیں بلکہ میڈیکل اور انجنیر نگ کالجز کی بھاری فیسیں بھی مسلمانوں کے لیے ناقابل تحمل ہوتی تھیں۔

تعلیمی نصاب مناسب نہ ہونے کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کا کچھ اپنا بھی قصور تھا کہ وہ تعلیم کم ہونے کی وجہ سے یا عدم دلچسپی کی وجہ سے میڈیکل، انجینئر نگ اور تدریس کے شعبوں میں ملازمتیں بھی کم ہی حاصل کر پاتے تھے، اس لیے بھی دوسرے مسلمانوں کی تعلیم پر برے اثرات پڑتے تھے۔

بعض کالجوں میں باقاعدہ مسلمانوں کے داخلے پر پابندی ہوتی تھی اور اس طرح یا تو وہ تعلیم سے بالکل محروم رہ جاتے یا انہیں اپنے علاقے سے بہت دور جانا پڑتا۔ مسلم خواتین کی اعلیٰ تعلیم کے مسائل اس سے کہیں زیادہ گھمبیر تھے۔ مسلمانوں کے لیے تعلیمی وظائف اور مالی امداد کے مسائل بھی اسی نہج پر تھے۔

---

[20]- Report Nawab Kamal Yar Jang , p238..... یہاں کلکتہ یونیورٹی کے Religion : Theology and Philosophy کی پوری سٹڈی سکیم دی گئی ہے۔

سفارشات

کمیٹی نے یونیورسٹی تعلیم میں مسلمانوں کو سہولت دینے کے لیے کمیٹی نے ۲۲ سفارشات پیش کیں جو عام تعلیمی نظام میں اسلامی تہذیب و ثقافت کے تحفظ اور مطالعہ کا بہترین ضامن ثابت ہو سکتی ہیں[21]۔

مرکزی ادارہ تحقیقات اسلامی کی تجویز

اسلامی تعلیم عصر حاضر کے طلبہ کے لیے مناسب حال بنانے کے لیے کمیٹی نے آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی انتظامیہ کو ایک مرکزی ادارہ تحقیقات اسلامی فوری طور پر قائم کرنے کی سفارش کی، جس کا نام انھوں نے یوں تجویز کیا:

Central Research Organization for advanced studies and researches in Islamic history and culture with special reference to India.

انہوں نے اس کی تائید میں زور دے کر کہا کہ اس وقت ہندوستان کی تاریخ تعمیر نو کے عمل سے گزر رہی ہے، دیگر تمام شعبوں میں بھی تیزی سے تبدیلیاں آ رہی ہیں۔ اگر مسلمانوں نے اسلامی حوالے سے اس میں پورا پورا حصہ نہ لیا تو یہ ایک بہت بڑا المیہ ہو گا۔ پھر انہوں نے اس ادارے کے ۱۰ فرائض منصبی بھی طے کیے[22] جو آج بھی ایک اسلامی معاشرے میں اعلیٰ تعلیم کے انتظامات کے لیے انتہائی کارآمد ہے[23]۔

---

[21]- Report Nawab Kamal Yar Jang , p247- 249

[22]- اسی سے ملتے جلتے مقاصد کے ساتھ آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس ۱۹۴۷ میں ایک 'مرکزی ادارہ تحقیقات اسلامی' پاکستان میں ائم کرنے کی تجویز دی گئی تھی جو التوا میں رہا اور اسمبلی میں اس پر کئی سال بحث ہوتی رہی اور بالآخر ۱۹۵۴ میں کراچی میں قائم ہوا۔ وہ اس وقت بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی کے ایک ذیلی ادارے کے طور پر کام کر رہا ہے۔

[23]- پاکستان قائم ہوتے ہی نومبر ۱۹۴۷ میں آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس منعقد ہوئی تو اس میں بھی اسی طرح کا ادارہ قائم کرنے کی قرارداد پاس کی گئی۔

دینی مدارس کا جائزہ اور سفارشات

کمیٹی نے Oriental Education کے عنوان سے دینی مدارس اور دار العلوموں کی صورتحال کا جائزہ پیش کیا۔ قرآن وحدیث وفقہ اور دیگر دینی موضوعات کی تعلیم میں ان اداروں کی خدمات کا ذکر کیا گیا، ان کی تحسین کی گئی اور ان کی مشکلات بیان کرنے کے ساتھ ساتھ ان کی کمزوریاں بھی ذکر کی گئیں۔ ان کی بڑی کمزوری یہ تھی کہ ان میں تحقیقات اسلامی کا کوئی کام نہیں ہو رہا تھا جس سے یہاں کے فضلا قرآن وحدیث اور فقہ وغیرہ میں اچھے محققین مہیا کر سکیں۔ کمیٹی نے ان کا تحقیقاتی معیار بلند کر کے اسلامی تہذیب کی نشاۃ ثانیہ کے معیار پر لانے کے انتظامات کرنے کی سفارش کی۔ یہ کام کرنے کو انہوں نے بحیثیت مسلمان سب مسلمانوں کا فرض قرار دیا۔ انہوں نے آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کو سفارش کی کہ فوری طور پر All India Board of Oriental Education تشکیل دے اور اس بورڈ کو اختیار دے کہ وہ ان مدارس سے رابطہ کر کے صوبوں اور نوابی ریاستوں کے دینی مدارس کے نصاب اور سکیم آف سٹڈی کو اس سطح پر لانے کے لیے ان کی مدد کریں، انھیں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیے تیار کریں، تحقیقی کام کو اپنی سکیم میں شامل کرنے میں مدد دیں اور مناسب ہو گا کہ وقتاً فوقتاً یہاں سے تحقیقی کتب کی اشاعت ہوتی رہے۔ کمیٹی نے بورڈ کی تشکیل اور علاقوں کی نمائندگی کا ایک خاکہ بھی پیش کیا[24]۔ انہوں نے تجویز دی کہ یہ ایک اعلیٰ پیمانے کا خود مختار بورڈ ہو، اس کے عہدیداروں کا تقرر گورنر جنرل کرے، مسلم نوابی ریاستوں سمیت پورے ہند سے نمایاں علمی شخصیات کا اس کے ارکان کے طور پر تقرر ہو، مدارس کے طلبہ اس کے تحت امتحان دیں، دینی علوم کے اعلیٰ درجہ سے ماہرین ان سے پیدا ہوں اور وہ ایسا مقام حاصل کریں کہ اسلامی تہذیب وثقافت کے احیاء کے لیے کام کر سکیں۔

ثانوی تعلیم: تبصرہ اور سفارشات

ثانوی سطح کی مسلم تعلیم کا جائزہ لینے کے لیے پانچ پہلوؤں کو پیش نظر رکھا گیا۔ ا)۔ ثانوی سکولوں کی

---

[24]- Report Nawab Kamal Yar Jang , p253- 255.

انتظامی سر براہی، ۲)۔ مسلم ہائی سکولوں کی کارکردگی، ۳)۔ نصاب اور مضامین مطالعہ، ۴)۔ انتظامی کمیٹی اور ۵)۔ ذریعہ تعلیم اور ذریعہ امتحانات۔

اس سروے پر جوابات بہت کم تعداد میں ملے۔ جو جوابات ملے ان کا خلاصہ یہ تھا کہ ۱)۔ ثانوی تعلیم کے سکولوں کی انتظامی سر براہی اور اختیارات عموماً غیر مسلم لوگوں کے ہاتھ میں ہیں، یہاں تک کہ مسلم اکثریت کے صوبوں میں بھی یہی صورت حال ہے۔ ثانوی تعلیمی بورڈوں اور جن یونیورسٹوں میں ابھی تک ثانوی تعلیم کے انتظامات موجود ہیں ان میں مسلمانوں کی مناسب اور مؤثر نمائندگی ہونی ضروری ہے۔ ۲)۔ جن صوبوں میں ابھی تک ثانوی تعلیم کے بورڈ نہیں ہیں ان میں ان کی فوراً تشکیل کرنے کی ضرورت ہے۔ ان میں مسلمانوں کی مناسب اور مثر نمائندگی بھی ہو۔ ۳)۔ مسلم ہائی سکولوں کا انتظام و انصرام مناسب طریقے سے نہیں چل رہا ہے۔ اس کی وجہ بعض مقامات پر جماعتی سیاست ہے، بعض جگہ ڈکٹیٹر شپ ہے اور بعض جگہ فنڈز کی کمی۔ ۴)۔ موجودہ نصاب اور درسی کتب مسلمانوں کے خلاف تعصب پر مبنی ہیں۔ ان میں فوری تبدیلی کر کے مسلم ثقافت پر مبنی مضامین شامل کرنے کی ضرورت ہے۔ اسی طرح ادبی مطالعات میں مسلم تاریخ اور نصاب میں اسلامی درسی مضامین شامل کرنے کی ضرورت ہے۔ ۵)۔ ثانوی تعلیم کے تمام سکولوں کی انتظامی کمیٹیوں میں مسلمانوں کی مناسب نمائندگی ہونی چاہیے۔ ۶)۔ ذریعہ تعلیم کے بارے میں مختلف آرا آئیں۔ کسی نے مادری زبان میں تعلیم کی تائید کی، کوئی انگریزی زبان کو جاری رکھنے کے حق میں تھا۔ یہ آرا غالباً کچھ ہندوستانیوں کی طرف سے سنسکرت کو ذریعہ تعلیم بنانے کی تحریک کے رد عمل کے طور پر تھیں۔

ذریعہ تعلیم

کمیٹی نے اس سلسلے میں مختلف علاقوں کے ماہرین تعلیم اور سماجی قائدین سے اپنے تبادلۂ خیالات کا ذکر بھی کیا اور پھر تجویز دی کہ کم از کم مسلمانوں کے لیے تعلیم ان کی مادری زبان میں ہی ہونی چاہیے۔

ثانوی تعلیم کے بارے میں مسلمانوں کی خواہش

کمیٹی نے سروے کے دوران حاصل ہونے والی مسلمانوں کی رائے عامہ کا خلاصہ یوں پیش کیا کہ وہ

ثانوی سطح کی مسلم تعلیم کے بارے میں پریشان ہیں اور اخبارات میں اس کا بکثرت اظہار کر رہے ہیں۔ کانگریس کی صوبائی حکومتوں کا نظام تعلیم نافذ ہونے کے بعد اس پریشانی میں بہت اضافہ ہو چکا ہے۔ اس مسئلے کا حل دو نکات میں پیش کیا گیا۔ ایک یہ کہ مسلمانوں کا ثانوی تعلیمی نظام ان کی اپنی تہذیب وثقافت سے مناسب تر ہونا چاہیے اور دوسری یہ کہ یہ نظام ملک میں رائج ثانوی تعلیم کی عمومی سکیم سے بھی ہم آہنگ ہو۔ اس تعلیمی نظام میں بہت سے معاملات ایسے ہیں جن کے بارے میں مسلمان خاص طور پر پریشان ہیں۔

کمیٹی کی مجوزہ ثانوی تعلیمی سکیم

اس سروے کی روشنی میں کمیٹی نے مسلمانوں کے لیے ثانوی تعلیم کی ایک عارضی سکیم بنا کر پیش کی اور بتایا کہ اس میں حسب ضرورت نظر ثانی اور تبدیلی بھی کی جاسکتی ہے:

- ثانوی تعلیم ۱۲ سال کی عمر سے شروع ہو اور ۴ سال تک جاری رہے۔
- داخلے کے اہل وہ طلبہ ہوں گے جنہوں نے ۶ سالہ پرائمری تعلیم حاصل کی ہو اور کم از کم ۳۳ فی صد نمبر لیے ہوں۔
- اس کے علاوہ جو بچے ہوں گے انہیں فنی تعلیم وتربیت کے اداروں میں لازمی بنیادوں پر داخلہ دے کر کوئی فن سکھایا جائے گا تاکہ کام کاج میں اپنے والدین کی مدد کریں۔
- ثانوی تعلیم کا مقصد یہ ہوگا کہ ۱۶ سال کی عمر تک پہنچتے ہوئے بچوں کو درج ذیل کاموں کے قابل بنانے کے لیے ضروری صلاحیت مہیا کی جائے:
    - یونیورسٹی میں علم حاصل کرنے کے قابل ہو جائیں۔
    - فنی اور پیشہ ورانہ تعلیم حاصل کرنے کے قابل ہو جائیں۔
    - سرکاری ملازمت یا عوامی خدمت کے قابل ہو جائے۔
    - پرائیویٹ کاروبار کرنے یا پیشہ اختیار کرنے کے قابل ہو جائے۔
    - انہی ضروریات کو مد نظر رکھ کر اس مرحلے کا نصاب تیار کیا جائے۔

اس مرحلے پر تعلیم کی مزید مجوزہ خصوصیات درج ذیل ہیں:

- اس مرحلے پر تعلیم مادری زبان میں دی جائے۔
- داخلے کے لیے پرائمری کا وہ نصاب پاک ہونا اور اس کے مطابق صلاحیت موجود ہونا ضروری ہو گا جو سکیم آف سٹڈی یہ کمیٹی پرائمری مرحلے کے لیے تجویز کر رہی ہے۔
- پرائمری سطح پر سکھائے گئے امور دستکاری[25] کی مشق کرنے کے لیے ثانوی تعلیم کے ۴ سالوں کے ٹائم ٹیبل میں مناسب گنجائش رکھی جائے۔
- ہر صوبے میں درج ذیل نوعیت کے ثانوی سکول قائم کیے جائیں۔ ضروری نہیں کہ ہر نوعیت کے لیے الگ سکول ہو، حسب ضرورت دو دو نوعیتوں کو ایک ایک ادارے میں بھی جمع کیا جاسکتا ہے۔
  1. آرٹس اور سائنس کے ثانوی سکول
  2. کامرس کے ثانوی سکول
  3. زراعت کے ثانوی سکول

کمیٹی نے آبادی کے لحاظ سے سکولوں کی تعداد کے بارے میں تجاویز دیں۔ ان سکولوں میں تمام مذاہب کے بچے پڑھیں گے اور ان کا انتظام حکومت کے پاس ہو گا یا حکومت کی مدد سے عوامی کمیٹی کے پاس ہو، مگر مؤخر الذکر صورت میں انتظامی کمیٹی میں ہندو، مسلمان اور دیگر ادیان کے نمائندے شامل ہوں۔

ثانوی سکولوں میں دینی تعلیم

کمیٹی نے تجویز دی کہ

1. ایسے سکولوں میں ہندوستان کی دونوں بڑی آبادیوں کی مذہبی تعلیم بھی دی جائے۔

---

[25]- اس کا مقصد شاید واردھا سکیم کے تحت ان صوبوں میں جاری نصاب کا حوالہ دینا ہے جو بنیادی طور پر پرائمری کی سطح پر پیشہ ورانہ مہارتیں سکھانے پر مبنی تھی۔ کمیٹی چاہ رہی تھی کہ اسی نظام کے اندر مسلم ایجوکیشن کا خاطر خواہ انتظام ہو جائے۔

2. اگر عوامی کمیٹی کے زیر انتظام سکولوں میں دینی تعلیم دینا ممکن نہ ہو تو مسلم عوام کا مطالبہ ہے کہ ہر ٹاؤن میں گورنمنٹ سیکنڈری سکول کھولے جائیں اور ہر سکول میں مسلمانوں کی آبادی کی نسبت سے سیٹیں مختص کر دی جائیں، اور مسلم طلبہ کی دینی تعلیم کے لیے خصوصی شقیں شامل کی جائیں۔
3. اگر یہ تجویز بھی قابل قبول نہ ہو تو صوبائی حکومت صوبے کی مقننہ میں مسلم ارکان کے تناسب سے تعلیمی بجٹ مہیا کرے تاکہ مسلمان اپنے لیے حکومت کی سرپرستی میں سیکنڈری سکول قائم کر کے چلا سکیں۔
4. ثانوی تعلیم کے سکول ۴ سالہ تعلیم پر مشتمل ہوں، ان ہی میں حسب ضرورت پرائمری سکول بھی قائم کیے جا سکتے ہیں اور صرف ثانوی بھی بنائے جا سکتے ہیں۔
5. ہر سکول میں کل ۱۲ سیکشن ہوں، ہر کلاس کے حصے میں ۳ سیکشن آئیں اور ہر سیکشن میں ۳۰ طلبہ ہوں۔ سکول کے کل بچوں کی تعداد ۳۶۰ ہو[26]۔
6. کمیٹی نے اخراجات کا حساب لگا کر اس سکیم کے مطابق قائم کیے جانے والے ہر سکول پر 11,000 (گیارہ ہزار) روپے خرچ آئیں گے اور اگر ایک صوبے میں اس قسم کے 100 سکول کھولے جائیں تو کل خرچہ صرف 11, 00, 000 لاکھ روپے ہو گا۔
7. اگر موجودہ حالات میں یہ ممکن نہ ہو تو حکومت صوبائی اسمبلی مسلم ارکان کے تناسب سے ثانوی تعلیم کی گرانٹ کا حصہ مسلمانوں کے لیے الگ کر دے۔

عمل درآمد کی تجویز

ا۔ یہ دیکھنے کے لیے کہ ان سرکاری سکولوں میں تعلیمی نظام ٹھیک سے کام کر رہا ہے اور مسلمان بچے کسی تعصب کا سامنا نہیں کر رہے ہیں، یہ تجویز ہے کہ ہر صوبے کے شعبۂ تعلیم کے افسران میں ایک مسلم اسسٹنٹ ڈائریکٹر، ایک مسلم انسپکٹر، ۳ کے قریب مسلم اسسٹنٹ

---

[26]۔ کمیٹی نے ملحق G میں سیکنڈری سکول کی عارضی سکیم تیار کر کے بھی پیش کی۔

ڈائریکٹر مقرر کیے جائیں تاکہ وہ وقتاً فوقتاً سرکاری سکولوں کی کارکردگی کا جائزہ بھی لیتے رہیں اور سرکاری امداد سے قائم ہونے والے سکولوں کا بھی۔ اور پھر اپنے معائنے کی رپورٹ شعبۂ تعلیم کو پیش کریں۔

۲۔ ہر سرکاری سکول میں اور حکومت کی امداد سے چلنے والے سکول میں مسلم اساتذہ کا تقرر اس صوبائی اسمبلی میں منتخب مسلم ارکان کے تناسب سے کیا جائے۔

مختلف مکاتب فکر کے ادارے

کمیٹی نے وضاحت کی کہ حکومتی امداد کے تحت مسلم سکول قائم کرنے سے مراد یہ نہیں ہے کہ ہم مختلف مکاتب فکر تعلیمی ادارے ختم کرنے کی تجویز دے رہے ہیں، بلکہ مقصد یہ ہے کہ مسلم تعلیمی ادارے قائم کرنے کے لیے حکومتی امداد عام حالات میں مکتب فکر کی بنیاد پر قائم کیے جانے والے اداروں کو ہی دی جائے۔ البتہ خاص حالات میں، یعنی اگر یہ ادارے دیگر مکاتب فکر کے طلبہ کو داخلہ دینے سے انکار کر دیں تو دوسری بات ہے۔ دوسرے مکتب فکر کے طلبہ کی سیٹیں کل تعداد کے ۲۰ فی صد تک ہونی چاہئیں، جیسا کہ یورپی سکولوں میں شرط رکھی گئی ہے۔

مسلم ایجوکیشن بورڈ قائم کرنے کی تجویز

کمیٹی نے مزید تجویز دی کہ مکاتب فکر کی بنیاد پر قائم شدہ اداروں کے لیے آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس ایک غیر سرکاری بورڈ آف مسلم ایجوکیشن تشکیل دے۔ اس کے ارکان میں اسلامی انجمنوں، اسلامی مدارس کے منتظمین، اسلامی مدارس کے سربراہان اور دیگر ایسی مسلم ایجوکیشنل باڈیز کے نمائندے شامل ہوں جن کی صوبائی سطح پر اہمیت ہو۔ یہ بورڈ حکومت سے منظور کرایا جائے۔ یہ بورڈ مکاتب فکر کی بنیاد پر قائم ہونے والے مدارس کے لیے قواعد وضوابط مرتب کرے، ان اداروں کے لیے یکساں انتظامی پالیسی تشکیل دے اور اس بات کی نگرانی کرے کہ ان اداروں میں صحت مند تعلیمی ماحول قائم رہے۔

بورڈ تشکیل دینے کی یہ تجویز اس متفقہ رائے عامہ کی روشنی میں دی گئی ہے جس کے مطابق تمام صوبوں کے لوگوں نے شکایت کی ہے کہ مسلم ادارے عموماً اچھی طرح کام نہیں کر رہے ہیں، نہ ان سے وہ مقاصد حاصل ہو پا رہے ہیں جن کی ان سے توقع رکھی جاتی ہے۔

مسلم مدارس میں نمایاں اسلامی شعائر کی کمی

دوران سروے ہمیں بعض مدارس کے طریق تعلیم و تربیت کو دیکھنے کا موقع ملا جس سے ہماری عمومی رائے یہ قائم ہوئی کہ ایسے مدارس میں نمایاں اسلامی علامات پیش کرنے کی کمی ہے۔ اداروں کی دیواروں پر نصابی کتابوں سے ہر قسم کے اقوال زریں اور نقش و نگار لے کر سجا دیے گئے تھے مگر ان میں قرآن مجید سے یا دیگر مقدس نصوص سے لی ہوئی ہوئی کوئی چیز نظر نہیں آئی۔ بڑے بڑے بادشاہوں، سرداروں اور سورماؤں کی تصاویر بھی سکول کی دیواروں پر لگائی گئی تھیں مگر نمایاں اسلامی شخصیات کا کہیں نشان نظر نہیں آ رہا تھا۔

ہاسٹلوں میں مسلم طلبہ کے رہائشی کمروں میں بھی ایسا کوئی انتظام نہیں کیا گیا جس سے مسلم طلبہ کے لیے اسلامی فضا قائم رکھنے میں مدد ملے۔

ہم نصابی سرگرمیوں میں بھی ایسی کوئی چیز شامل نہیں جو مسلم طلبہ میں صحت مند اسلامی روح بیدار کر سکے۔

بلاشبہ ان اداروں میں اکثر دینیات کا مضمون پڑھانے کی گنجائش موجود ہے مگر یہ تدریس بالکل ایک معمول کی طرح کی جاتی ہے، کوئی خاص توجہ اور غور و فکر اس تعلیم کا حصہ نہیں ہوتا۔

ثانوی تعلیمی بورڈ

کمیٹی نے صوبوں میں ثانوی تعلیمی بورڈ قائم کرنے کی جو تجویز دی تھی اس کی وضاحت کرتے ہوئے انہوں نے ان بورڈز کے لیے درج ذیل مقاصد طے کیے:

- اداروں کی منظوری کے قواعد و ضوابط مرتب کرنا۔

- نصاب تشکیل دینااور درسی کتب کا تعین کرنا۔
- امتحانات کا انتظام کرنا۔
- بورڈ کو ان مقاصد کے حصول کے لیے تمام ضروری اختیارات حاصل ہونا۔
- ان بورڈز اور ان کے تحت مندرجہ بالا مقاصد کے لیے قائم کی جانے والی کمیٹیوں میں مسلمانوں کی نمائندگی صوبائی اسمبلیوں میں منتخب مسلم ارکان کے تناسب سے ہو۔

خواتین کی تعلیم

ثانوی تعلیمی مرحلے پر مسلمان بچیوں کے لیے علیحدہ سکول قائم کیے جائیں۔ پہلے سے قائم عام گرلز سکولوں میں مسلم طالبات کے لیے کو اسلام کے حوالے سے کوئی خاص سہولت فراہم نہیں کی گئی۔

اس قسم کے تعلیمی اداروں کے قیام اور انہیں چلانے کے بارے میں انتظامی مشکلات سے کمیٹی پوری طرح آگاہ ہے مگر اس صورت حال سے نکلنے کے لیے اقدام کرنا بھی ضروری ہے۔ کمیٹی نے تجویز شعبۂ تعلیم ہر صوبے میں مسلم بچیوں کے لیے علیحدہ ثانوی سکول ایک مناسب تعداد میں قائم کردے۔ اگر ایسے مزید اداروں کی ضرورت ہو تو مسلم آبادی خود ایسے سکول قائم کرے اور انہیں صوبائی مسلم ایجوکیشن بورڈ کے زیر نگرانی دے دے جیسا کہ لڑکوں کے سکولوں کے بارے میں تجویز دی گئی ہے۔

ذریعہ تعلیم

ہندوستان کے اندر اور باہر ماہرین تعلیم اس بات پر متفق نظر آتے ہیں کہ اس تعلیمی مرحلے میں ذریعہ تعلیم و امتحانات مادری زبان ہو، مگر اصل مسئلہ فرقہ وارانہ غلط فہمیوں اور تنازعات کا ہے۔ اس وقت پورے ہندوستان میں نئی نئی بولیاں جنم لے رہی ہیں۔ عام حالات میں ہندوستان کی دو بڑی آبادیوں کی مشترکہ زبانیں جو صدیوں سے ایک ساتھ رہ رہی ہیں اور جن زبانوں کی بنیادیں ہمارے آباء واجداد نے مضبوط کرکے رکھی تھیں، ان کو ذریعہ تعلیم بنانے پر فوری طور پر اتفاق ہو جانا چاہیے۔ اس کے ساتھ ساتھ ذریعہ تعلیم بنائی جانے والی زبانوں کی فنی اصطلاحات کے سلسلے میں پیش آنے والے

مسائل کے حل کے لیے لسانیات کے محققین اور ماہرین علوم پر مشتمل انہی خطوط پر ایک بورڈ تشکیل دیا جائے جن خطوط پر پہلے ایک مشاورتی تعلیمی بورڈ تشکیل دینے کی تجویز دی جاچکی ہے۔ یہ بورڈ اصطلاحات کے بارے میں تجاویز مرتب کرے اور ان اصطلاحات کو ہر صوبے میں بسنے والی دونوں بڑی اقوام کی زبان میں مناسب طریقے سے شامل کر دیا جائے۔ امید ہے کہ دونوں بڑی اقوام جو اس وقت ایک دوسری کے ساتھ سینگ پھنسائے ہوئے، وقت گزرنے کے ساتھ باہمی خیر سگالی اور تحمل کی ضرورت کو سمجھ جائیں گی۔ اگر اس کے باوجود بھی اس مسئلے پر کوئی سمجھوتہ نہ ہو سکے تو مسلمانوں کے لیے ذریعۂ تعلیم اور امتحانات فی الحال انگریزی ہی کو رہنا چاہیے اور انہیں کسی ایسی زبان میں تعلیم حاصل کرنے پر مجبور نہیں کرنا چاہیے جو ان کی مادری زبان نہیں ہے۔ انگریزی میں تعلیم، تعلیمی لحاظ سے ان کے لیے جس قدر بھی بری ہو، ان کی اپنی زبان کی وحدت کو تو پارہ پارہ نہیں کر سکے گی، نہ ہی ان کی تہذیب اور اور روایات کی تخریب تباہی کا ایک اور ذریعہ تو نہیں بنے گی[27]۔ یا پھر ایک تجویز یہ ہو سکتی ہے کہ ہر سرکاری سکول یا سرکاری امداد سے چلنے والے سکول میں طلبہ کو ان کی اپنی اپنی مادری زبانوں میں ہی تعلیم دی جائے۔ اس سے بنگال اور کچھ دیگر صوبوں کے وہ حصے مستثنیٰ ہوں گے جہاں اردو زبان میں تعلیم دینے پر اتفاق پایا جاتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہو سکتا ہے کہ کچھ صوبوں میں یا تو ہر سکول دوہرے سٹاف کا انتظام کرنا ہو گا یا مسلمانوں اور ہندوؤں کے لیے الگ الگ سکول قائم کرنا ہوں گے۔

اگر ان متبادل طریقوں میں سے کوئی بھی قابل قبول نہیں ہوتا تو ہندوستانی مسلمانوں کے لیے اس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں ہو گا کہ وہ اپنی تہذیبی اور دینی شناخت کو خطرے سے محفوظ کرنے کے لیے، ثانوی تعلیم کے ہر مشترکہ نظام سے علیحدگی اختیار کر لیں اور صوبائی تعلیمی بجٹ سے اپنا حصہ الگ کر کے دینے کا مطالبہ کریں تاکہ وہ اپنے لیے ثانوی تعلیم کا مستقل بندوبست کر سکیں[28]۔

---

[27]- شاید یہ اس زمانے میں اہون البلیتین کے طور پر Less Evil ہو مگر بعد میں اس نے بھی وہی درجہ حاصل کر لیا، جس کے خطرات کا اظہار کمیٹی کی رپورٹ نے سنسکرت، یا ہندی کے بارے میں کیا تھا۔

[28]- کمیٹی نے اپنی رپورٹ کے ضمیمہ G میں اس کا عملی خاکہ اور تدریسی مواد کی تفصیل شامل کر دی۔

اس کے بعد Secondary Education پھر Primary Education اور Schools of Oriental learning کا پورا جائزہ اور ہر ایک کا مجوزہ خاکہ پیش کیا۔ رپورٹ کے صفحہ ۲۷۱ پر اس پورے جائزہ کا خلاصہ ذکر کیا گیا ہے اور سفارش کی گئی ہے کہ 'مسلم ایجوکیشنل کانفرنس' اس پر مزید کام جاری رکھے۔ آخر میں ایک بار پھر یہ بات زور دے کر کہی گئی ہے کہ جو معلومات ہم نے جمع کر دی ہیں اور جو سفارشات مرتب کر دی ہیں ان کی روشنی میں آئندہ کئی سالوں تک اس کام کو جاری رکھنا بہت ضروری ہے[29]۔ اس پر سربراہ کمیٹی نواب کمال یار جنگ بہادر اور دیگر آٹھ ارکان کے دستخط بنائے گئے ہیں۔ کچھ معزز ارکان کمیٹی نے اس رپورٹ کے بارے میں کچھ اختلافی نوٹ بھی لکھے ہیں، انہیں بھی صفحہ ۲۷۲ سے ۳۰۱ تک رپورٹ کا حصہ بنایا گیا ہے۔ سب سے طویل نوٹ گشتی کمیٹی کے چیئرمین سر محمد عزیز الحق صاحب کا ہے۔ اسے بذات خود 'مستقل مسلم ایجوکیشن سکیم' قرار دیا جائے تو شاید غلط نہ ہو۔ یہ ۲۸ صفحات پر مشتمل ہے اور اس میں ہند کے طول و عرض کے دوروں سے حاصل ہونے والے تجربات کو بھی مختصراً بیان کیا گیا ہے، گشتی کمیٹی کے ارکان کا شکریہ بھی ادا کیا گیا ہے اور کچھ مستقل تجاویز بھی دی گئی ہیں۔

کمیٹی نے یہ بھی تجویز دی کہ ثانوی تعلیم کے آخری سالوں میں ہر ادارے کو شام کے وقت عمومی موضوعات پر خصوصی محاضرات کا انتظام کرنے کا پابند کیا جائے جن میں حاضری اور تحریری نوٹس لینا تمام طلبہ کے لیے لازم ہو۔

ثانوی تعلیم کا ۴ سالہ نصاب مکمل کرنے کے بعد مرحلۂ ثانویہ کے دو سالوں کا عوامی امتحان لیا جائے جس میں سوالات ایسے شامل کیے جائیں جن سے درسی مضامین کے بارے میں طلبہ کی فکری اور تجزیاتی صلاحیتوں کا اندازہ لگایا جا سکے جو انہوں نے اس مرحلے کی تعلیم کے دوران حاصل کیں۔ اس سلسلے میں سوالات کی بوچھاڑ کرنے کی مکمل حوصلہ شکنی کی جائے۔

اس رپورٹ میں سکولوں کی ہم نصابی سرگرمیوں کے بارے میں کوئی تجویز نہیں دی گئی کیوں کہ اس

---

[29]- آئندہ ابواب میں نظام حکومت اور نظام معیشت، معاشرت کے بارے میں جن کمیٹیوں، مضامین اور دستاویزات کا ذکر ہے وہ اسی کام کا تسلسل تھا جسے مسلم لیگ کے زیر نگرانی انجام دیا گیا، مرتب۔

کا فیصلہ کرنا ہر سکول کا اپنا کام ہے۔ اس کا زیادہ تر دار ومدار سکول سٹاف کی دستیابی اور ان کے جذبے پر ہوگا۔

اسی طرح جسمانی ورزش وغیرہ کے بارے میں بھی کوئی تجویز نہیں دی گئی حالانکہ یہ کمیٹی اسے سکول لائف کی ایک انتہائی ضروری سرگرمی سمجھتی ہے۔ ہر سکول میں اس سرگرمی کی سہولت ہونی چاہیے مگر اسے درسی مضمون کا درجہ دینے کی ضرورت نہیں۔

پرائمری تعلیم (نظام تعلیم کا خاکہ)

کمیٹی نے جن جن مقامات کا دورہ کیا ان میں اپنے فرائض منصبی کے اندر رہتے ہوئے مقامی حالات کا مطالعہ کیا اور نافذ العمل نظام تعلیم کا اس نظر سے جائزہ لیا کہ اس سے ان علاقوں کے مسلمانوں کی سماجی، معاشی اور ثقافتی زندگی پر کیا اثرات پڑ رہے ہیں اور ملک کے دیگر حصے ان سے کیسے متاثر ہو رہے ہیں۔ کمیٹی نے یہ جائزہ لینے پر خصوصی توجہ دی کہ آیا کوئی ایسی سرگرمی بھی کارفرما ہے جس سے مسلمانوں کی وحدت کو نقصان پہنچے یا جس کا مقصد ایسا نقصان پہنچانا ہو۔ کمیٹی نے بیان کیا کہ عوامی قائدین اور ماہرین تعلیم سے تبادلۂ خیالات کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچے کہ ''ریاست ڈنمارک میں سب کچھ اچھا نہیں ہے''[30]۔ اس لیے کمیٹی نے اس مرحلے پر مسلم ایجوکیشن کے لیے نئی تجاویز دینے کا فیصلہ کیا جو مسلمانوں کی ضروریات سے ہم آہنگ ہوں اور موجودہ صورتحال میں بہتری لا سکے۔

اس کے لیے اصولی فیصلہ یہ کیا گیا کہ یہ تجاویز مرتب کرتے وقت یہاں کی ثقافت کا یکساں ہونا پہلے سے طے نہیں کر لیا جائے گا۔

وسیع خاکہ (Broader outline)

وسیع خاکے کے طور پر یہ تجوز دی گئی کہ جہاں تک ممکن ہو مفت اور لازمی تعلیم اردو زبان میں دی

30۔ ضرب المثل ہے جس سے یہ بتانا مقصود ہے کہ وہاں حالات ٹھیک نہیں۔ اس سے موجودہ خرابیوں اور آئندہ خطرات کی خبر دی جاتی ہے۔

جائے کیوں کہ ہمارے خیال میں صرف اردو ہی ہندوستان کی مشترکہ زبان قرار دیا جاسکتی ہے۔ البتہ سروے کے دوران یہ تجویز بھی کمیٹی کے سامنے پیش کی گئی کہ شمالی مشرقی صوبہ، پنجاب، کشمیر، صوبجات متحدہ (آگرہ، اودھ، دہلی)، مرکزی صوبجات، بمبئی، میسور، آندھرا اور اسی طرح کے دیگر ایسے صوبہ جات اور ریاستوں میں جہاں مقامی مسلمان اس کی حمایت کریں اردو ہی تدریسی زبان ہونی چاہیے۔ بصورت دیگر طلبہ کی مادری زبان کو ذریعہ تدریس بنادیا جائے۔ اس کے لیے درجِ ذیل انواع کے ادارے ہوں:

1. شہری پرائمری سکول
2. دیہاتی پرائمری سکول
3. لڑکیوں کے پرائمری سکول
4. مسلم یتیم خانوں کے ساتھ ملحقہ، یا یتیم خانوں پر مشتمل صنعتی پرائمری سکول بھی ہونے چاہئیں جہاں صنعتی تعلیم دی جاسکے، اور
5. مسلم پرائمری اساتذہ کی تربیت کے لیے ٹریننگ سکول ہونے چاہئیں، البتہ اسی پر ہمیں اکتفا نہیں کرنا چاہیے بلکہ ہمیں نئی مشرقی سمت سازی (Re-Orientation) کے اقدامات بھی کرنے چاہئیں۔ یا
6. علوم شرقیہ کے مکاتب اور مدارس کی، کسی حد تک، تنسیق نو کرکے ان کا ربط جدید مضامین کے ساتھ قائم کرنا چاہیے۔

عملی تجاویز

1. ان تجاویز کو عملی جامہ پہنانے کے لیے ہمیں درج ذیل انتظامات کرنا ہوں گے:
2. مجوزہ تبدیلیوں کو شامل کرنے کے لیے نئی نصابی کتب تیار کرنا؛ مگر
3. جہاں نئی کتب کی تیاری میں مالی رکاوٹیں ہوں وہاں موجودہ درسی کتب میں سے انتہائی احتیاط سے انتخاب کیا جائے

4. دونوں صورتوں میں مسلم لڑکوں اور لڑکیوں دونوں کے لیے دینی تعلیم ضرور شامل کی جائے
5. ہمارا اصل مقصد دوہرے تعلیمی ادارے قائم کرنا نہیں، ہمارے خیال میں موجودہ پرائمری سکولوں کو بڑی آسانی سے ہمارے تجویز کردہ نظام میں تبدیل کیا جاسکتا ہے[31]۔

درسی کتب کی تیاری

ہم پہلے تجویز دے چکے ہیں کہ آل انڈیا ایجوکیشنل کانفرنس ایک صوبائی مسلم ایجوکیشن بورڈ قام کرے۔ یہاں یہ تجویز دی جارہی ہے کہ اسی بورڈ کے تحت ڈویژن کی سطح پر بورڈ قائم کیے جائیں۔ یہ بورڈ صوبے کی سطح پر آپس میں رابطے میں رہیں اور تبادلۂ خیالات کرتے رہیں۔ اسی طرح حکومتی تعلیمی شعبوں اور لوکل باڈیز کے ساتھ بھی ان کا رابطہ رہے۔ مسلم بورڈ کی ذمہ داری ہوگی کہ مسلم تعلیم کے مفادات پر گہری نظر رکھے اور ہندوستان کے مختلف حصوں میں ہر موضع میں تعلیم سے متعلقہ مسائل کے سلسلے میں مسلمانوں کو مشورہ بھی دے اور ان کی مدد بھی کرے۔

آل انڈیا ایجوکیشنل کانفرنس کی ایک ذیلی کمیٹی بعنوان "نصابی کتب کمیٹی"، جس میں تمام صوبائی بورڈوں کی نمائندگی ہو:

1. اپنے انسپکٹروں کے ذریعے وقتاً فوقتاً نافذ العمل درسی کتب کا جائزہ لیتی رہے کہ کہیں مسلمانوں کو کسی قابل اعتراض مواد کی تعلیم تو نہیں دی جارہی۔
2. مختلف تعلیمی مراحل کے لیے اردو، دینیات اور اسلامی تاریخ کی درسی کتب کی تیاری پر غور خوض کرے۔
3. اشاعتی اداروں کے ساتھ رابطہ کرکے ان کتب کی اشاعت کا انتظام کرے، حکومتی ٹیکسٹ بک کمیٹی، یا دیگر متعلقہ اداروں کو یہ کتب ا ایسے سکولوں کے نصاب میں شامل کرنے کی سفارش کرے جس کا انتظام وانصرام مسلمانوں کے ہاتھ میں نہیں ہے۔
4. مسلم سکولوں اور مدارس کے سربراہان کو اطلاع دے کہ فلاں فلاں مضامین کی نصابی کتب

---

[31] - کمیٹی نے اپنی رپورٹ کے ضمیمہ H میں اس تعلیمی خاکے کی تفاصیل مہیا کردیں۔

دستیاب ہیں۔

5. مختلف لوگوں کو علی گڑھ میں قائم مرکزی بک ڈپو سے یا اگر ممکن ہو تو صوبائی کتب خانوں کی مدد سے یہ کتب خریدنے میں مدد دے۔

درسی کتب کا انتخاب

درسی کتب کی تیاری پر وقت لگ سکتا ہے، اور اس میں ممکنہ طور پر مالی مشکلات بھی آسکتی ہیں۔ تجویز ہے کہ عارضی طور پر آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی درسی کتب کی کمیٹی عبوری مدت کے لیے مسلمانوں کی تعلیم کے لیے کچھ کتب کے انتخاب میں مدد دے۔ حکومت کی صوبائی کمیٹی برائے درسی کتب میں صوبائی بورڈز کی نمائندگی ہونی چاہیے، تاکہ یہ نمائندے ان سکولوں کے لیے بھی کتب کے انتخاب میں مدد دیں جن کا انتظام مسلمانوں کے ہاتھوں میں نہیں ہے، اور مسلمانوں کے لیے بھی۔ کوئی ایسی درسی کتاب مقرر کرنے کی اجازت نہیں ہونی چاہیے جس کے بارے میں ان کمیٹیوں کے مسلم نمائندوں نے ۳/۲ (تین میں سے دو) کی نسبت سے مخالفت میں رائے دی ہو۔

کمیٹی نے تعلیم کے مالیاتی معاملات کے بارے میں سفارشات پیش کیں۔ البتہ انہوں نے اصولی بات بتائی کہ ہم حکومت پر ضرورت سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالنا چاہتے۔ حتیٰ کہ جب ہم دینیات کی تدریس یا اردو کی تدریس یا اردو کے ذریعے تعلیم دینے کی سہولت کا مطالبہ کرتے ہیں تب بھی یہ مقصد نہیں ہوتا۔

علوم شرقیہ کے ادارے

یہ ادارے ہندوستان میں بڑی تعداد میں موجود ہیں۔ ضروری ہے کہ ان اداروں کے منتظمین بھی ہماری ان تجاویز کو روبہ عمل لانے میں ہمارے ہاتھوں میں ہاتھ دیں۔

خلاصہ

کمیٹی نے یہ تجاویز دے کر امید ظاہر کی کہ اس پر کام آئندہ جاری رہے گا۔ رپورٹ پر جن ارکان نے دستخط کیے انہوں نے اپنے کچھ اختلافی نوٹ بھی لکھے۔ ان میں سر شیخ عبد القادر، پرنسپل ڈبلیو ایچ

صدیقی اور عزت مآب سر محمد عزیز الحق کا نوٹ شامل ہے۔ مؤخر الذکر نوٹ زیادہ تفصیلی ہے۔

سر محمد عزیز الحق نے زیر بحث نظام تعلیم بنانے والوں کی نیت پر شک کرنے سے انکار کیا، البتہ ان نتائج سے اتفاق کیا کہ اس نظام کے تمام معاشی، سماجی اور سیاسی فوائد کے باوجود وہ ہندوستانی مسلمانوں کے ثقافتی اور سماجی نظام کی شکست وریخت کا سبب بنا ہے۔ انہوں نے مختلف علاقوں کی کچھ مثالیں دیں۔ انہوں نے مدراس، بمبئی، سی پی اور برار کا ذکر کیا۔ انہوں نے مسلمانوں کو اردو میں تعلیم حاصل کرنے کے مواقع نہ دینے کو سب سے بڑی غلطی قرار دیا۔ پھر انہوں نے وضاحت کی کہ مسلمانوں کو ادبی نصوص کے طور پر تمام ہندو عقائد اور شخصیات کے بارے میں پڑھنا پڑتا ہے اور اسے اسلامی عقائد اور شخصیات پڑھنے کا موقع کم ہی ملتا ہے۔ اسی طرح تاریخ میں انہیں قدیم ہند کے بارے میں تو پڑھایا جاتا ہے، جس میں ہندو مذہب کا ارتقا اور اسی سے متعلقہ علوم کا تعارف ہوتا ہے۔

جوں ہی مسلمانوں کا قرون وسطیٰ کا دور آتا ہے اس کے لیے نصابی کتابوں میں لڑائی جھگڑے، لوٹ کھسوٹ، مار دھاڑ کے علاوہ کچھ نہیں پڑھایا جاتا۔ یہ سلسلہ نبی اکرم ﷺ سے شروع کرکے مغلوں تک لایا جاتا ہے اور سب کو زبردستی قبضے کرنے والے جنگ جو کے طور پر پڑھایا جاتا ہے۔ اسی میں مسلمانوں کی آپس کی لڑائیاں اور قتل وغارت بھی پڑھائی جاتی ہے۔ اس نظام تعلیم کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہندو مسلم کا مسئلہ حل ہونے کی بجائے مزید بڑھ گیا ہے۔ معزز رکن کمیٹی نے مسلم بادشاہوں کے نام لے لے کر ان سے منسوب ناپسندیدہ اقدامات کی مثالیں دیں۔ انہوں نے ان مسائل کے حل پر بھی ناقدانہ تبصرہ کیا ہے اور اسے عملی اور فوری بنانے پر زور دیا۔ انہوں نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اور ناگپور یونیورسٹی میں اسلامی تاریخ اور دیگر موضوعات کے بارے میں مربوط تحقیق کا نظام قائم کرنے کی تجویز دی اور سائنس اور ٹیکنالوجی کی تحقیق وتدریس کا مناسب انتظام کرنے پر بھی زور دیا۔

دینی تعلیم کے بارے میں تجاویز

جناب عزیز الحق نواب کمال یار جنگ کمیٹی کی گشتی کمیٹی کے سربراہ بھی تھے۔ ان کے تفصیلی نوٹس انتہائی قیمتی اور قابل قدر ہیں یہاں صرف براہ راست دینی تعلیم کے بارے میں ان کی تجاویز کا خلاصہ

پیش کیا جاتا ہے:

آل انڈیا اورینٹل یونیورسٹی کی تجویز

جناب عزیز الحق نے اس 'بورڈ آف اورینٹل ایجوکیشن' یعنی مجلس تعلیم شرقیات جس کی تجویز نواب کمال یار جنگ کمیٹی نے دی ہے، اس کے بارے میں تجویز دی کہ وہ جس قدر جلد ممکن ہو ایک 'آل انڈیا اورینٹل یونیورسٹی' قائم کرنے کے لیے ضروری اقدامات کرے۔ مسلمانوں کی اتنی بڑی تعداد کے ہوتے ہوئے ہندوستان میں ایک 'جامعہ ازھر' کا قیام ضروری ہے۔ دیوبند، ندوہ اور اعظم گڑھ، نیز اعلیٰ معیار کی علوم شرقیہ کی تعلیم کا مقصد لیے قائم شدہ حیدر آباد، بہاولپور، دہلی، اجمیر، ویلور، کلکتہ، سلہٹ اور دیگر متعدد مقامات پر بہت سے دینی مدارس کے ہوتے ہوئے 'اسلامی علوم میں مہارت' کے مقصد سے ایک انتہائی اعلیٰ معیار کی 'جامعہ علوم شرقیہ' قائم کرنا کوئی مشکل کام نہیں ہونا چاہیے۔

اگر ذرا اہمیت رکھنے والے مقامات پر قائم مساجد کے ائمہ تربیت یافتہ اساتذہ بن جائیں اور یہ مساجد مسلم لڑکوں اور لڑکیوں کی تربیت کے مراکز بن جائیں تو اس سے ہندوستان میں مسلم عوام کا ایک بہت بڑا مسئلہ حل ہو جائے گا۔ اس سے دینی مدارس کے فضلا کے لیے ملازمت کے مواقع بھی کھل جائیں گے اور علم و فضل کے حامل لوگوں کے لیے دیگر بہت سے در وا ہو جائیں گے[32]۔

مسلم سکولز

جناب عزیز الحق نے کمیٹی کی متفقہ تجاویز برائے مسلم مکاتب (Muslim Schools) پر مزید کام کرنے کے لیے اپنے نوٹ میں تفصیلی رائے دی جس کا خلاصہ یہ ہے:

مسلم مکاتب کے بارے میں جو درسی سکیم ہم نے رپورٹ میں دی ہے اگر اسے تسلیم کر کے نافذ کر دیا جائے، یا اسے تسلیم نہ کیا جائے اور موجودہ نظام تعلیم ہی جاری رہے، دونوں صورتوں میں 'مسلم

[32]- Kamal Yar Jang , p. 281-82

مکاتب' میں تدریس اور منہج تدریس کی تنظیم نو ضروری ہے۔ مسلم سکولز کے قیام کا جواز یہ نہیں ہے کہ ان میں مسلم طلبہ آکر تعلیم حاصل کرتے ہیں یا مسلم معلمین کو ان میں ملازمت مل جاتی ہے، بلکہ ان کا جواز یہ ہے کہ مسلم ہندوستان ایک ایسی نوعیت کے مکاتب کا تقاضا کرتا ہے جس کا ماحول اور منظر مسلمانوں کے خاص تقاضوں کے ساتھ ہم آہنگ ہو۔ حتیٰ کہ جب تک مختلف صوبوں اور ریاستوں میں موجودہ نصاب اور درسی لائحۂ عمل قائم رہتا ہے اس وقت تک بھی یہ تبدیلی ضروری ہے۔ اگر مسلم سکول بھی ایک دوسرے عام سکول کی طرح ہو، جس میں اس کی اپنی کوئی خاص علامت نہ ہو تو اسے 'مسلم سکول' کہنے کا استحقاق بھی بمشکل ہی حاصل رہتا ہے۔

میری عاجزانہ رائے میں ہر مسلم ہائی سکول میں ہر روز کم از کم آدھے گھنٹے کا ایک پیریڈ ایسا ہونا چاہیے جب ہائی کلاسز کے آخری چاروں سیکشن ایک جگہ جمع ہوں اور ہیڈ ماسٹر آکر ان سے اسلام کے بارے میں گفتگو کرے۔ ہیڈ ماسٹر اپنے طور پر اس کا ایک خاکہ تیار کرے، خاکہ ایسا ہونا چاہیے کہ ایک متوسط معیار کے سکول کے لیے مناسب ہو۔ مثلاً ایسا ہو سکتا ہے کہ اس آدھے گھنٹے میں طلبہ کی اپنی زبان میں یا انگریزی میں، جو مناسب ہو، قرآن پاک پڑھ کر سنایا جائے اور اس کے تاریخی، جغرافیائی اور سیاق وسباق کے حوالے دے کر اس کی تشریح کی جائے۔ پھر وقتاً فوقتاً ایک منتخب شدہ موضوع کے متعلق کچھ حکایات پیش کی جائیں جن میں مسلم صوفیہ، علما اور قائدین کے حالات زندگی بیان کیے جائیں۔ دنیا میں اب تک حضرت عمر کے اس واقعہ کی کوئی مثال پیش نہیں کر سکی جب انہوں نے بیت المقدس کی چابیاں وصول کرنے کے لیے سفر کیا۔ کیا حضرت معین الدین اجمیری کے اس کمال کی کوئی مثال مل سکتی ہے جب انہوں نے بے یار ومددگار حالت میں اجمیر کے راجپوتانہ کے علاقے میں سخت مزاج سرداروں کے درمیان جا کے ڈیرے ڈال دیے اور اصلاح کا کام شروع کیا۔ آج دنیا بھر سے لوگ ان کے مزار پر آتے ہیں۔ اس سے بڑی بہادری کی مثال ہم کہاں سے لائیں کہ اورنگ زیب عالمگیر نے بیرونی دشمن کے حملے کے عین دوران میں مصلیٰ بچھایا اور نماز شروع کر دی۔ اسلامی تاریخ ایسی مثالوں سے بھری پڑی ہے، ان کا علم طلبہ کو ہو جانے دیجیے۔ ہر روز بورے ٹائم ٹیبل میں سے آدھا گھنٹہ نکال لینا کوئی مشکل کام نہیں ہو گا اور پھر یہ مجلس درسی کتاب کے سبق کی طرح نہیں ہو گی، گفتگو پر مبنی ہو گی۔

ہر معلم سے بھی کہا جائے کہ وہ اپنے ہاں اس قسم کا ایک خاکہ تیار کر کے وقتاً فوقتاً اسلام کے بارے میں طلبہ کی ذہن سازی کرتا رہے۔ایک مسلم سکول کی دیواروں پر جو اقوال زرین لکھے جائیں وہ بھی اسلام کے سر چشمہ —قرآن مجید سے ہوں، یا حدیث سے ہوں۔

سکول کے پورے منظر کو مسلم بنایا جائے اور مسلم سکولوں کے مسلم طلبہ جب سکول سے باہر جائیں تو وہ اسلامی روح اور نظریے کو ساتھ لے کر جائیں[33]۔

دینی تعلیم

جہاں تک مسلم سکولوں میں دینی تعلیم یا دینیات کا تعلق ہے تو اس کے لیے بہتر منصوبہ بندی ہونی چاہیے۔ آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس ایک کمیٹی صرف اس مقصد کے لیے تشکیل دے کہ وہ صرف اور صرف مسلم سکولوں کے نصاب کا جائزہ لے اور ان کے لیے بہتر نصاب تجویز کرے جو ان کے مقصد سے مناسبت رکھتا ہو۔ مسلم رائے عامہ اس بات پر متفق ہے کہ سکولوں میں دینی تعلیم ہونی چاہیے اور اس کا حق بھی بنتا ہے کہ اسے درسی نظام میں نمایاں مقام حاصل ہو۔ یہ کام ایک مجلس ماہرین کے ذریعے ہی کرنا چاہیے۔

یہ بات اپنی جگہ اہم ہے کہ نصاب جیسا کیسا بھی ہو دینیات کے استاد کی تنخواہ غیر معیاری نہیں ہونی چاہیے۔اس کام کی ابتدا کے لیے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے ٹریننگ کالج سے ملحق ایک سکول قائم کر دینا چاہیے۔ تھیالوجی ٹریننگ سکول صرف دینیات کے معلمین کی تربیت کے لیے مختص ہونا چاہیے۔ شروع شروع میں چھٹیوں میں مختصر دورانیے کی ٹریننگ سے کام کی ابتدا کی جاسکتی ہے تاکہ مسلم ہائی سکولوں کے متعدد معلمین کو بیک وقت ٹریننگ دی جاسکے[34]۔

---

[33]- Report Kamal Yar Jang Committee, p. 283- 85

[34]- Report Kamal Yar Jang Committee, p. 285

مسلم سکولوں اور کالجوں کا آئندہ نظم و نسق

جناب عزیزالحق نے کہا: ہم تاریخ کے ایسے موڑ پر پہنچ چکے ہیں جہاں ہمیں تعلیم یافتہ فوجیں تیار کر کے نکالنے کی بجائے اپنی پیداوار کی نوعیت اور معیار پر زیادہ توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ ہر صوبے میں کم از کم ایک ایک مسلم کالج اور ایک ایک مسلم سکول ایسا ہونا چاہیے جہاں نتائج کا جائزہ مقدار کی بجائے معیار پر لیا جائے اور یہ دیکھا جائے کہ ان سے ہندوستان کو کیا فائدہ ہوگا اور مسلمانوں کو کیا فائدہ ہوگا۔ ہمارے پاس ایک سکول اور ایک کالج تو ایسا ہونا چاہیے جہاں ہم مختلف شعبہ ہائے زندگی کے لیے ایسے قائدین تیار کریں جو اسلام اور ہندوستان کے لیے ہر طرح کی قربانی کے جذبے سے سرشار ہوں۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ سکولوں اور کالجوں میں ہاسٹل سسٹم ہو اور طلبہ کو نصابی تعلیم کے ساتھ ساتھ زندگی گزارنے کا بہترین ماحول فراہم کیا جائے۔ یہاں دن کی ابتدا باجماعت نماز سے ہو اور اس کے فوراً بعد فوجی مشق ہو۔ دن کا وقت درسی تعلیم اور مشقی مجالس (Tutorial work) کے لیے مختص ہو۔ بعد دوپہر کا وقت کہیں باغات، یا لیبارٹریز، یا ورکشاپس میں گزارا جائے۔ یا اس وقت میں اپنے قلم، کاغذ یا ضروری چیزیں تیار کی جائیں۔ کوئی اگر چاہے تو ٹائیپنگ، شارٹ ہینڈ وغیرہ سیکھ لے۔ طلبہ ان چیزوں کو اپنی دلچسپی کے مشغلہ کے طور پر اختیار کریں۔ کچھ لوگ کھیلوں میں وقت گزاریں اور کچھ عملی مشقوں میں۔ طلبہ کچھ وقت نکال کر اپنی خوراک کی پیداوار میں بھی حصہ ڈال سکتے ہیں، کوئی سبزی اگائے کوئی مرغیاں پال لے وغیرہ۔ تمام طلبہ کا کچھ مدت کے بعد طبّی معائینہ ہوا کرے تاکہ وہ صحت مند رہیں۔ ہر طالب علم اپنی جگہ کی صفائی ستھرائی خود کرے اور کپڑے وغیرہ خود دھویا کرے۔ طلبہ اپنے درمیان ایک کواپریٹو سوسائیٹی تشکیل دیں جسے وہ خود ہی چلائیں؛ کتابیں، کاغذ قلم اور دیگر چھوٹی موٹی ضروریات کی چیزیں اس سوسائیٹی کے ذریعے خریدی جائیں۔ سکولوں کے لیے دی گئی یہ تجاویز کالجوں پر بھی نافذ ہوں۔

پرائمری تعلیم اور واردھا سکیم

جناب عزیزالحق نے اس کا سیر حاصل تجزیاتی مطالعہ پیش کیا، واردھا سکیم ہی کی وجہ سے مسلمانوں کی توجہ اس جانب مبذول ہوئی تھی کہ مسلمانوں کی دینی اور تہذیبی صورت حال پر زد پڑ رہی ہے۔ اسی

کی بناپر پیرپور کمیٹی تشکیل پائی تھی اور زیر غور کمیٹی بھی[35]۔

تعلیم اور تبدیلی مذہب کے مسائل، تبشیری سرگرمیوں کے اثرات، مدراس یونیورسٹی، مسلمانوں کی تعلیم کے بارے میں لارڈ مایو کی قرارداد ۱۸۷۱ء، مدراس میں اٹھائے گئے اقدامات، مسلم تعلیم سے لاپرواہی، انڈین ایجوکیشن کمیشن ۱۸۸۲ء، تعلیمی ضوابط پر نظر ثانی ۱۸۹۲ء، پبلک سروس، مسلمانوں کی مشکلات کا پہلی مرتبہ احساس ۱۹۱۲ء، عربی مدارس کا یونیورسٹی کے ساتھ انسلاک، مسلم گرلز سکول، عربی مدارس کی درجہ بندی، سکولوں میں ہندی کی تعلیم ۱۹۳۵ء۔ تیسرے باب میں مدراس کی مسلم تعلیم کی مشکلات کی وضاحت کی گئی اور یونیورسٹی کے قواعد وضوابط بیان کیے گئے۔ مسلم بچوں کے تعلیم حاصل کرنے کا تناسب۔ چوتھے باب میں مدراس میں کانگریس کی وزارت کے قیام اور اس کے اثرات بیان کیے گئے۔ اس سلسلے میں کالج ایجوکیشن، کانگریس کے جھنڈوں، تصاویر اور ترانوں کا مسئلہ، مسلم اداروں کے اخراجات کی عدم فراہمی، ہندی زبان، دیوناگرھی رسم الخط، عربی دان منشیوں کی معزولی، دیگر نقصانات۔

سروے کے اہم ضمیمے

رپورٹ کے آخر میں بہت مفید ضمیمے شامل کیے گئے جن میں رپورٹ کے تمام اجزا سے متعلق ضروری ریکارڈ بہم پہنچایا گیا ہے۔ ان ضمیموں کو انگریزی الفابیٹ کے ساتھ ترتیب دیا گیا ہے۔ ضمیمہ 'A' میں 'آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس' کے اجلاس کے صدر کی حیثیت سے نواب صاحب کی طرف سے ۴ جنوری ۱۹۴۰ء کو کمیٹی کے ارکان کو لکھا گیا مراسلہ شامل کیا گیا ہے جس میں انہوں نے اس اقدام کا مقصد بھی لکھا اور جنوری کی ۲۶ تاریخ کو حیدر آباد میں اس کا اجلاس بھی طلب کیا۔ ضمیمہ 'B' میں ۱۰۰ نکات پر مشتمل سوالنامہ دیا گیا جس میں مسلم ایجوکیشن کے تمام مراحل اور انتظامیات کا احاطہ کیا گیا تھا۔ ضمیمہ 'C' میں پورے ملک میں قائم 'مسلم لیگ'[36] کی ذیلی شاخوں کو

35۔ دلچسپی رکھنے والے احباب کے لیے اس کا مطالعہ مفید رہے گا۔

36۔ جیسا کہ پہلے ذکر کیا گیا مسلم لیگ دراصل مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی پیداوار تھی، ان کی سرگرمیاں ایک ہی پروگرام کے تحت ہوتی تھیں۔

پہنچائی گئی سوالنامے کی نقول کا نقشہ دیا گیا تھا۔ یہ سوالنامے وزراء، وائس چانسلر صاحبان، ماہرین تعلیم، صحافیوں، چیف کمشنر صاحبان، نوابی ریاستوں اور دیگر نمایاں شخصیات کو بھی بھیجے گئے۔ یہ کل چار ہزار سات سو (۴۷۰۰) کی تعداد میں تقسیم ہوئے۔ ان میں سے ایک ہزار چار سو نقول تو گشتی کمیٹی کے دوروں کے درمیان تقسیم کی گئیں۔ ضمیمہ 'D' میں نواب صاحب کا وہ مراسلہ شامل کیا گیا جو انہوں نے 'مقامی کمیٹیاں' قائم کرنے کے بارے میں لکھا۔ اس مراسلے میں ان شخصیات کے اسمائے گرامی بھی لکھے جن کی مشاورت سے مرکزی کمیٹی تشکیل دینے کا انہیں اختیار دیا گیا تھا۔ مقامی کمیٹیوں کا مقصد ملک بھر سے معلومات اور مطلوبہ مواد جمع کرنا تھا۔ اس سلسلے میں بمبئی، مدراس، بنگال، پنجاب، صوبہ ہائے متحدہ، بہار، مرکزی صوبہ، اڑیسہ، آسام، شمال مغربی سرحدی صوبہ، سندھ، دہلی، اجمیر، برطانوی بلوچستان، حیدر آباد، میسور، ٹراونکور، بھوپال، رامپور، کشمیر، اندور، گوالیار، بروڈا، بہاولپور اور پٹیالہ میں ۲۵ مقامی کمیٹیاں قائم کی گئیں۔ اس مراسلے میں کام کرنے کا مقصد اور طریقہ بھی بتایا گیا اور اس کی نقل ہر مقامی کمیٹی کے نمائندے کو ارکان کی گئیں۔ ضمیمہ 'E' میں جنوبی ہند کا ٹور پروگرام یعنی گشتی کمیٹی کے دوروں کے اوقات کا نقشہ دیا گیا۔ یعنی یہ کہ کس تاریخ کو، کس دن، کتنے بج کر کتنے منٹ پر کس شہر کے سٹیشن سے روانہ ہوں گے۔ یہ دورہ ۱۶ مئی کو بروز جمعرات شروع ہوا اور ۲۵ جون تک جاری رہا۔ پھر ۲۲ ستمبر بروز اتوار ۸ بج کر ۶ منٹ پر شمالی ہند کا دورہ شروع ہوا، ہر اگلے شہر میں پہنچنے کا وقت بھی دیا گیا اور ۱۸ نومبر کو بروز پیر ختم ہوا۔ نقشے کے آخر میں نوٹ دے دیا گیا کہ ریلوے کی دیر سویر کے حساب سے پروگرام میں تبدیلی کی جاسکتی ہے۔ ضمیمہ 'F' میں یونیورسٹی آف کلکتہ کے لیے نظر ثانی شدہ نصاب برائے 'تاریخ اسلام' کی تفصیل دی گئی جو ایف اے، بی اے اور ایم کے تمام مراحل کے لیے الگ الگ تیار کیا گیا تھا۔ ضمیمہ 'G' میں ثانوی تعلیم کے لیے ضروری وسائل کا نقشہ دیا گیا، جس میں ثانوی سکولوں کے لیے مطلوبہ سٹاف، ہر سکول کا متوسط بجٹ جو اس کے قیام سے ۱۵ برس بعد ضرورت ہو گا، آمدن، لڑکوں کے لیے نصابی مضامین؛ لازمی، اختیاری۔ لڑکیوں کے سکولوں کے نصابی مضامین اور دونوں قسم کے سکولوں کے نصاب خواندگی کی مقدار، سالانہ گھنٹوں کی تعداد اور تقسیم کار، مضامین کے مقررہ نمبر۔ ضمیمہ 'H' میں پرائمری سکول 'شہری علاقوں کے لیے' — چھ سالہ پروگرام چھوٹے بچوں کا نصاب، ۶ سال کی عمر سے جماعت اول شروع۔ عربی، فارسی، جسمانی تربیت، تہذیبی

تربیت وغیرہ مضامین سمیت تقریباً تمام ضروری مضامین۔ پرائمری تعلیم 'دیہی علاقوں کے لیے'، 'لڑکیوں کے سکول'، پرائمری اساتذہ کی تربیت، لڑکیوں کے سکولوں کی اساتذہ کی تربیت، صنعتی پرائمری سکول، درس نظامی کے مکاتب اور مدارس۔ آخر میں نوٹ لکھا گیا کہ یہ نصاب ابتدائی خاکہ ہے، تفصیلی نصاب کے لیے قائم خصوصی کمیٹیاں حسب ضرورت اس میں تبدیلی کر سکیں گی۔ ضمیمہ 'ا' میں 'مدراس' میں مسلم آبادی کی تفصیل دی گئی اور مختلف علاقوں اور اضلاع میں تقسیم کیا گیا۔ مدرس میں اردو بولنے والی آبادی کا الگ چارٹ دیا گیا۔ مدراس کے عوامی اداروں میں مسلم اہل علم کی تعداد کا بھی ایک چارٹ دیا گیا۔ ۱۸۶۸ سے ۱۹۳۸ تک ہر سہ سالہ مدت میں یونیورسٹی کا امتحان پاس کرنے والے مسلمانوں کی تعداد، تمام تعلیمی پروگراموں کی الگ الگ تعداد دی گئی۔ مدراس میں طلبہ کی کل تعداد، ملیبار میں لڑکوں کے سکولوں پر عوامی پیسے سے اخراجات، گزشتہ ۱۰ سالوں میں مدراس کی یونیورسٹیز میں مسلم طلبہ کے نتائج، ۱۹۴۰ء میں مدراس کی پروونشل سروسز، ہر سروس میں کل تعداد اور مسلمان ملازمین کی تعداد، مرکزی صوبہ (سی پی) اور برار میں مسلم آبادی، سی پی کے شہروں میں مسلم آبادی کی تعداد، سی پی اور برار میں مسلم ایجوکیشن کی ترقی (۱۸۸۶ تا ۱۹۰۲ء)، یہ موازنہ مختلف مراحل میں ۱۹۳۷ء تک کیا گیا۔ پبلک امتحانات میں پاس ہونے والے مسلم امیدواروں کی تعداد، سی پی اور برار میں اردو سکول، سی پی کے کالجوں میں مسلم طلبہ کی تعداد، بمبئی اور سندھ میں مسلم آبادی، لائل پور زرعی کالج میں مسلم طلبہ کی تعداد[37]۔

نواب صاحب کا دوسرا خطبۂ صدارت

۱۹۴۰ء میں حیدر آباد دکن میں مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا اجلاس ہوا تو اس میں بھی نواب کمال یار جنگ صاحب نے خطبۂ صدارت پیش کیا[38]۔

37- اصل رپورٹ، نسخہ محفوظ شدہ سنٹرل سیکرٹریٹ لائبریری، گورنمنٹ آف انڈیا، نیو دہلی۔

38- حیدر آباد ایجوکیشنل کانفرنس، خطبۂ صدارت نواب کمال یار جنگ بہادر، ورنگل، ۲۴ ذی الحجہ سن ۱۳۵۹ھ، مطابق ۱۹۴۰ء، مطبوعہ اعظم اسٹیم پریس، گورنمنٹ ایجوکیشنل پرنٹرز حیدر آباد دکن، معاون ادارہ ادبیات اردو، حیدر آباد دکن۔ ۱۲ صفحات۔

مسلم تعلیم کا نظام قائد اعظم کی نظر میں

۸/مارچ ۱۹۴۴ء کو علی گڑھ میں خطاب کرتے ہوئے قائد اعظم نے فرمایا: "...... پاکستان کی ابتدا ہندوستان میں مسلم حکومت قائم ہونے سے بہت پہلے اسی وقت ہو گئی تھی جب یہاں پہلا غیر مسلم مسلمان ہوا تھا۔ جوں ہی ایک ہندو نے اسلام قبول کیا، اس کے ساتھ ہی وہ نہ صرف دینی طور پر اپنے ماحول سے باہر ہو گیا بلکہ معاشرتی، ثقافتی اور معاشی طور پر بھی اس سے الگ ہو گیا۔ اسلام نے اس پر یہ فرض عائد کر دیا تھا کہ بطور مسلمان وہ اپنی شناخت اور انفرادیت کو کسی اجنبی معاشرے میں تحلیل نہ کرے۔ صدیاں گزر گئیں اور اس دوران ہندو ہندو رہے اور مسلمان مسلمان ہی رہے، انھوں نے اپنی اپنی وحدتوں کو تحلیل نہیں کیا- یہی چیز پاکستان کی بنیاد تھی"[39]۔

اسلامی تصورات کے مطابق خواتین کی کاروبار زندگی میں شرکت

قائد اعظم نے مسلم یونیوسٹی علی گڑھ تشریف لے گئے تو یونیورسٹی میں قائم مسلم لیگ کے یونٹ کے اجلاس سے ۱۰/ مارچ ۱۹۴۴ء کو خطاب کیا جس کی ابتدائیوں کی: میں آپ کے اس کام کی دل کی گہرائیوں سے قدر کرتا ہوں جو آپ لوگوں نے آل انڈیا مسلم لیگ کا ایک چھوٹا بچہ ہونے کی حیثیت سے سر انجام دیا۔......... پھر انھوں نے طلبہ کی توجہ اس جانب مبذول کرائی کہ آج کے دور کی ضرورت سادہ بی اے ایم اے کی بجائے شارٹ ہینڈ اور ٹائپنگ وغیرہ کی ہے۔ ہم نے بمبئی میں ایک سکول بینکنگ اور تجارت کے طریقے سکھانے کے لیے بھی قائم کیا ہے۔.......... طویل گفتگو کرتے ہوئے انھوں نے مسلم نوجوانوں کو ہندو اور یورپین کاروباری لوگوں کے مقابلے میں کاروباری ہنر سیکھنے کی نصیحت کی اور خواتین کو بھی اس طرف توجہ دلائی۔

پھر خواتین کے بارے میں فرمایا: .... کوئی قوم اس وقت تک عظمت کی بلندیوں تک نہیں پہنچ سکتی جب تک کہ تمھاری خواتین تمہارے ساتھ ساتھ موجود نہ ہوں۔ ہم رسوم ورواج کی برائی کا شکار

---

[39]- Yusufi, Khursheed; Volume III: 1840-41.

ہیں۔ یہ انسانیت کے خلاف ایک جرم ہے کہ ہماری خواتین قیدیوں کی طرح اپنے گھروں کی چار دیواری کے اندر بند کر دی گئی ہیں۔ میرا یہ مطلب ہر گز نہیں کہ ہم مغربی طرزِ زندگی کی برائیوں کی نقالی کرنے لگیں۔ بلکہ آیئے ہم اپنی خواتین کی حیثیت کو اپنے اسلامی تصورات اور معیارات کے مطابق بلند کریں۔ جس خوفناک حالت میں ہماری خواتین کو رہنا پڑ رہا ہے، اس کی تو کہیں بھی اجازت نہیں۔ آپ کو چاہیے کہ مغربی معاشرے کی گمراہانہ طور طریقوں سے دور رہتے ہوئے، اپنی خواتین کو ہر شعبۂ زندگی میں اپنے ہمقدم کے طور پر ساتھ لے کر چلیں۔ ایک عورت جو خود اَن پڑھ ہو، آپ اس سے یہ توقع نہیں رکھ سکتے کہ وہ آپ کے بچے کی مناسب طریقے سے پرورش کر سکے گی۔...... آیئے اس سرمائے کو اٹھا کر ہم باہر نہ پھینکیں[40]۔

یہ مشق اور یہ رپورٹ آئندہ مسلم معاشرے کی تعمیر نو کے علمی کاموں، یعنی معاشی نظام، سیاسی نظام وغیرہ مرتب کرنے کے لیے بنیادی کوشش ثابت ہوئی۔ پاکستان بننے کے بعد قائداعظم کی سربراہی میں ۲۷ نومبر سے یکم دسمبر ۱۹۴۷ء 'آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس' کا انعقاد دارالحکومت کراچی میں ہوا۔ اس کانفرنس کی سفارشات میں نواب کمال یار بہادر کمیٹی کی رپورٹ کا واضح پرتو نظر آتا ہے، حتیٰ کہ یہاں جو مرکزی ادارہ تحقیقات اسلامی قائم کرنے کی سفارش کی گئی، پاکستان کی پہلی ایجوکیشنل کانفرنس میں وہ سفارش بھی شامل تھی[41]۔ ۱۹۵۱ء میں بھی اسی طرح کی ایک کانفرنس ہوئی اور ۱۹۵۴ء تک یکساں تعلیمی نظام کے لیے انہی خطوط پر کام ہوتا رہا کہ سارے تعلیمی نظام کی نظریے کی بنیاد پر تعمیر نو کرکے مدارس کو بھی اس کا حصہ بنا دیا جائے مگر اس کے بعد تعلیمی پالیسی بدلی اور صرف دینیات پر اکتفا کیا گیا۔

نواب کمال یار جنگ کی کمیٹی کی رپورٹ اور تجاویز دینی اور دنیاوی تعلیم کے فرق اور اس سے پیدا ہونے والے مسائل سے نکلنے کا مؤثر ذریعہ ثابت ہو سکتی ہے۔

40- Yusufi, Khursheed; VoumeIII, 1851-1853

41- Proceedings of the Pakistan Educational Conference Held at Karachi From 27th November to 1st December 1947, Government of Pakistan, Ministry of Interior (Education Division), Printed by the Assistant Manager, Government of Pakistan Press, Karachi.

عصری جامعات میں تقابل ادیان کے مروجہ کورسز اور ایک نئی کاوش

شمس الدین حسن شگری

پاکستان سمیت تقریبا پوری مسلم دنیا کے اندر مذہبی تعلیم میں کسی نہ کسی سطح پر دیگر ادیان بارے بھی پڑھایا جاتا ہے۔پاکستان میں تو اسے عام طور پہ تقابلِ ادیان کا عنوان دیا جاتا ہے۔ یہ مضمون مدارس سمیت عصری جامعات کے اسلامیات کے شعبوں میں بھی شامل ہے۔چونکہ 'تقابل' میں مذاہب کے معروضی مطالعے کی بجائے ایک طرح کی کشمکش کا پہلو غالب آجاتا ہے اور زیادہ زور غلط صحیح ثابت کرنے پر لگ جاتا ہے، لہذا اس موضوع پر بات کرنے کی ضرورت ہے کہ مذاہب بارے طلبہ کو کس طرح کی اور کس منہج پر معلومات فراہم کی جانی چاہیئں۔اس مضمون میں مصنف نے تقابل ادیان کے عمومی نصاب کا تجزیہ کرتے ہوئے ایک نئے نصاب کی تصویر بھی پیش کی ہے۔ مضمون نگار سکالر ہیں اور سیاسی اسلام پر کتب تصنیف کرچکے ہیں۔

انسان کی معلوم تہذیبی تاریخ میں مذہب ہمیشہ سے موجود رہا ہے۔ مذہب کی تعریف، اقسام، تاریخ اور دیگر مسائل پر مفکرین کا ہمیشہ سے اختلاف رہا ہے مگر مذہب کے وجود سے کسی نے بھی انکار نہیں کیا اور نہ ہی کیا جا سکتا ہے۔ البتہ مذہب کی ابتدا اور حقیقت سے متعلق دو نظریات پائے جاتے ہیں۔ ایک یہ کہ مذہب اسی وقت سے موجود ہے جب سے انسان موجود ہے اور مذہب کی ابتدا توحید سے ہوئی ہے۔ خدا نے انسان کو پیدا کیا اور پھر اس سے ہمکلام ہوا۔ یہیں سے مذہب کی ابتدا ہوئی ہے۔ یہودیت، عیسائیت اور اسلام کا نقطہ نظر یہی ہے۔ یہ نقطہ نظر سائنسی نقطہ نظر سے متصادم ہے، اسی لیے بعض مذہبی مفکرین جنہوں نے سائنسی نقطہ نظر اور مذہب میں تطبیق کی کوشش کی یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ مذہب نظریہ ارتقاء سے نہ صرف متصادم نہیں بلکہ اس کی تائید کرتا ہے۔

دوسرا نقطہ نظر یہ ہے کہ انسان اور باقی افکار و نظریات اور انسانی تہذیب کی طرح مذہب بھی انسان ساختہ ہے اور مذہب بھی شرک سے ابتدا کر کے ارتقائی منازل طے کرتا ہوا وحدانیت کی طرف آیا

ہے۔ یہ نقطہ نظر تمام ملحد مفکرین اور اکثر سیکولر مفکرین کا ہے۔ اس نقطہ نظر کی رو سے انسان نے جلب منفعت اور دفع مضرت کی بنیاد پر کچھ بالادست اور ان دیکھی قوتوں کا عقیدہ اپنایا اور تکثیریت پسندی سے مذہب کی ابتدا ہوئی۔ اسی نقطہ نظر کو سائنسی یا ارتقائی نقطہ نظر کہا جاتا ہے۔ اس نقطہ نظر کی تفصیلات میں اختلاف ہے مگر بنیاد میں اتفاق ہے۔ علم نفسیات میں فرائڈ اور ان کے ہمنوالوگوں کا نقطہ نظر، مارکسی نقطہ نظر اور دیگر چند نظریات پائے جاتے ہیں۔

اگر ہم انسان انسان کے بنیادی اور بڑے سوالات کا جائزہ لیں تو ہم بآسانی اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ مذہب در حقیقت ان سوالوں کی جواب کے تلاش کا نام ہے۔ ان میں سے کچھ سوالات کا تعلق کائنات سے کچھ کا تعلق مابعد کائنات سے اور کچھ کا تعلق خود انسان سے ہے۔ انسان بحیثیت فرد اور معاشرہ۔ ان سوالات کے جواب کے لیے اگر خالص عقل کو رہنما بنایا جائے گا تو وہ فلسفہ کہلائے گا، اگر حس، تجربہ و مشاہدہ کو بنیاد بنیا جائے گا تو وہ سائنس ہے اور اگر اس کے لیے ان دونوں ذرائع علم کی بجائے وجدان یا داخلی تجربہ کو بنیاد بنایا جائے گا تو وہ مذہب کہلائے گا۔ جس کو مذہبی یا روحانی تجربہ بھی کہا جاتا ہے۔ اسی کو مختلف زبانوں اور روایتوں میں مختلف نام دیئے گئے ہیں۔

آپ مذہب کو انسان ساختہ مانیں یا خدا کی طرف سے مانیں ہر دو صورت میں مذہب کی اہمیت مسلم ہے۔ اس میں علم و دانش کا وافر حصہ موجود ہے۔ اس لیے مطالعہ مذاہب انتہائی مفید اور دلچسپ چیز ہے۔

مطالعہ مذاہب کے مناہج، رجحانات اور مقاصد

اس وقت مطالعہ مذاہب کے مندرجہ ذیل مناہج، رجحانات اور مقاصد پائے جاتے ہیں۔

ا: سب سے معروف اور زیادہ رائج طریقہ وہ ہے جو اہل مذہب کے ہاں رائج ہے۔ اس طریقہ کار میں طالب علم کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ وہ ہر صورت اپنے مذہب کی برتری کو ثابت کرے اور دیگر مذاہب کو خالص تنقیدی نظر سے دیکھے۔ دوسرے مذہب کی تنقیص اور اپنے مذہب کی برتری اس میں پیش نظر ہوتی ہے۔ عام طور پر ہمارے تعلیمی اداروں میں تقابل ادیان کے نام سے موجود شعبہ جات میں

یہی طریقہ رائج اور غالب ہے۔اور تقابل ادیان پر لکھی گئی کتابوں میں بھی یہ منہج نمایاں نظر آتا ہے۔ ہم یوں کہہ سکتے ہیں اس طریقہ اور منہج میں نہ صرف اپنے مذہب کی سچائی اور دوسرے مذاہب کے باطل ہونے کا تصور غالب ہوتا ہے بلکہ اپنے مذہب کی تبلیغ بھی مقصد ہوتا ہے۔دنیا کے تمام مذاہب کے مبلغین میں یہی طریقہ رائج ہے۔

۲: دوسرا منہج یا رجحان وہ ہے جس میں طالب علم اپنے مذہب پر قائم بھی رہتا ہے اور اور اس کی سچائی پر اس کا ایمان بھی ہوتا ہے مگر مطالعہ مذاہب کا مقصد مشترکات کی تلاش ہوتا ہے۔اس میں طالب علم کا انداز کافی حد تک ہمدردانہ ہوتا ہے مگر وہ تبلیغ اپنے مذہب ہی کی کرتا ہے اور اسی کو سچائی کا واحد معیار سمجھتا ہے۔

۳: تیسرے منہج کے مطابق طالب علم کا مقصد مذاہب کے بارے میں محض مطالعہ اور جانکاری حاصل کرنا ہوتا ہے۔اس صورت میں اس کا رویہ تمام مذاہب کے لیے ہمدردانہ، معروضی اور غیر جانبدارانہ ہوتا ہے۔وہ بلا استثنا تمام مذاہب کی تعریف و تحسین بھی کرے گا اور تنقید بھی کرے گا۔ اس تعریف اور تنقید کے لیے بھی اس کا کوئی نہ کوئی پیمانہ ضرور ہوگا۔بغیر کسی پیمانہ یا معیار کے کسی مذہب پر تنقید یا تعریف ممکن نہیں ہے۔اس کو ہم سیکولر اور سائنسی انداز مطالعہ کہیں گے۔آج مغربی جامعات میں یہی طریقہ رائج ہے۔ہمارے کچھ مذہبی دانشور بھی اس طریقہ کار کے قائل ہیں مگر وہ مطالعہ کی حد تک معروضیت کے قائل ہیں۔کچھ مذہب پسندوں کا خیال ہے کہ ایسا انداز اختیار کرنا ممکن نہیں ہے۔

۴: مطالعہ مذہب کا ایک طریقہ یہ ہوتا ہے کہ تمام مذاہب کو سچ مانا جائے اور سچائی کو کسی ایک مذہب میں مقید نہ سمجھا جائے اور یہ عقیدہ رکھا جائے کہ تمام مذاہب اور اس کے پیروکار ٹھیک ہیں اور خدا کے ہاں فیصلہ کا مدار کسی مذہب یا گروہ سے وابستگی کے بجائے اعمال ہیں اور مذاہب میں نظر آنے والے اختلافات کو حسن اور اختلاف فکر و نظر مانا جائے، جہاں بہت زیادہ اور اصولی اختلاف نظر آئے وہاں تاویل کی راہ اختیار کی جائے۔اس طریقہ کار کے قائلین کی تعداد بہت کم ہے۔خود مسلمانوں میں کچھ اہل علم اس نقطہ نظر کے قائل ہیں۔

آج دنیا میں مطالعہ ادیان کے یہ تمام مناہج موجود ہیں۔ ہر شخص اور ہر دانشور اپنے رجحان طبع اور تحقیق کے مطابق ان میں سے کوئی نہ کوئی منہج اختیار کر کے مذاہب کا مطالعہ کرتا ہے۔

مطالعہ مذاہب کے لیے ہمارا کورس

ہم نے بھی مطالعہ مذاہب کے حوالے سے ایک کورس تیار کیا ہے جو معروف کورسز سے ذرا مختلف ہے۔اس کورس کا مقصد اول تا آخر ایک ہے اور وہ یہ کہ طالب علم غیر جانبدارانہ اور معروضی انداز میں تمام مذاہب کے بارے میں جانکاری حاصل کرے۔ یہ طالب علم پر منحصر ہے کہ وہ کسی ایک مذہب کی سچائی پر ایمان رکھتا ہے یا ایک سے زائد مذاہب کی سچائی پر یا پھر تمام ادیان کو حق اور سچ سمجھتا ہے۔ اسی لیے اس کورس میں نہ کسی مذہب پر تنقید کی گئی ہے اور نہ ہی کسی مذہب کی تعریف و توصیف کی کوشش کی گئی ہے۔اس کورس کا مقصد کسی خاص مذہب کی تبلیغ ہر گز ہر گز نہیں ہے۔اگر کہیں کسی مذہب پر تنقید آپ کی نظر سے گزرے تو یہ کسی مصنف یا مولف کی تنقید ہو گی مرتب کی نہیں اور نہ ہی مرتب کا ان آراء میں سے کسی سے اتفاق ضروری ہے۔ ہر طالب علم اس بات میں آزاد ہو گا کہ وہ اپنے علم و فکر اور اپنے ورلڈ ویو کے مطابق اس کو پرکھے۔ آپ کا جو بھی عالمی نقطہ نظر ہو گا وہ آپ کا پیمانہ ہو گا۔ چاہے وہ کوئی ایک مذہب ہو یا پھر عقل یا سائنس۔ یہ طالب علم پر منحصر ہو گا۔البتہ طالب علم سے یہ امید ضرور رکھی جائے گی کہ وہ تنقید کرتے ہوئے معروضی، ہمدردانہ اور غیر جانبدارانہ منہج اختیار کرنے کی کوشش کرے گا۔اس کورس سے ہمارا ایک ہی مقصد ہے اور وہ ہے طالب علم اپنے مذہب کے علاوہ دیگر مذاہب کے بارے میں ابتدائی، مناسب اور صحیح معلومات حاصل کرے۔ اس کورس سے نہ کوئی تمام مذاہب کا عالم بنے گا اور نہ ہی تمام مذاہب کے تمام اصولوں اور فروعات سے واقف ہونے کا دعوی کر سکے گا۔اس کورس کا مقصد محض ابتدائی تعارف ہے تاکہ ہر طالب علم اپنے مذہب سمیت دیگر مذاہب کا مطالعہ کرنے کی صلاحیت اپنے اندر پید کر سکے۔

کورس کا تعارف

اس کورس کے دو حصے ہیں۔ حصہ اول میں اردو میں تقابل ادیان پر لکھی گئی اہم کتابوں کے مقدمے دیے گئے ہیں جن میں ان مصنفین نے مطالعہ مذاہب کے مختلف مناہج کے ذکر کے ساتھ ساتھ اپنے منہج کا بھی ذکر کیا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ مطالعہ مذاہب کی اہمیت، ضرورت اور سابقہ کاموں کا جائزہ بھی لیا گیا ہے۔ اس حصہ میں فلسفہ مذہب کے متعلق کچھ اہم مواد بھی دیا گیا ہے۔ مذہب، فلسفہ، سائنس سمیت کسی بھی مضمون کو پڑھتے ہوئے اس کی فلاسفی سے آگاہی بہت ضروری ہے۔ فلاسفی میں اس علم کی علمیات، منہج، حدود وغیرہ سے آگاہی اگر نہ ہو تو نہایت منفی اور عجیب وغریب نتائج سامنے آتے ہیں۔

حصہ دوم میں دنیا کے تمام مذاہب سے متعلق مواد موجود ہے۔ اور فہم مذہب کے لیے ہم نے مذہب کی چار شاخیں بنائی ہیں، ایمانیات یا عقائد، عبادات، اخلاقیات اور قانون شریعت یا فقہ۔ کوشش کی ہے کہ ہر مذہب سے یہ چاروں پہلو سامنے آجائے۔ کچھ مذاہب کے بارے میں مشہور ہے کہ اس میں ایمانیات نہیں ہیں، کچھ کے بارے میں مشہور ہے کہ اس میں عبادات اور شریعت نہیں ہے۔ یہ تو درست ہے کہ ہر مذہب میں یہ چاروں شاخیں یکساں یا برابر نہیں ہے کہیں کسی ایک شاخ پر زیادہ تفصیل ہے کہیں کسی اور پر لیکن بحیثیت مجموعی یہ چاروں شاخیں ہر مذہب میں موجود ہیں بلکہ نہ صرف مذہب میں بلکہ کسی بھی نظام فکر میں یہ چاروں موجود ہیں۔ یہاں تک کہ الحاد میں بھی۔ شکلیں اور اصطلاحات مختلف ہو سکتی ہیں مگر حقیقت اور روح ہر جگہ موجود ہے۔ اس حصے کی دوسری اہم بات یہ ہے کہ ہم نے ہر مذہب کے تعارف اور اس کی تفصیلات سے پہلے اس دور کی تہذیب، ثقافت اور تاریخ بھی دی ہے تاکہ طالب علم کے سامنے ہر مذہب کی پیدائش یا وجود میں آنے سے پہلے کا معاشرتی، سیاسی، تہذیبی، لسانی اور ثقافتی پہلو بھی رہے۔ ہمارے خیال میں مذہب کا مطالعہ چاہے سیکولر نقطہ نظر سے کیا جائے یا پھر مذہبی نقطہ نظر سے، اس دور اور اس تہذیب سے کسی حد تک جانکاری بہت مفید ہے جس میں وہ مذہب وجود میں آیا ہے۔ اسی لیے ہندوستانی مذاہب کا مطالعہ کرتے ہوئے ہندی تہذیب، چین اور جاپان کے مذاہب کا مطالعہ کرتے ہوئے اس دور کی تہذیب، مشرق وسطی کے مذاہب کا

مطالعہ کرتے ہوئے اس دور کی تہذیب اور حالات دینے کی کوشش کی گئی ہے۔

ان دونوں حصوں میں ہماری خواہش اور کوشش تھی کہ ہر مذہب کو اس مذہب کے کسی عالم یا مفکر کی کتابوں سے ہی پیش کیا جائے مگر چونکہ یہ نصاب اور دو میں ہے اور اردو میں اگرچہ بہت اچھا کام ہوا ہے مگر ہر ہر مذہب کے علماء کی کتابیں نہیں ہیں اس لیے بہت چھان پھٹک کے بعد کوشش کی ہے کہ جو سب سے زیادہ معروضی اور غیر جانبدارنہ انداز کا مواد ہے اسی کو زامل کیا جائے۔اس کے بعد ہماری خواہش اور پروگرام تھا کہ ہر مذہب کے بنیادی متون جو دستیاب ہیں سے بھی طالب علم کو گزارا جائے اس کے لیے بھی ہمیں ترجموں سے ہی مدد لینی تھی لیکن خواہش تھی کہ ہر مذہب کا کوئی عالم یا استاد ملے جس سے وہ متون پڑھنے کی کوشش کی جائے مگر ہمیں اس میں کامیابی نہیں ملی۔

مطالعہ مذاہب کورس درحقیقت ایک پروجیکٹ کا حصہ ہے۔ ہم نے اپنے کچھ طلبہ کے لیے ایک پورا سلسلہ شروع کیا تھا جس کا مقصد ہر مذہب اور نظام فکر کو اس کے اپنے ماننے والوں سے سمجھنا تاکہ ہم ہر کسی کا نقطہ نظر انہی کے الفاظ میں سمجھ سکیں اس سے ہمارے رویوں میں رواداری پیدا ہوتی ہے، جن کو ہم لوگ غلط، گمراہ اور بھٹکے ہوئے سمجھتے ہیں ان کا موقف ان کے دلائل جب سمجھتے ہیں تو ہر ایک کے ساتھ ہمدردی پیدا ہو جاتی ہے۔ مسلمانوں میں مختلف فرقے اور مکاتب فکر موجود ہیں ہر ایک کے اپنے دلائل ہیں جب ہم ان کو پڑھتے ہیں تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ کوئی بھی دشمن اسلام، دشمن قرآن اور دشمن رسول نہیں ہے بلکہ یہ زاویہ فہم ہے جس کو مخالف فریق پتہ نہیں کیا کیا نام دیتا ہے۔ تقریب بین المذاہب والمسالک کے اس اہم کام کی ابتدا ہم نے مسلمانوں کے مختلف فرقوں سے کیا اس مقصد کے لیے ہم نے اصول تفسیر، اصول حدیث اور اصول فقہ کو اسی طرح پڑھایا تو حیرت انگیز نتائج سامنے آئے۔ ہر طالب کا کہنا تھا کہ اب ہمیں دوسروں کے موقف اور دلائل سے آگاہی ملی اور اب کوئی بھی دشمن دین نہیں۔ ہم نے شیعہ سنی کے علاوہ اہل قرآن، سرسید، علامہ پرویز، مکتب غامدی جسے غامدی صاحب دبستان شبلی کا نام دیتے ہیں، اسماعیلیہ اور احمدی وغیرہ اور جدید اور متنازعہ مسلم اہل دانش کے افکار اور اصول و مبادی کو اس نصاب کا حصہ بنایا تھا۔ مطالعہ مذاہب کے کورس کا مقصد بھی یہی تھا۔

عصری جامعات میں تقابل ادیان کے شعبے اور نصاب

پاکستان کی چند یونیورسٹیوں میں تقابل ادیان کا شعبہ موجود ہے۔اور ان تمام یونیورسٹیوں میں یہ شعبہ اسلامک اسٹڈیز کے ماتحت آتا ہے۔ان یونیورسٹیوں میں بی ایس چار سالہ پروگرام، ایم فل اور پی ایچ ڈی کی ڈگریاں ہیں۔ باقی یونیورسٹیوں میں اسلامیات کی ڈگری میں ایک لازمی یا اختیاری مضمون کے طور پر یہ مضمون شامل ہے۔ جن یونیورسٹیوں میں مطالعہ مذاہب کے لیے باقاعدہ شعبہ موجود ہے اس میں ہمارے خیال میں سب سے پرانا شعبہ سندھ یونیورسٹی کا ہے۔ ہماری بدقسمتی کہ ہمیں سندھ یونیورسٹی کا مکمل نصاب نہیں مل سکا۔وہاں اس شعبہ کو جاننے والے اس کی بہت تعریف کرتے ہیں۔ سندھ یونیورسٹی میں یہ شعبہ Department of Comparative Religion & Islamic Culture کے نام سے موجود ہے۔اسی طرح بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد میں بھی تقابل ادیان کا شعبہ موجود ہے اور اس شعبے کا نام بھی Department of Comparative Religion ہے۔ یہاں کا نصاب دیکھنے میں نہایت عمدہ لگا ہے، پورے پاکستان میں اس یونیورسٹی کی ڈگری کی بڑی اہمیت ہے۔اسلامک یونیورسٹی میں اسلامک اسٹڈیز میں بی ایس چار سالہ پروگرام، ایم ایس اور پی ایچ ڈی ہے۔بی ایس چار سالہ پروگرام میں آٹھ سمسٹر ہوتے ہیں اور آخری دو سمسٹرز تخصص پر مبنی ہوتا ہے۔اس کے بعد کے بعد ایم ایس یا ایم فل میں آپ اسی شعبہ میں ایم فل یا پی ایچ ڈی کریں گے جس میں آپ نے بی ایس کے آخری دو سمسٹر میں تخصص کیا تھا۔بی ایس کے ۶ سمسٹر میں اسلامک اسٹڈیز کا نصاب یکساں ہے اور سب کو یہی مضامین پڑھنے ہوں گے۔ سات اور آٹھ تخصص کا ہے۔ فیکلٹی آف اُصول الدین یا اسلامک اسٹڈیز میں تقابل ادیان کے ساتھ شعبہ تفسیر وعلوم القرآن، حدیث وعلوم الحدیث، دعوہ واسلامک کلچر، عقیدہ وفلسفہ اور سیرت و تاریخ کے شعبے بھی ہیں جن میں تخصص کی ڈگری دی جاتی ہے۔ان تمام شعبوں میں بھی وہی طریقہ ہے جو شعبہ تقابل ادیان کا ہے۔

اسی طرح اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور میں بھی تقابل ادیان کا شعبہ ہے، جسے Department of World Religions and Interfaith Harmony کا نام دیا گیا ہے اور یہ ۲۰۲۰ میں

قائم ہوا ہے۔ اس شعبے کا نصاب بھی دیکھنے میں اچھا لگ رہا ہے۔ یہ بھی فیکلٹی آف اسلامک اینڈ عربک اسٹڈیز ہی کے تحت ایک شعبہ ہے۔ اس میں اسلامیات کے مضامین کے بعد تخصص کے لیے یہ مضمون موجود ہے۔ اس فیکلٹی میں مطالعہ مذاہب کے ساتھ ساتھ عربی، اسلامک اسٹڈیز، مطالعہ قرآن، شعبہ ترجمہ، شعبہ حدیث اور فقہ و شریعت کے شعبے بھی ہیں۔

وفاقی اردو یونیورسٹی کا شعبہ ادیان بھی لائق توجہ ہے۔ یہاں بھی فیکلٹی آف اسلامک اسٹڈیز کے تحت یہ شعبہ ہے اور اسے Department Of World Religions کا نام دیا گیا ہے۔ یہاں فیکلٹی آف اسلامک اسٹڈیز کے تحت شعبہ اسلامک لرننگ، شعبہ مذاہب عالم اور شعبہ قرآن و سنت ہیں۔ اردو یونیورسٹی کا شعبہ مذاہب عالم اور اس کا نصاب بھی دیکھنے میں بہت اچھا ہے۔

انٹر نیشنل اسلامک یونیورسٹی، اسلام آباد کا نصاب

۱: بی ایس اسلامک اسٹڈیز میں مطالعہ مذہب سے متعلق مواد۔ چوتھے سمسٹر میں ایک مضمون شامل ہے۔ المدخل الی ادیان العالم [Introduction to World Religions] ساتویں سمسٹر میں ایک مضمون ہے، جس کا عنوان تاریخ دراسۃ الادیان [History of Study of Religions] ہے۔ اس کے بعد ساتوں اور آٹھواں سمسٹر تخصص کا ہے اور یہ تخصص جیسا کہ آپ کو بتایا گیا ہے یہ چھ مضامین میں ہوتا ہے اس طرح یہ کل ۶ شعبے بنتے ہیں۔

بی ایس اسلامک اسٹڈیز چار سالہ پروگرام کے آخری دو سمسٹر جو تقابل ادیان میں تخصص کرنے والوں کے لیے مرتب کیا گیا ہے۔

ساتواں سمسٹر: علم الكلام، المقدمات والالهيات، الفلسفة الغربية الحديثة، الرؤية القرآنية للاديان، الهندوسية والسيخية، الهودية، اديان اقصى الشرق۔

آٹھواں سمسٹر: البوذية والجينية، موضوعات فى مقارنة الاديان ۱، دراسة النصوص لدى المسلمين والغربيين فى الدين والفلسفة والتصوف، موضوعات فى مقارنة الاديان ۲۔

ایم فل تقابل ادیان: ایم فل میں دو سمسٹر کورس ورک پر مشتمل ہے اس کے بعد مقالہ لکھا جاتا ہے۔ تقابل ادیان کا کورس ورک ملاحظہ کریں۔

پہلا سمسٹر:

١الدراسات النقدية الغربية لليهودية والنصرانية، مقارنة الاديان(١) الكوسمولوجيافی الاديان، مقارنة الاديان(٢)فلسفة الدين، دراسة لغة الاجنبية۔

دوسرا سمسٹر:

التصوف المقارن، مقارنة الاديان(٣)الدين فی العصر الحاضر، علم الاجتماع الدينی، مياہج لدراسة الاديان، دراسة لغة اجنبية۔

اس کے بعد پی ایچ ڈی ہے جس میں دو سمسٹر کورس ورک ہے پھر مقالہ ہے۔ ان دو سمسٹرز میں مندرجہ ذیل مضامین پڑھائے جاتے ہیں:

پہلا سمسٹر:

- Major Themes in Judaism and islam
- Major Themes in Christianity and islam
- Science, Philosophy and Religion
- Specialized Language 1

دوسرا سمسٹر:

- Research Methodology
- Seminar 1[Major Themes in Hinduism and islam]
- Seminar 2[Major Themes in Buddhism and islam]
- Specialized Language 2

اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور کا نصاب

اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور میں بھی بی ایس اسلامک اسٹڈیز بمعہ تخصص چار سالہ پروگرام ہے۔ ساتواں اور آٹھواں سمسٹر تخصص پر مبنی ہے۔ یہاں تخصص مطالعہ مذاہب کا کورس ملاحظہ فرمائیں:

ساتویں سمسٹر کا نصاب:

- Muslims' Contribution to the Study of Religions (مطالعہ مذاہب میں مسلمانوں کی خدمات)
- Study of Judaism (مطالعہ یہودیت)
- Study of Hinduism (مطالعہ ہندومت)
- Study of Sikhism (مطالعہ سکھ مت)
- Research Methodology(G-11)اسالیبِ تحقیق

آٹھویں سمسٹر کا نصاب:

- Interfaith Dialogue and Harmony (بین المذاہب مکالمہ وہم آہنگی)
- Study of Christianity (مطالعہ عیسائیت)
- Study of Buddhism and Jainism (مطالعہ بدھ مت وجین مت)
- Study of Far Eastern Religions (مطالعہ مذاہب مشرق بعید)
- Thesis / Research Project (مقالہ)

وفاقی اردو یونیورسٹی میں مطالعہ مذاہب

وفاقی اردو یونیورسٹی کا نصاب ان سب میں سب سے زیادہ بہتر اور متاثر کن ہے۔ وفاقی اردو یونیورسٹی مطالعہ ادیان عالم میں تین ڈگریاں پیش کرتی ہے۔

- بی ایس چار سالہ پروگرام آٹھ سمسٹرز
- ایسوسی ایٹ ڈگری پروگرام، سمسٹر اول تا چہارم
- بی ایس دو سالہ پروگرام، سمستر پنجم تا ہشتم

ہر سمسٹر میں پڑھایا جانے والا نصاب ملاحظہ کیجیے۔ یاد رہے کہ یہاں مکمل کورس نہیں دیا جارہا بلکہ مطالعہ مذاہب سے متعلقہ مضامین ہی پیش خدمت ہیں۔

- سمسٹر اول: تعارف ادیان عالم
- سمسٹر دوم: مذہب۔
- مطالعہ مذاہب
- سمسٹر سوم: فلسفہ
- تاریخ تہذیب و تمدن
- سمسٹر چہارم: سماجیات مذہب
- اسلام
- سمسٹر پنجم: نفسیات مذہب
- علم الکلام
- مطالعہ استشراق
- ہندومت
- بدھ مت
- سمسٹر ششم: قدیم اساطیر
- غیر سامی اقلیتی مذاہب
- یہودیت
- عیسائیت
- اسلام اور غیر سامی مذاہب
- سمسٹر ہفتم: متون مقدسہ کا مطالعہ اولا سلام اور سامی مذاہب
- روحانیت و تصوف
- جدیدیت، الحاد اور اسلام
- عربی، اول
- عبرانی، اول

- سنسکرت، اول
- سمسٹر ہشتم: متون مقدسہ کا مطالعہ، دوم
- اسلام اور علوم جدیدہ
- عربی دوم
- عبرانی دوم
- سنسکرت دوم
- دعوت دین اور اس کے اسالیب
- جدید مذہبی تحریکیں
- بین المذاہب ہم آہنگی

خلاصہ بحث

ان تمام یونیورسٹیوں میں سے بہاولپور اسلامیہ یونیورسٹی اور اردو یونیورسٹی کے شعبوں کے نام میں تقابل کا لفظ نہیں ہے جبکہ بقیہ یونیورسٹیوں میں تقابل کا لفظ ہے۔ اسی طرح بی ایس اسلامک اسٹڈیز میں جن یونیورسٹیوں میں یہ مضمون پڑھیا جاتا ہے وہاں بھی یہ تقابل ادیان ہی کے عنوان سے پڑھایا جاتا ہے۔ ہمارے طالبعلمانہ خیال میں تقابل ادیان اور مطالعہ ادیان کے نام کے فرق سے مقاصد اور مناہج کے فرق واضح ہوتا ہے۔ جب آپ تقابل کی بات کرتے ہیں تو آپ لازماہر صورت میں اپنے مذہب کی سچائی اور دیگر مذاہب کے ابطال کی بات کریں گے پھر چونکہ آپ کو اپنے مذہب کی تبلیغ کا بھی ایک مذہبی ذمہ داری کے طور پر ذہن میں ہوتا ہے بلکہ آپ کے عقیدے کا حصہ ہوتا ہے اس لیے آپ ہر صورت اسی کی تبلیغ کریں گے۔ جبکہ مطالعہ مذاہب میں آپ کا کام اپنے طلبہ کو مختلف مذاہب سے آگاہی دینا ہوتا ہے اور یہ فیصلہ طالب علم پر چھوڑا جاتا ہے کہ وہ جس مذہب کو اپنی تحقیق سے سچا اور ردست مانے یہ اس کی ذمہ داری ہے، اس لیے اس میں بہر حال آپ کا مقصد کسی ایک مذہب کی سچائی اور اس کی تبلیغ کرنا نہیں ہوتا۔ ہمارے کچھ دوستوں کو اس سے اتفاق نہیں ان کا کہنا ہے کہ یہ تو استاد پر ہے وہ ایک غیر جانبدار محقق بنتا ہے یا پھر ایک مذہبی مبلغ۔ ہو سکتا ہے مطالعہ مذاہب پڑھانے والا استاد

ایک مذہبی مبلغ ہو اور ایک تقابل ادیان پڑھانے والا استاد ایک غیر جانبدارانہ محقق ہو۔ اس بات میں سچائی موجود ہے اور اس کا بالکل امکان ہے مگر اس نام سے نصاب میں کافی فرق پڑتا ہے اس کے لیے آپ اردو یونیورسٹی کا نصاب اور اسلامک یونیورسٹی کا نصاب دیکھ لیں۔ انٹرنیشنل اسلامک یونیورسٹی میری مادر علمی ہے اور وہاں کے قابل اساتذہ یقینا مذاہب کی تدریس اسی طرح کرتے ہوں گے جس کی طرف ہم اشارہ کر رہے ہیں۔ اسی لیے ہم نے بارہا یہ سنا ہے کہ وہاں کے دیگر ڈیپارٹمنٹ کے اساتذہ میں سے کچھ کو اس ڈیپارٹمنت سے سخت شکایت ہے کہ یہاں سے پڑھنے والے طلبہ صرف اسلام کی بجائے تمام مذاہب کے لیے ہمدردی کے جذبات رکھتے ہیں اور اسلام کی تبلیغ میں سرگرم عمل ہونے کے بجائے تفہیم مذاہب اور دیگر مذاہب کی تعریف و توصیف میں مگن ہو جاتے ہیں۔ اگر یہ بات درست ہے تو یہ نہایت خوش آئند بات ہے۔

ہم نے جو نصاب ترتیب دیا تھا اس کا مقصد جیسا کہ بتایا گیا ہے تمام مذاہب کا ہمدردانہ اور غیر جانبدارانہ مطالعہ اور ان مذاہب سے جانکاری حاصل کرنا تھا اس کے بعد طالب علم کسی بھی مذہب کا پیروکار بن جائے یا منکر یا پھر ملحد بن جائے ہمیں اس سے کوئی سروکار نہیں ہے۔ وہ جو بھی بنے بس دلیل اور دیانتدارانہ تحقیق کے بعد بنے۔ جن کچھ طلبہ نے یہ نصاب پڑھا انہوں نے اس سے بھرپور استفادہ کیا اور دیگر مذاہب کے متعلق ان کے جو منفی تاثرات تھے وہ زائل ہو گئے۔ یہ نصاب چونکہ فرد واحد کا تیار کردہ تھا اور یہ مختلف کتابوں کے مواد سے تیار کیا گیا تھا اس لیے یہ کافی طویل بھی تھا اور بہت زیادہ مثالی بھی نہیں تھا۔ کوشش اور خواہش ہے کہ انسانوں میں وحدت، اتحاد، پیار و محبت، رواداری اور تحمل پیدا کرنے کے لیے نہ صرف مختلف مذاہب بلکہ مختلف نظریات سے متعلق بھی ایسا نصاب مرتب کیا جائے۔

اسکولوں میں اسلامیات کے نصاب
اور طریقہ تدریس پر نظر ثانی کی ضرورت

ادارتی ٹیم

پاکستان کے اسکولوں میں اسلامیات کا نصاب ایک لازمی مضمون کے طور پہ شامل ہےاور تقریبا ہر کلاس میں اس کے لیے ایک کتاب زیردرس ہوتی ہے۔ لیکن اسکولوں کی سطح پر یہ دیکھا گیا ہے، طلبہ اسلامیات کے مضمون میں خاص دلچسپی نہیں لیتے۔ وہ اسے ایک اضافی مضمون سمجھ کر پڑھتے ہیں۔ اس کے ساتھ اساتذہ کا طریقہ تدریس بھی جاذب نظر نہیں ہے۔ اس سبق کو صرف پاس ہونے کے لیے پڑھا پڑھایا جاتا ہے۔ اس کے مندرجات کو اپنی زندگی کے ساتھ اتنا متعلق نہیں جانا جاتا۔ بلکہ دین سے متعلق اگر کسی طالب علم کو کچھ سمجھنا ہوتا ہے تو وہ متعلقہ بات میں اسلامیات کی کتاب کو مستند نہیں خیال کرتا، بلکہ باہر کسی عالم دین سے معلومات لیتا ہے۔ تعلیمی اداروں میں اسلامیات کے مضمون کی یہ حالت کیوں ہے اس مضمون میں کچھ وجوہات پر نظر ڈالی گئی ہے۔

ہمارے نصاب میں جو اسلامیات میٹرک تک بہ طور لازمی مضمون پڑھائی جاتی ہے اس پر نظر ثانی ناگزیر ہے۔اس کی کئی وجوہات ہیں۔ غور کیا جائے تو پرائمری سے لے کر سیکنڈری جماعتوں کے لئے اسلامیات لازمی میں اسلام کے جن پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے وہ بچوں کی عمر کے حساب سے، جماعت میں پڑھائے جانے کے لئے مناسب نہیں ہیں۔ اسلامیات وہ مضمون ہے جو ہمارے دین اسلام کی معلومات دیتا ہے۔ یہ اسلامی تعلیمات کو پھیلانے اور بچوں کو اپنے دین کے بارے میں آگاہی دینے کا ایک مفید ذریعہ ہو سکتا ہے۔ لہٰذا اس کا نصاب بناتے وقت ماہرین کو اس بات کا خیال ضرور رکھنا چاہئے کہ پرائمری اور سیکنڈری جماعتوں کے طلباء کی عمر اور ذہن بہت ابتدائی، سادہ اور ناسمجھ ہوتا ہے۔اس وقت ان کو ایسی تعلیم و تربیت کی ضرورت ہوتی ہے جس کے صرف اخلاقی اثرات ان کے ذہن پر مرتب ہوں نہ کہ ایسی تعلیم، جو پیچیدہ مسائل پر مشتمل ہو اور جو انہیں سمجھ نہ آئے، یا اس کا ان کی موجودہ زندگی سے تعلق ہی نہ ہو۔

اسی طرح خود اسلامیات پڑھانے والے اساتذہ بھی اس مضمون کو اہمیت نہیں دیتے۔ وہ زیادہ مطالعہ نہیں کرتے۔ کتاب کے مندرجات کو مزید کھولنے، انہیں آسان بنانے اور کتاب میں طلبہ کی دلچسپی پیدا کرنے کی کوشش نہیں کرتے۔ عام طور پہ، اسلامیات کا استاد صرف چنیدہ معلومات لے کر کمرۂ جماعت میں جاتا ہے اور اُن چیزوں سے ہٹ کر اگر کچھ نئی چیز نظر آجائے یا طلبہ کوئی نامانوس سوال کر دیں، تو وہ اس سے صَرفِ نظر کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ نجی اسکولوں میں تو اسلامیات پڑھانے والے کی مہارت اور تعلیمی قابلیت کو جانچنے دیکھنے کی ضرورت بھی محسوس نہیں کی جاتی۔ جس آدمی کو تھوڑی بہت اسلام کے بارے میں معلومات ہوتی ہیں، اُسے ہی قلیل تنخواہ میں رکھ لیا جاتا ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے طلبہ کے لیے یہ مضمون بالکل ہی غیر اہم بن جاتا ہے اور وہ استاد اور کتاب دونوں کو اہمیت نہیں دیتے۔

دوسرے مضامین کے اساتذہ کی طرح اسلامیات کے استاد کو بھی تدریس کے جدید طریقوں سے واقفیت ضروری ہے۔ جدید طریقہ تدریس میں کمپیوٹر کا استعمال، ملٹی میڈیا کا استعمال، انٹرایکٹیو وائٹ بورڈ، مختلف سافٹ ویئرز کا استعمال اور دوسرے ذرائع شامل ہیں۔ اسلامیات کا استاد جب ان ذرائع کو کمرۂ جماعت میں استعمال کرے گا تو نہ صرف وہ اپنے موضوع کو بہتر طریقے سے پڑھا سکے گا بلکہ طلبا کی دلچسپی کو بھی برقرار رکھ سکے گا۔ ایک اور مسئلہ جو دیکھنے میں آیا ہے وہ یہ کہ نصاب میں موجود موضوعات کا اطلاق عصرِ حاضر سے نہیں کیا جاتا۔ جب اُن موضوعات کا تعلق عصرِ حاضر سے جوڑیں گے ہی نہیں تو طلبا کی دلچسپی کیسے پیدا ہوگی۔

حالانکہ اسلامیات کا مضمون ہر کلاس میں پڑھایا جاتا ہے، لیکن اس کے باوجود اثرات کے اعتبار سے اس کا کردار نہ ہونے کے برابر ہے۔ بلکہ اس پہلو کو اہم سمجھا ہی نہیں جاتا۔ حالانکہ جب انڈونیشیا میں 1997 میں فسادات ہوئے تھے اور نوجوانوں میں منشیات و بے راہ روی کا رجحان بڑھنے لگا تھا تو لوگوں نے احتجاج کیے تھے کہ نوجوانوں کو دی جانے والی اسلامی تعلیم کے اثرات کیوں مرتب نہیں ہو رہے۔ اس کے بعد حکومت نے اسلامی تعلیم کے نصاب اور طریقہ تدریس پر نظرثانی کی تھی۔ ہمارے ہاں جس طرح تعلیمی اداروں میں پڑھائی جانے والی انگریزی سے طلبہ انگریزی بولنے، سمجھنے کے قابل

نہیں ہوتے اسی طرح اسلامیات کے ساتھ بھی معاملہ ہے۔ اسے کچھ عقائد و نظریات کے ناموں اور تاریخی حوالوں کے حافظے تک ہی محدود کر دیا گیا ہے۔ نتیجتاً اسلامیات کے مضمون کو کسی بھی دوسرے مضمون جتنی اہمیت بھی حاصل نہیں ہوتی۔ اساتذہ اسلامیات کے نصابی مواد کو بھی دیگر مضامین کی طرح صرف امتحانات میں کامیاب ہونے کی غرض سے روایتی طریقوں سے پڑھا رہے ہیں۔ دیگر مضامین میں زیادہ محنت کرنے اور اچھی کارکردگی دکھانے پر والدین، تعلیمی اداروں کی انتظامیہ اور اساتذہ، سبھی حوصلہ افزائی کرتے ہیں، مگر اسلامیات میں صرف پاس ہونا کافی سمجھا جاتا ہے۔

دینی تعلیم صرف نظریات و عقائد یاد کرنے کا نام نہیں ہے۔ یہ عصر حاضر کے ساتھ بھی ہم آہنگ ہوتی ہے۔ عصر حاضر میں ہمارے نوجوانوں میں جو مسائل ہیں ان کا حل اسلامی اقدار کے تحت سمجھانا چاہیے۔ معاشرہ اپنی شکل بدل چکا ہے اور اس کے مسائل بھی تبدیل ہو چکے ہیں لیکن نصابی مواد اور اسلامیات کا طریقہ تدریس اب بھی پرانا ہے۔ ہمارے ماہرین نے اسلامیات کے نصاب کو اب بھی جدید دور کے مطابق استوار نہیں کیا ہے اور نہ ہی ایسی مہارت اور طریقے کی تربیت کی جا رہی ہے جس کی مدد سے اسلامیات کو طلبہ کے کردار و عمل میں جذب کیا جا سکے۔ اساتذہ کو چاہیے کہ وہ جدید دور کو مد نظر رکھتے ہوئے اپنی ظاہری اور باطنی دونوں صلاحیتوں کو جدت فراہم کریں اور ماہرین کو چاہیے کہ وہ اسلامیات کے درسی مواد کو ان مسائل کے ساتھ ہم آہنگ کریں جو آج کے نوجوانوں کو در پیش ہیں۔ لہٰذا اساتذہ کی ایسی تربیت کی منصوبہ بندی کی جائے جس کی مدد سے وہ اسلامیات کی تدریس کے ذریعے طلبہ کی نفسیاتی الجھنوں کو حل کرنے کے ساتھ ساتھ ان کی اخلاقی پہلو سے رہنمائی کر سکیں۔ ہم ابھی تک دیگر شعبہ ہائے زندگی کی طرح شعبہ تعلیم میں بھی اسلامی تعلیمات کو سمجھانے اور عملی طور پر اس کا اطلاق کرنے میں کافی پیچھے رہ گئے ہیں جس کی وجہ سے نہ ہی انفرادی طور پر اور نہ ہی بحیثیت قوم کوئی مثبت تبدیلی آ رہی ہے۔

اسکولوں کی سطح پر پڑھائے جانے والے اسلامیات کے مضمون میں کیا مسائل ہیں اور طلبہ کی کن مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے، اس کی وضاحت معروف دانشور اور کالم نگار خورشید ندیم صاحب نے

اپنے مضمون میں بہت اچھے سے کی ہے، جو اس مسئلے کی تفہیم میں بہت مفید اور شافی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

”پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ نے نویں جماعت کے لیے جو نصاب ترتیب دیا ہے، اس میں سورہ الانفال بمعہ ترجمہ و تفسیر شامل ہے۔ تفسیر کے حوالے سے، یہ سورہ قرآن مجید کے مشکل ترین مقامات میں شمار کی جاتی ہے۔ یہ غزوہ بدر کے پس منظر میں نازل ہوئی۔ غزوہ بدر کے واقعات کو جانے بغیر اس سورہ کو سمجھنا مشکل ہے۔ خود اس غزوہ کے محرکات کے باب میں بڑے دقیق مباحث ہیں جو سیرت اور تاریخ کی کتابوں میں درج ہیں۔ مولانا مودودی نے ان کے بارے میں لکھا: "جنگ بدر کے بیان میں تاریخ و سیرت کے مصنفین نے ان روایات پر اعتماد کر لیا ہے جو حدیث اور مغازی کی کتابوں میں وارد ہوئی ہیں لیکن ان روایات کا بڑا حصہ قرآن کے خلاف ہے اور قابل اعتماد نہیں ہے“۔ (تفہیم القرآن، جلد 2 صفحہ 126)

اس سورہ کے مضامین میں جہاد و قتال، صلح و جنگ اور دارالاسلام کی آئینی حیثیت جیسے مسائل شامل ہیں۔ سورہ کی پہلی آیت ہی یہ ہے کہ "یہ تم سے مال غنیمت کے بارے میں سوال کرتے ہیں“۔ اصطلاحی مفہوم میں یہ وہ مال و اسباب ہیں جو فتح کی صورت میں مسلمانوں کے ہاتھ لگتے ہیں۔ دورِ جدید میں جنگ کی نوعیت یکسر تبدیل ہو چکی۔ مالِ غنیمت کا تصور بھی ذہنوں سے محو ہو چکا۔ سوال یہ ہے کہ یہ سارے مباحث ایک نویں جماعت کے طالب علم کی گرفت میں کیسے آسکتے ہیں؟

مثال کے طور پر سورہ کی آیت 67 سے جو مباحث شروع ہوتے ہیں، ان کی تفسیر مفسرین کے اشکالات سے مملو ہے۔ جب میں نے پہلی بار ان آیات کا مطالعہ کیا تو طویل عرصہ شدید الجھن میں مبتلا رہا۔ تفسیر کی کتب دیکھیں تو معلوم ہوا کہ مفسرین کی آراء نے تو مولانا مودودی جیسے عالم کو بھی الجھا دیا ہے۔ انہوں نے اس الجھن سے نکلنے کی کوشش کی لیکن ان کی تفسیر مجھے نہیں نکال سکی۔ اللہ تعالیٰ کی رحمت ہو امام امین احسن اصلاحی پر کہ انہوں نے یہاں دست گیری کی۔ کاش لوگ جان پاتے کہ "تدبر قرآن“ تفسیر کے باب میں کیسا تاج محل ہے جو مکتب فراہی کے اس جلیل القدر فرزند نے تعمیر کر دیا

ہے۔ میں اس الجھن سے نکلا تو ان آیات کی تفسیر پر ایک تقابلی مقالہ لکھا جو میری کتاب "بیسویں صدی کا فہم اسلام" میں شامل ہے۔

نویں جماعت کی اس نصابی کتاب کو دیکھا تو اس کی دوسری تمرین میں آیت 67 کے بارے میں سوال شامل ہے: "مندرجہ ذیل 'عبارت' کا مفہوم بیان کریں؟" آیت کو عبارت کہنے میں کیا حکمت ہے، یہ بھی مجھ پر واضح نہیں ہو سکی۔ میں لیکن یہ سوچتا رہا کہ جس 'عبارت' کا مفہوم مفسرین پر واضح نہ ہو سکا، وہ نویں جماعت کے طالب علم پر کیسے کھلے گا؟

میرے لیے یہ باور کرنا تو مشکل ہے کہ اس نصابی کتاب کے مولفین نے سورہ الانفال کا بالاستیعاب مطالعہ نہیں کیا ہوگا، کیونکہ کتاب میں درج مصنفین کی فہرست میں بڑے بڑے نام ہیں جن میں سے اکثر ڈاکٹرز ہیں۔ گمانِ غالب یہی ہے کہ یہ ڈگری علومِ اسلامیہ ہی میں ہو گی۔ اگر اس سورہ کے مطالعے کے بعد اسے نصاب میں شامل کیا گیا تو پھر یہ طے ہے کہ یہ محترم حضرات تعلیمی نفسیات سے قطعی ناواقف ہیں۔ طالب علموں کو قرآن مجید اور اسلامیات سے دور کرنے کا اس سے آسان طریقہ کوئی نہیں ہو سکتا تھا۔

ہر علم کی تدریس تدریج کے مراحل سے گزرتی ہے۔ یہ تعلیمی نفسیات کا مسلمہ اصول ہے۔ سیاسیات کے مضمون میں یہ نہیں ہوتا کہ نویں جماعت کے طالب علموں کو بین الاقوامی امور، جنگ و صلح کے قوانین پڑھائے جائیں۔ طب کے طالب علموں کو انسان کے جنسی اعضاء کی تفصیل سمجھائی جائے۔ یہ سب علوم طالب علم کی عمر اور تفہیم کی صلاحیت کو سامنے رکھ کر پڑھائے جاتے ہیں۔ میں نہیں جان سکا کہ قرآن مجید اور اسلام کی تعلیم میں اس تدریج کا اہتمام کیوں نہیں کیا جاتا؟ معلوم یہ ہوتا ہے کہ اسلامیات کے نصاب ترتیب دینے والے سیرت اور دینی حکمت سے بھی واقف نہیں۔ مکہ کے تیرہ سالوں میں قرآن مجید نازل ہوتا رہا۔ اس دوران میں جہاد کی کوئی آیت نازل ہوئی نہ حدود و تعزیرات کے نفاذ کا حکم دیا گیا۔ ہجرت کے بعد سورہ حج کی آیات (39-40) نازل ہوئیں جن میں جہاد (قتال) کی اجازت دی گئی۔ یہی معاملہ حدود کے نفاذ کا ہے۔ یہی نہیں روزے جیسی عبادت کا حکم بھی ہجرت کے دوسرے سال نازل ہوا۔

اسلام کی تعلیمات دین کے ہر شعبے میں راہنمائی دیتی ہیں۔ سوال یہ ہے کہ طالب علموں کو ان میں سے کون سا حصہ اور کب پڑھایا جائے۔ سادہ سی بات ہے کہ عمر کا یہ مرحلہ جسمانی اور ذہنی تغیرات کا زمانہ ہوتا ہے۔ اس میں شخصیت کی اخلاقی اور ذہنی پختگی کی ضرورت ہوتی ہے۔ قرآن مجید کا بڑا حصہ عقائد اور اخلاقیات کے باب میں نازل ہوا ہے۔ سورہ الانفال ہیں بھی یہ تعلیمات موجود ہیں لیکن ان کا تناظر بالکل دوسرا ہے۔ ضروری یہ ہے اس عمر میں بچوں کو یہ سکھایا جائے کہ اہل خانہ کے ساتھ ان کا رویہ کیا ہونا چاہیے۔ اہل محلہ، عزیز واقارب کے ساتھ ان کے تعلقات کی نوعیت کیا ہونی چاہیے۔ بنیادی اخلاقی خصائص کیسے پیدا کیے جائیں۔ زندگی جوہری طور پر اخلاقی تعمیر چاہتی ہے یا مادی۔ نویں جماعت کے طالب علم کو محاذ جنگ پر جانا ہوتا ہے نہ وزارت خارجہ میں ملازمت کرنی ہوتی ہے کہ اسے جنگ و صلح کے قوانین یا دارالاسلام کے مسائل سمجھائے جائیں۔ اس عمر میں تو اسے ایک معاشرے کا فعال رکن بننا ہوتا ہے۔ لازم ہے کہ اسے اس حوالے سے تیار کیا جائے۔

بچوں کو اگر فزکس سے متنفر کرنا ہے تو اس کا آسان طریقہ یہ ہے کہ انہیں آٹھویں نویں جماعت میں آئن سٹائن اور ڈاکٹر عبدالسلام کی تحقیقات پڑھائی جائیں۔ اس کے بعد دیکھیے کہ وہ فزکس سے کیسے بھاگتے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ فزکس میں بھی ہم یہی کر رہے ہیں۔ چند روز پہلے ایک انگریزی اخبار میں ڈاکٹر پرویز ہودبائی نے سندھ کے سکولوں میں پڑھائی جانے والی سائنس کی کتب کا جائزہ لیا ہے۔ اسے پڑھیے تو معلوم ہوتا ہے کہ فزکس اور اسلامیات، دونوں میں رویہ ایک ہی ہے۔ اس کے بعد مذہب اور سائنس کے جیسے ماہرین تیار ہو سکتے ہیں، وہ ہم دیکھ رہے ہیں۔ اگر ہم اپنے بچوں میں دین کا شعور اور دلچسپی پیدا کرنا چاہتے ہیں تو لازم ہے کہ اس نصاب کی تشکیل نو کی جائے۔

فروغِ امن کے لیے نصاب اور تعلیمی اصلاحات

ادارتی ٹیم

گزشتہ کئی سالوں سے انتہاپسندی کی اذیت ناک لہر نے مسلم ممالک کو بالعموم اور پاکستان کو بالخصوص ایک گرداب میں ڈال رکھا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ مسلمان مجموعی طور پر عسکریت پسندی کی مذمت اور مخالفت کرتے ہیں اور اسلام کے ساتھ اس کا دور کا رشتہ بھی قبول کرنے کو تیار نہیں ہیں، جہاں تک انفرادی طور پہ ایسے کچھ عناصر یا جماعتوں کا تعلق ہے جواس کا حصہ بنتے ہیں یا اس کی خاموش حمایت کرتے دکھائی دیتے ہیں تووہ مسلمانوں کی نمائندگی نہیں ہے۔انتہاپسندی اور عسکریت پسندی کے عفریت کا مقابلہ کرنے کے لیے پاکستان میں بہت سے اقدامات کیے گئے، جن میں ایک پہلو تعلیمی اصلاحات کا بھی ہے۔اس ضمن میں کئی نجی اداروں نے فروغِ امن کے لیے نصاب بھی وضع کیے اور سفارشات بھی مرتب کیں۔ اس مضمون میں ایسی ہی چند کاوشوں کا ذکر کیا جاتا ہے۔

انتہاپسندی کے خاتمے کے لیے تعلیمی اداروں کی اہمیت

انتہاپسندی کے خاتمے کے لیے تعلیمی اداروں کا کردار بہت بنیادی سمجھا جاتا ہے۔پاکستان ایک طویل عرصے سے شدت پسندی کے مسئلے سے دوچار ہے اور اس ضمن میں جہاں دیگر بہت سے پہلوؤں پر تجاویز وسفارشات دی جاتی ہیں اور حل کے لیے اقدامات پیش کیے جاتے ہیں، وہیں ایک تجویز یہ بھی رہی ہے کہ انسدادِ دہشت گردی کے لیے نصاب بھی تیار کیے جائیں۔اس ضمن میں ڈاکٹر طاہر القادری کا مرتب کردہ نصاب سب سے تفصیلی اور معروف ہے۔مگر اس کے علاوہ بھی کئی اداروں اور شخصیات نے 'امن نصاب' مرتب کیے ہیں، یا کچھ کتب تیار کی ہیں جن کے ذریعے نوجوانوں کی ذہن سازی کی جاسکتی ہے۔

ماہرین کے مطابق، تعلیمی اداروں میں امن کے کلچر کو فروغ دینے کے لیے ایک تو غیر نصابی سر گرمیوں کا انعقاد، کھیلوں کی سر گرمیاں، سٹوڈنٹس سوسائٹیز کا قیام جیسے اقدامات اہم کردار ادا کر سکتے

ہیں، مزید برآں نصاب میں پائیدار ترقی کے اہداف، امن، بنیادی انسانی حقوق اور آئین کے متعلقہ موضوعات شامل کیے جانے چاہیئں، جن سے نہ صرف نوجوانوں کی معلومات میں اضافہ کیا جا سکتا ہے، بلکہ وہ موثر اور باخبر شہری کی حیثیت سے معاشرے کی بہتری میں فعال کردار ادا کر سکتے ہیں۔ تعلیمی اداروں کو ان اہم موضوعات پر سیمینار، کانفرنس، ورکشاپ، تقریری مقابلہ جات، مضمون نویسی اور شارٹ کورسز کا انعقاد کروانا چاہئے۔ پاکستان کو اس وقت بہت سے سیاسی، سماجی، لسانی، مذہبی ماحولیاتی اور فرقہ وارانہ تنازعات کا بھی سامنا ہے، جن سے نمٹنے کے لئے تعلیمی اداروں کو امن کاری پر کام کرنے والے متعلقہ اداروں کے ساتھ شراکت داری بھی کرنی چاہیے، کیونکہ اس سے ان اہم مسائل کی تفہیم اور ان پر مکالمے کی فضا ہموار ہو گی۔ امن کے قیام اور تنازعات کے حل سے ہی پائیدار معاشی ترقی اور موثر جمہوریت کا خواب شرمندۂ تعبیر ہو سکتا ہے اور ان کے ثمرات سے عوام براہ راست مستفید ہو سکتے ہیں۔

تعلیم انسانوں اور مختلف قومیتوں کو ایک دوسرے کے نزدیک لانے کے لئے ایک فعال ذریعہ ہے، جبکہ تعلیمی اداروں کو جن خیالات، جدت طرازی اور تخلیقی علوم کا محور مانا جاتا ہے، وہ امن، برداشت، ہم آہنگی، انسانیت کا احترام جیسی روایات کو پروان چڑھانے اور نوجوان نسل میں ان کے بارے میں آگاہی کے لئے کلیدی کردار کے حامل ہیں۔ ضرورت اس امر کی بھی ہے کہ پاکستانی اعلی تعلیمی اداروں میں مقامی تنازعات کے اسباب جاننے اور ان کے حل کے لئے تحقیق کی جانی چاہیے، اور سماجی علوم کے ماہرین کو اس کاوش میں شامل کرنا چاہئے۔

امن نصاب

امن نصاب کے حوالے سے ایک کاوش 'ادارہ امن و تعلیم' نے بھی ہے کہ انہوں نے اس پر ایک کتاب مرتب کی ہے جس میں حل تنازعات، مکالمہ اور رواداری جیسے موضوعات پر آسان زبان میں مواد شامل کیا گیا ہے۔ 'تعلیم، امن اور اسلام' نامی اس کتاب میں درج ذیل ابواب حصہ ہیں:

- تنوع: کائنات احسن

- اختلاف: اصول اور آداب
- امن اور سلامتی، معاشرے کی بنیادی ضرورت
- تعمیرِ امن اور حلِ تنازعات، اسلامی اقدار اور اصول
- تنازع کے بنیادی تصورات
- تنازعات کے دوران رویے
- تنازع اور تشدد کی صورتیں
- تنازع کے مراحل اور اسباب
- تنازعات کے حل کے مختلف اسالیب
- گفتگو کے آداب
- مکالمہ کی اہمیت اور اس کے اصول
- حقوق العباد کی ادائیگی، امن کی ضمانت
- آئین پاکستان میں بیان کیے گئے بنیادی حقوق
- فرقہ واریت کا سد باب

مدارس کی سطح پر اقدامات

اس کے علاوہ کئی دیگر اداروں نے مدارس کے اندر بالخصوص کچھ اقدامات کرنے کی تجاویز دی ہیں جن کا خلاصہ یہ ہے:

(1) مدارس کے اندر جملہ مکاتب فکر کے مابین 'مشترکات' کو فروغ دیا جائے۔

(2) جملہ مکاتب فکر غیر تربیت یافتہ افراد کو اپنی اپنی مساجد کے منبر و محراب تک پہنچنے سے روکنے کے لیے عملی اقدامات کریں۔

(3) فرقہ واریت کے اسباب کا سدِ باب کیا جائے۔

الف۔ دل آزار تحریروں اور تقریروں پر پابندی عائد کی جائے۔

ب۔ فتویٰ نما نعروں سے تمام علماء اپنے اپنے پیروکاروں کو روکیں۔

(4) اختلافات کے ہوتے ہوئے باہمی احترام اور برداشت کو فروغ دیا جائے۔

(5) تمام مکاتب فکر کے عقائد پر مشتمل، ایک ایسی کتاب مرتب کی جائے جس میں ہر مسلک کا عقیدہ خود انہی کے جید علماء کرام پیش کریں۔

(6) ملکی سطح پر ایک ایسا فورم تشکیل دیا جائے جو تمام مکاتب فکر کے جید علماء کرام اور مفتیان عظام پر مشتمل ہو اور فتویٰ جاری کرنے کا اختیار اسی فورم کے پاس ہو۔

(7) مذہبی ہم آہنگی اور باہمی روابط و مکالمہ کا عمل دینی مدارس کے طلبہ کی سطح سے شروع کیا جائے۔

(8) دینی مدارس، جامعات اور مساجد کے نام عمومی اور قابلِ قبول ہونے چاہئیں جو مسلکی اختلافات کا تاثر نہ دیتے ہوں۔

(9) علماء کرام دین کی تبلیغ کو مقدم رکھیں، مسلک کے پرچار کو ترجیح نہ دیں۔

(10) ملکی سالمیت اور امن وامان کو پیشِ نظر رکھنے کا اہتمام کیا جائے۔

(11) فرقہ واریت کے نقصانات، خطرات اور تباہ کاریوں کی تقریری اور تحریری صورت میں نشاندہی کی جائے۔

(12) مسلکی ہم آہنگی کے لیے دوسرے مسالک کا مبنی بر انصاف تعارف شامل نصاب کیا جائے۔

(13) دینی مدارس اور عالمی دینی یونیورسٹیوں میں تعاون اور رابطے میں اضافہ کیا جائے۔

(14) تکفیر، خروج اور دیگر مسائل میں رائے دینے کے لیے تمام مسالک کے جید علماء اور اسکالرز پر مشتمل ایک فورم بنایا جائے۔

(15) مختلف مذہبی ایام پر مدارس و مساجد میں مشترکہ اجتماعات منعقد کیے جائیں۔

نصاب برائے فروغِ امن وانسدادِ دہشت گردی

پاکستان کو لگ بھگ دو دہائیوں سے دہشت گردی کی لہر کا سامنا ہے۔اس صدی کے شروع میں جب پاکستان کو اس آگ کی تپش محسوس ہونا شروع ہوئی تو چونکہ یہ ایک نیا مسئلہ تھا، اس لیے اس کے مختلف پہلوؤں پر بحثیں ہونے لگیں۔ سال 2008 کے بعد جب یہ مسئلہ شدید ہونے لگا تو امن وامان کو بحال کرنے اور ملک میں انتہاپسندی کے خیالات کا توڑ کرنے کے وسائل وذرائع پر بھی باتیں ہونے لگیں۔ علماء میں ڈاکٹر طاہر القادری وہ شخصیت تھے جنہوں نے اس مسئلے پر علمی و دینی تناظر میں تفصیلی موقف پیش کیا۔انہوں نے دہشتگردی وانتہاپسندی کے خلاف جامع فتوی دیا جو کہ 2010 سے کتابی شکل میں دستیاب ہے۔اس فتوی کا انگریزی، عربی، ہندی، سمیت دنیا کی بہت سی زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے۔ انہوں نے دہشت گردی اور انتہاپسندی کے موضوع پر درجنوں کتابچے اور مقالات شائع کیے۔ پھر بعد میں جب آرمی پبلک اسکول کا سانحہ رونما ہوا تو انہوں نے باقاعدہ ایک تعلیمی نصاب مرتب کیا جس کا عنوان ہے 'نصاب برائے فروغِ امن وانسدادِ دہشت گردی'۔ یہ نصاب بہت ہی اہمیت کا حامل ہے، جو ملک کے مختلف طبقات کی تربیت کے لیے مرتب کیا گیا ہے۔اگر عملاً اس نصاب کو سرکاری سطح پر کہیں لاگو نہیں کیا گیا، لیکن اپنے مواد، اہداف اور موضوعات کے لحاظ سے یہ ایک بہترین کاوش ہے۔ یہ نصاب کالجز، یونی ورسٹیز اور دیگر تعلیمی اِداروں کے طلبہ وطالبات اور نوجوانوں کے ساتھ ساتھ ہر طبقہ زندگی سے تعلق رکھنے والے افراد کے لیے ترتیب دیا گیا ہے تاکہ وہ اِنتہاپسندانہ فکر سے متاثر ہونے کے بجائے اِسلام کے تصورِ اَمن و سلامتی سے رُوشناس ہو کر معاشرے کے ذِمہ دار اور کار آمد اَفراد بن سکیں۔

آج نہ صرف مسلمانوں بلکہ پوری انسانیت کے لئے بہت بڑا چیلنج دہشت گردی ہے۔اور بدقسمتی سے دہشت گردی کو آج اسلام اور جہاد سے جوڑا جا رہا ہے۔ فروغ امن اور انسداد دہشت گردی کے اسلامی نصاب کو پیش کرنے کا مقصد مسلم و غیر مسلم ہر فرد کو اسلام کی اصل تعلیمات سے روشناس کروانا ہے۔ دہشت گردی کے فروغ کے متعدد اسباب ہیں۔ سیاسی، معاشی، معاشرتی، نظریاتی، ان تمام اسباب کا قلع قمع کرنے سے ہی دہشت گردی کا خاتمہ ممکن ہے۔ڈاکٹر طاہر القادری کا یہ نصاب

بہت ہی عمدہ کاوش ہے جس میں ان تمام اسباب کو مدنظر رکھتے ہوئے اور اسلامی نقطہ نظر کی صحیح ترجمانی کرتے ہوئے تربیتی کورس تیار کیا گیا ہے۔

ذیل میں مختلف طبقات کی تربیت و ذہن سازی کے لئے تیار کئے گئے ''قومی نصاب برائے فروغ امن'' کے اغراض و مقاصد اور اجمالی خاکے درج کئے جارہے ہیں:

1۔ کورس برائے مسلح افواج

اغراض و مقاصد

یہ کورس مسلح افواج کے جوانوں کے لیے ترتیب دیا گیا ہے۔ اس کا مقصد مسلح افواج کے جوانوں کی دہشت گردی و انتہا پسندی کے حوالے سے علمی و فکری تربیت کے ساتھ ساتھ انہیں عملی طور پر دہشت گردوں کے خلاف بر سر پیکار ہونے کی تحریک دینا ہے۔ اس کے بنیادی مقاصد درج ذیل ہیں:

- افواجِ پاکستان میں دہشت گردی اور انتہا پسندی کے صحیح تصور کو اُجاگر کرنا۔
- دہشت گردوں کے خلاف عملی اِقدامات کا جذبہ پیدا کرنا۔
- دہشت گردی کے خلاف جنگ کی شرعی حیثیت واضح کرنا۔
- اِنتہا پسندی اور دہشت گردی کے حق میں اِستعمال کیے جانے والے مذہبی دلائل کے ردّ میں مذہبی آگہی فراہم کرنا۔
- اِس بات کو راسخ کرنا کہ دہشت گردی کے خلاف جنگ حقیقی جہاد ہے۔

دورانیہ:

یہ کورس تین دنوں کی تدریس پر مشتمل ہو گا۔ اس کو روزانہ آٹھ گھنٹے (دو گھنٹے کا ایک سیشن) کی صورت میں تین دن میں مکمل کروایا جائے گا۔

شرکاء کی تعلیمی قابلیت:

یہ کورس مسلح افواج کے افسران اور جوانوں کے لیے ہے۔

معلمین کی تعلیمی قابلیت:

مذکورہ مقاصد کے حصول کا انحصار مبلغین و معلمین کی فکری پختگی پر ہے۔ٹریننگ کے لیے ایسے ماہرین ہونے چاہییں جو دینی علوم پر کامل دسترس کے ساتھ ساتھ بین المسالک، بین المذاہب،اور بین الاقوامی سطح پر پائے جانے والے عصری و تہذیبی مسائل کو بیان کرنے کی صلاحیت رکھتے ہوں۔

کورس کا اجمالی خاکہ

- اسلام کا تصورِ امن و سلامتی۔
- تنگ نظری سے انتہا پسندی، انتہا پسندی سے دہشت گردی تک کے تدریجی مراحل۔
- دہشت گردی کے حوالے سے اٹھنے والے سوالات کے مختصر جوابات۔
- حسن نیت سے بدی نیکی نہیں بن سکتی۔
- بغاوت کیا ہے اور باغی کون ہوتا ہے؟
- بغاوت اور اس کی سزا۔
- فاسق حکومت کے خلاف قتال کی شرعی حیثیت۔
- دہشت گردی اور بغاوت کے خلاف ائمہ اربعہ اور دیگر اکابرینِ اُمت کے فتاویٰ۔
- باغیوں کے بارے میں معاصر علماء کے فتاویٰ۔
- فتنہ خوارج، عصرِ حاضر کے دہشت گرد خوارج ہیں۔
- خوارج، دہشت گرد اور فرامین رسول۔
- خوارج کے خلاف جہاد کی فضیلت۔
- جہاد اور قتال میں فرق۔

- فرضیت جہاد کے مراحل۔
- شرائط و آدابِ جہاد۔

2۔ کورس برائے اساتذہ کرام

اَغراض و مقاصد:

یہ کورس اساتذہ کرام کے لیے ترتیب دیا گیا ہے۔ اس کا مقصد اساتذہ کرام کو دہشت گردی و انتہا پسندی کے خلاف علمی و فکری تربیت دینا ہے تاکہ وہ مستقبل کے معماروں کو دہشت گردوں کے مذموم مقاصد سے آگاہ کر سکیں اور اُنہیں اَمن پسندی کی تعلیم دے سکیں۔ اس کورس کے بنیادی مقاصد درج ذیل ہیں:

- اساتذہ کرام کو بین المذاہب رواداری اور بین المسالک ہم آہنگی کے فروغ کے لیے ضروری مواد کی فراہمی۔
- انسانی جان کی تکریم و حفاظت اور اس کو ناجائز تلف کرنے کی حرمت پر قرآن و حدیث سے دلائل کی دستیابی اور متعلقہ لٹریچر کا تعارف۔
- دہشت گردوں اور انتہا پسندوں کی طرف سے دیے گئے مذہبی دلائل کا علمی ردّ۔
- تمام مذاہب و مکاتب کے کبار ائمہ کی طرف سے انتہا پسندی اور دہشت گردی کی مذمت پر فتاوی جات سے مختصر آگہی دلانا۔
- جہاد کے حقیقی تصور سے روشناسی تاکہ عوام الناس کو غلط تعبیرات و تشریحات سے بچایا جاسکے۔
- سیاست، جمہوریت، مخلوط تعلیم، مغربی دنیا اور اس سے متعلقہ دیگر انتہا پسندانہ اَفکار میں اِعتدال پیدا کرنا۔
- دہشت گردی کے حرام ہونے اور اس کی مذمت کے حوالے سے اساتذہ کرام کی ذہن سازی کرنا تاکہ وہ دورانِ تدریس طلباء و طالبات کو اس بارے کماحقہ آگاہ کر سکیں۔

دورانیہ:

یہ کورس تین دنوں کی تدریس پر مشتمل ہو گا اس کو روزانہ آٹھ گھنٹے (دو گھنٹے کا ایک سیشن) کی صورت میں تین دن میں مکمل کروایا جائے گا۔

شرکاء کی تعلیمی قابلیت:

یہ کورس سکول اور کالجز کے اساتذہ کے لیے ہے۔

کورس کا جمالی خاکہ

- اسلام کا تصورِ امن و سلامتی
- مسلمان اور مومن: فرامین رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی روشنی میں
- حقیقی تصورِ دین
- دہشت گردی کے حوالے سے اٹھنے والے سوالوں کے مختصر جوابات
- حسن نیت سے بدی نیکی نہیں بن سکتی
- دہشت گردی کے بارے میں ائمہ متقدمین کے اقوال
- دہشت گردی کے بارے میں معاصر علماء کے فتاویٰ
- مسلمانوں کے قتل کی ممانعت
- مسلم ریاست اور نظمِ اجتماعی کے خلاف مسلح بغاوت کی ممانعت
- بنیادی اِنسانی حقوق
- تفرقہ پروری کی موت کفر کی موت ہے
- غیر مسلموں کے حقوق
- اِسلام میں ممالک کی تقسیم (معاہدات و مواثیق کے تناظر میں(
- جہاد کا حقیقی تصور
- اسلام، خدمتِ انسانیت کا مذہب ہے

- دعوتِ فکر واصلاح

3۔ کورس برائے ائمہ و خطباء

اَغراض و مقاصد:

یہ کورس ائمہ و خطباء کے لیے ترتیب دیا گیا ہے۔ اس کا مقصد علماء کی دہشت گردی وانتہا پسندی کے حوالے سے علمی و فکری تربیت کے ساتھ ساتھ انہیں تقریری اور تحریری مواد فراہم کرنا ہے۔ اس کے بنیادی مقاصد درج ذیل ہیں:

- مساجد کو بین المذاہب رواداری اور بین المسالک ہم آہنگی کے لیے استعمال کرنا۔
- دہشت گردوں اور اِنتہا پسندوں کی طرف سے دیے گئے مذہبی دلائل کا علمی ردّ
- اِسلام کی رحمت و شفقت، لطف و کرم، عفو و در گزر والی تعلیمات کو اُجاگر کرنا تاکہ اِنسانی سوچوں سے تنگ نظری اور اِنتہا پسندی کو ختم کیا جاسکے۔
- علماء وخطباء کو اُمہات الکتب کی طرف مراجعت اور ذوقِ تحقیق کی ترغیب دلانا
- محافل ومجالس اور جمعات کے خطابات کے لیے معروضی حالات کے مطابق عنوانات کی اہمیت اُجاگر کرنا تاکہ قومی سطح پر انسدادِ دہشتگردی کی تحریک برپا کی جاسکے۔
- علماء کو نظمِ ریاست، ملکی قانون، اقوام متحدہ کے متعلقہ قوانین سے متعارف کروانا تاکہ وہ جدید عصری تقاضوں کے مطابق اِسلام کے بہترین ترجمان ثابت ہو سکیں۔
- علماء کو دین کی حکمت و مصلحت (Diplomacy of Islam) اور عالمی سیاسی و مذہبی نزاکتوں سے روشناس کرنا۔
- ریاست، فوج، قومی سلامتی کے اداروں کے تحفظ واحترام پر علماء کو مؤثر مذہبی مواد مہیا کرنا۔
- انسانی جان کی تکریم و حفاظت اور اس کو ناجائز تلف کرنے کی حرمت پر قرآن و حدیث سے دلائل کی دستیابی اور متعلقہ لٹریچر کا تعارف
- تمام مسالک و مکاتب کے مستند و معتمد آئمہ (authentic scholars) کی طرف سے

انتہا پسندی اور دہشت گردی کی مذمت پر فتاویٰ جات سے آگہی

- جہاد کے حقیقی تصور سے روشناسی تاکہ عوام الناس کو غلط تعبیرات و تشریحات سے بچایا جاسکے۔
- سیاست، جمہوریت، مخلوط تعلیم اور مغربی دنیا وغیرہ کے بارے میں انتہا پسندانہ نظریات میں اعتدال و توازن (moderation) پیدا کرنا۔

دورانیہ:

یہ کورس چوبیس گھنٹے کی تدریس پر مشتمل ہوگا اور اس کو روزانہ آٹھ گھنٹے (دو گھنٹے کا ایک سیشن) کی صورت میں تین دن میں مکمل کروایا جائے گا۔

شرکاء کی تعلیمی قابلیت:

یہ کورس ائمہ و خطباء کے لیے ہے۔اس کورس میں درس نظامی اسکالرز، علما، خطبااور اسلامیات/عربی میں کم از کم بی اے تعلیمی قابلیت کے حامل افراد شرکت کر سکتے ہیں۔

کورس کا اجمالی خاکہ

- اسلام کا تصور امن و سلامتی۔
- تنگ نظری سے انتہا پسندی، انتہا پسندی سے دہشت گردی تک کے تدریجی مراحل۔
- حُسنِ نیت سے بدی نیکی نہیں بن سکتی۔
- بنیادی اِنسانی حقوق۔
- تفرقہ پروری کی موت کفر کی موت ہے۔
- فرقہ پرستی کے خاتمے کا ممکنہ لائحہ عمل۔
- مسلمانوں کے قتل کی ممانعت۔
- غیر مسلموں کے قتلِ عام اور ایذا رسانی کی ممانعت۔
- مسلم ریاست اور نظمِ اِجتماعی کے خلاف مسلح بغاوت کی ممانعت۔

- دہشت گردی کے خلاف ائمہ اربعہ ودیگر اکابرینِ اُمت کے فتاویٰ۔
- فتنہ خوارِج اور عصر حاضر کے دہشت گرد۔
- خوارج کے خلاف جہاد کی فضیلت۔
- سیرتِ نبوی کی روشنی میں اَہلِ کتاب اور غیر اَہلِ کتاب میں فرق۔
- غیر مسلموں کے حقوق اور ان کے ساتھ تعلقات کے شرعی احکام۔
- اِسلام میں ممالک کی تقسیم (معاہدات و مواثیق کے تناظر میں)
- خلافت و جمہوریت۔
- جہاد کا اسلامی تصور۔
- عصر حاضر میں علماء کی ذمہ داریاں۔
- تکفیریت کا خاتمہ۔
- مسلم ریاست میں اِعلائے کلمہ حق کا پُر اَمن طریق۔

4۔ کورس برائے طلباء و طالبات کالجز و یونیورسٹیز

اغراض و مقاصد:

یہ کورس کالجز و یونیورسٹیز کے طلباء و طالبات کے لئے ترتیب دیا گیا ہے۔اس کا مقصد طلباء کو دہشت گردی و انتہا پسندی کے خلاف علمی و فکری مواد فراہم کرنا ہے تا کہ وہ دوران تعلیم بھی اور اپنی عملی زندگی میں بھی دہشت گردوں کے عزائم سے واقفیت کی بناء پر ان کے آلہ کار نہ بن سکیں۔اس کورس کے بنیادی مقاصد درج ذیل ہیں:

- طلبہ کو اسلام کے حقیقی تصور جہاد سے روشناس کرانا۔
- بنیاد پرستی سے انتہا پسندی اور انتہا پسندی سے دہشت گردی جنم لینے کی تعلیم سے آگہی دلانا۔
- فتنہ خوارج اور عصر حاضر کے دہشت گردوں کے عقائد و نظریات سے متعلق معلومات دینا۔
- قرآن و سنت کے ذریعے دہشت گرد خوارج کی علامات بتا کر دہشتگردی کے خاتمے کا اہتمام

کرنا۔

- اُمت مسلمہ کے زوال کے اسباب کو اجاگر کرکے عروج کیلئے خدمت دین اور احیاء اسلام کا جذبہ پیدا کرنا۔
- قیام امن اور محبت کے کردار کو اجاگر کرنا۔
- قلوب واذہان میں رحم دلانہ جذبات واحساسات پختہ کرنا۔
- بین المذاہب رواداری اور بین المسالک ہم آہنگی کو فروغ دینا۔
- اعلی اخلاقی اقدار سے مزین ہو کر معاشرے کی اصلاح کا جذبہ پیدا کرنا۔
- مخرب اخلاق وکردار اشیاء سے اجتناب کا داعیہ پیدا کرنا۔
- ناامیدی ومایوسی کے رجحانات کا خاتمہ کرنا۔
- ملک وملت کی تعمیر اور انکی شان وشوکت بڑھانے میں اپنا کردار ادا کرنے کا جذبہ پیدا کرنا۔
- بزرگان دین کے احوال زندگی کے مطالعے کا شوق پیدا کرنا۔

دورانیہ:

یہ کورس 15 گھنٹے کی تدریس پر مشتمل ہوگا۔ایک کلاس ڈیڑھ گھنٹے پر مشتمل ہوگی اسطرح یہ کورس پانچ دن میں مکمل ہوگا۔

شرکاء کی تعلیمی قابلیت:

یہ کورس کالج اور یونیورسٹی کے طلبہ وطالبات کے لئے ہے۔

معلمین کی تعلیمی قابلیت:

اس کورس کو پڑھانے والے کالج ویونیورسٹی کے ایسیا ساتذہ، لیکچرار، پروفیسر حضرات ہونگے جو پہلے سے عربی، اسلامیات، اردو اور مطالعہ پاکستان پڑھا رہے ہوں گے۔ ان افراد کو ترجیح حاصل ہوگی جنہوں نے اساتذہ کے لئے ترتیب دیا گیا نصاب ہذا باقاعدہ پڑھا ہوگا۔

کورس کا اجمالی خاکہ

- اسلام کا معنی و مفہوم
- اعتدال، بنیاد پرستی، انتہا پسندی، شدت پسندی اور دہشت گردی کا تصور
- غیر مسلموں کے قتل عام اور ایذا رسانی کی ممانعت
- مسلم ریاست اور نظمِ اجتماعی کے خلاف مسلح بغاوت کی ممانعت
- فتنہ خوارج اور عصر حاضر کے دہشت گرد
- قرآن میں امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا حکم
- قومی زندگی کا اجتماعی نصب العین

5۔ کورس برائے عامۃ الناس

اغراض و مقاصد:

یہ کورس عامۃ الناس کے لئے ترتیب دیا گیا ہے۔ اس کا مقصد عوام الناس کو دہشت گردوں اور انتہا پسندوں کے عزائم سے واقفیت دلانا اور اسلام کی تعلیمات امن کو فروغ دینا ہے تاکہ ہر فرد اپنی ذمہ داری کا احساس کرتے ہوئے معاشرے میں امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا فریضہ سرانجام دے سکے۔ اس کورس کے بنیادی مقاصد درج ذیل ہیں:

- دین اسلام کو بطور دین امن و سلامتی، عامۃ الناس میں متعارف کرانا
- دہشت گردی کے حوالے سے بنیادی معلومات فراہم کرنا
- جنت اور دوزخ کے حقیقی تصور کو اجاگر کرنا
- تصور جہاد اور تصور فساد کی وضاحت کرنا
- دینی تعلیمات کی روشنی میں عامۃ الناس کو انتہا پسندی اور دہشت گردی کے نظریات سے محفوظ رکھنا
- عامۃ الناس میں امر بالمعروف و نہی عن المنکر کیلئے اجتماعی جدوجہد کا شعور بیدار کرنا

- معاشرے میں قیام امن کے لئے اسلام کے انقلابی کردار سے روشناس کرانا

دورانیہ:

یہ کورس 6 گھنٹے کی تدریس پر مشتمل ہوگا۔ ایک کلاس 2 گھنٹے پر مشتمل ہو گی اس طرح یہ کورس 3 دن میں مکمل ہو گا۔

شرکاء کی تعلیمی قابلیت:

یہ کورس عامۃ الناس اور چھٹی کلاس سے دہم کلاس تک کے طلبہ و طالبات کے لئے ہے۔

معلمین کی تعلیمی قابلیت:

اس کورس کو پڑھانے والے اسکول کے ایسے اساتذہ حضرات ہوں گے جو پہلے سے عربی، اسلامیات، اردو اور مطالعہ پاکستان پڑھا رہے ہوں گے۔ اس کے علاوہ درس نظامی کے اسکالر، علماء، خطباء، اسلامیات / عربی میں کم از کم بی اے تعلیمی قابلیت کے حامل افراد بھی اہل ہوں گے۔ اُن اساتذہ اور ائمہ و خطباء افراد کو ترجیح دی جائے گی جنہوں نے اساتذہ اور ائمہ و خطباء کے لئے مرتب کردہ نصاب ہذا باقاعدہ پڑھا ہو گا۔

کورس کا اجمالی خاکہ

- دین اسلام کا تصور امن و سلامتی
- اسلام کا حقیقی تصور جہاد
- دہشت گردی، بنیاد پرستی اور انتہا پسندی سے جنم لیتی ہے
- غیر مسلموں کے قتل عام، بدسلوکی اور ایذارسانی کی ممانعت
- بغاوت کیا ہے اور باغی کون ہوتا ہے؟
- فتنہ خوارج اور عصر حاضر کے دہشت گرد، قرآن حکیم کی روشنی میں
- مسلم ریاست میں امر بالمعروف و نہی عن المنکر کیلئے اجتماعی جدوجہد

پاکستان میں مذہبی تعلیم کا نظام

مذہبی تعلیم سے وابستہ چند فکری پہلو

ڈاکٹر مولانا عمار خان ناصر

پاکستان میں مذہبی تعلیم عام طور پہ مدارس کے ساتھ خاص ہے،اور معاشرے میں جو دینی فکر و مزاج تشکیل پاتے ہیں ان کے اصل مصادر مدارس ہی ہیں،اور وہ یہ صلاحیت رکھتے ہیں کہ رائے عامہ کی تشکیل میں کردار ادا کرسکیں۔لہذا ان اداروں کے اثرات اور اور معاشرتی کردار کو مدنظر رکھتے ہوئے اہل علم بہت وقت سے نظام میں اصلاحات کی باتیں کر رہے ہیں۔بلاشبہ مدارس کا وسیع تعلیمی ڈھانچہ مثبت نتائج کا حامل بھی ہے،مگر اس بارے جو خدشات و تحفظات ہیں ان کو اہمیت دینا بھی ضروری ہے۔ اس مضمون میں دینی تعلیمی نظام سے جڑے مسائل پر گفتگو کی گئی ہے۔ مصنف نامور مذہبی سکالر،دانشور اور گفٹ یونیورسٹی گوجرانوالہ میں پروفیسر ہیں۔

پاکستان میں مختلف سطحوں پر مذہبی تعلیم کے موجودہ انتظام کے مثبت اور منفی پہلوؤں اور اس نظام میں بہتری کے امکانات کے حوالے سے متنوع زاویوں سے گفتگو کی جاسکتی ہے۔اس تجزیے کا ایک اہم اور بنیادی پہلو ملک و قوم کی علمی و تعلیمی ضروریات اور مطلوبہ معیار کے تناظر میں موجودہ تعلیمی نظام کی کارکردگی کا جائزہ لینا ہے، تاہم اس پہلو کو کسی دوسرے موقع کے لیے موخر کرتے ہوئے اس نشست میں ہم انتہا پسندی اور دہشت گردی کی موجودہ لہر کے تناظر میں، جس نے قوم کو درپیش ایک گہرے اور سنجیدہ بحران کو فکر و دانش کی سطح پر نمایاں کر دیا ہے، مذہبی تعلیم کے کردار کے حوالے سے چند گزارشات پیش کرنا چاہیں گے۔

ہمارے ہاں مذہبی تعلیم کا اہتمام عصری تعلیم کے سرکاری وغیر سرکاری اداروں میں بھی کیا جارہا ہے اور دینی مدارس کے ایک مستقل اور خود مختار تعلیمی نظام کی صورت میں بھی۔اس ضمن میں بنیادی اور موثر کردار بدیہی طور پر مدارس ادا کر رہے ہیں۔ جہاں تک ریاستی تعلیمی نظام اور اداروں کا تعلق ہے تو قومی پالیسی میں اگرچہ ایک تسلسل کے ساتھ اسلام اور اسلامی تعلیمات کو تعلیمی پالیسی کا مرکزی اور محوری نکتہ بتایا گیا ہے اور اس مقصد کے لیے ناظرہ قرآن، ترجمہ قرآن اور اسلامیات کو مختلف سطحوں

پر نصاب کے لازمی اجزا بھی قرار دیا گیا ہے، لیکن یہ طرز تعلیم بحیثیت مجموعی مذہب، ریاست، معاشرہ اور تہذیب کے باہمی تعلق کے ضمن میں نہایت بنیادی اور اہم سوالات کا کوئی واضح اور متعین جواب نہیں دیتا، جبکہ فکر و شعور کی سطح پر ان سوالات کو موضوع بحث بنائے بغیر افراد اور معاشرے کو اسلامی رنگ میں ڈھالنے کا سوال عملی طور پر معلق رہ جاتا ہے۔ چنانچہ عصری نظام کے دائرے میں عملاً جو کچھ ہو رہا ہے، وہ یہ ہے کہ ناظرہ قرآن اور اسلامیات کی تعلیم کی صورت میں اسلام کے ساتھ وابستگی کا جذبہ طلبہ میں پیدا کر کے اسے شعوری فکر اور عملی رویوں میں ڈھالنے کا کام معاشرے میں موجود اور سرگرم مختلف مذہبی عناصر کے سپرد کر دیا جاتا ہے۔ اس طرح عصری تعلیمی نظام بذات خود کوئی واضح تصور دینے کے بجائے محض ان مختلف، متنوع اور متضاد فکری رجحانات کے لیے خام مواد فراہم کرنے کی خدمت انجام دے رہا ہے۔

دوسری طرف دینی مدارس جس تعلیمی نظام کے تحت کام کر رہے ہیں، اس کے ذریعے سے قرآن وسنت اور ان سے متعلقہ دینی علوم کی تعلیم کا کام اگرچہ ایک حد تک انجام پا رہا ہے، لیکن انگریزی زبان اور عصری علوم سے لاتعلقی، غلط تعلیمی ترجیحات اور قدامت پسند مذہبی سوچ سے بے لچک وابستگی کی بنا پر ان کا دائرۂ اثر نہایت محدود ہے اور یہاں سے فارغ التحصیل ہونے والے طلبہ عصر حاضر کے علمی و عملی تقاضوں سے بالکل بے خبر اپنی ہی دنیا میں مگن اور اپنے محدود دائرۂ ترجیحات میں اپنی توانائیاں صرف کر رہے ہیں۔

دینی مدارس میں تعلیم کے نظام کے ساتھ جو بڑے بڑے مسائل وابستہ ہیں، اختصار کے ساتھ انھیں چند نکات کی صورت میں گنوایا جا سکتا ہے۔ مثلاً:

ا۔ مذہب جن روحانی و اخلاقی اقدار کی تعلیم دیتا ہے، موجودہ مذہبی نظام تعلیم عمومی طور پر ان سے بالکل برعکس قدروں کے فروغ کا ذریعہ بن رہا ہے جن میں سب سے نمایاں چیز مذہبی فرقہ واریت ہے۔ مزید برآں تربیت کا سارا زور دین کے مظاہر پر صرف کیا جاتا ہے، جبکہ روحانی بالیدگی اور اخلاق و کردار کی بلندی پیدا کرنے پر خاطر خواہ توجہ نہیں دی جاتی۔

۲۔ مذہبی تعلیم ایک ایسے ماحول میں فراہم کی جاتی ہے جو اپنے فیض یافتگان کو معاشرے کے زندہ مسائل کے ساتھ حرکی طور پر متعلق کرنے کے بجائے ان کے اور معاشرے کے مابین اجنبیت کی ایک خلیج حائل کر دیتا ہے اور طلبہ جب عملی کردار ادا کرنے کے لیے معاشرے سے متعلق ہوتے ہیں تو ان کے فکر اور حکمت عملی میں اصلاح کے ہمدردانہ اور داعیانہ جذبے کے بجائے شکوہ شکایت اور تنافر کا عنصر بالعموم زیادہ غالب ہوتا ہے۔

۳۔ مذہبی تعلیم کے نتیجے میں مطالعہ اور علم و تحقیق کا معیار مجموعی طور پر ناقابل رشک ہے اور اس سے بھی زیادہ قابل توجہ بات یہ ہے کہ اس ماحول میں مطالعہ اور تحقیق کے موضوعات کا دائرہ نہایت محدود ہے اور امت مسلمہ کی وسیع تر کلاسیکی علمی روایت اور دور جدید کے علمی و فکری مباحث سے ایک عمومی آگاہی بھی اس نظام تعلیم کے اہداف میں شامل نہیں۔

۴۔ مذہبی تعلیم کے موجودہ نظام نے ریاستی نظام اور بین الاقوامی قانون کے ضمن میں دور جدید کی جوہری تبدیلیوں سے متعلق اجتہادی زاویہ نگاہ کو اپنے اہداف کا حصہ نہیں بنایا، چنانچہ اس حوالے سے کلاسیکی دور کے فقہی ذخیرے کو غیر تنقیدی انداز میں پڑھانا ان فکری و نظری ابہامات کی جڑ کی حیثیت رکھتا ہے جن سے اس وقت ریاست کے خلاف مسلح جدوجہد کا شرعی و نظریاتی جواز اخذ کیا جا رہا ہے۔

یہ آخری نکتہ ذرا توضیح کا طالب ہے۔ یہ بات درست ہے کہ دینی مدارس دہشت گردی کی تربیت نہیں دیتے اور نہ اس کے لیے فضا ہموار کرتے ہیں، لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ مدارس کا نظام تعلیم ایک خاص ماحول میں طلبہ کی ذہنی تربیت کر کے ان کے اور معاشرے کے دوسرے طبقات کے مابین اجنبیت کی دیوار کھڑی کر دیتا ہے، جدید معاشرت اور تمدن کے عملی تقاضوں سے روشناس کرانے کے بجائے قدیم فقہی سانچے کو ان کے سامنے معیار اور آئیڈیل کے طور پر پیش کرتا ہے اور حالات کے معروضی تناظر میں نفاذ اسلام کی حکمت عملی اور اس کے تقاضوں کا شعور دینے کے بجائے محض ایک جذباتی نعرہ ان کے ہاتھ میں تھما کر انھیں میدان عمل میں اتار دیتا ہے۔ یہ اسی ذہنی رجحان کا نتیجہ ہے کہ 80ء کی دہائی میں افغان جنگ کے دور میں حالات وواقعات کی عملی پیچیدگیوں اور اس کشمکش میں عالمی ومقامی سیاست کے اہداف اور ترجیحات سے کلی طور پر اغماض برتتے ہوئے مذہبی عناصر میں

یہ خام امید پروان چڑھاتے ہوئے اس جنگ میں شریک ہونے کی حوصلہ افزائی کی گئی کہ اس سے ''جہاد'' کا عمل زندہ ہو رہا ہے جو امت کی عظمت رفتہ کی بازیابی پر منتج ہوگا۔ گویا دینی مدارس ریاستی نظام کے خلاف انتہا پسندی کی براہ راست سوچ پیدا نہ کرنے کے باوجود اپنے فراہم کردہ ذہنی ماحول اور اپنے تحفظات، رجحانات اور پالیسیوں کے ذریعے سے لاشعوری طور پر وہ تمام فکری اور نفسیاتی لوازمات فراہم کر رہے تھے جس کے بعد اسے شدت پسندی اور دہشت گردی کا روپ دینے کے لیے بس کسی خارجی محرک، کسی استعمال کرنے والے ہاتھ اور ایک جرات رندانہ کی ضرورت تھی اور جب نسخے کے یہ سارے اجزا مکمل ہو گئے تو اس آئیڈیالوجی سے متاثر ذہنوں کا جہادی ''کشتہ'' تیار کرنے کی طرف متوجہ ہونا ایک ناگزیر نتیجہ تھا۔

اس ساری صورت حال کا گہرائی کے ساتھ تجزیہ کیجیے تو خرابی کی جڑ ایک ہی نکلے گی، یعنی ریاست کا مذہبی تعلیم اور فکری تربیت کا کوئی ایسا نظام وجود میں لانے کی ذمہ داری سے پہلو تہی برتنا جو قومی اور ملی ضروریات اور جدید سیاسی وسماجی ڈھانچے کے مطالبات و مقتضیات سے ہم آہنگ ہو۔ ریاستی نظام کی طرف سے معاشرے کو ایک متوازن مذہبی تعلیم فراہم کرنے کی ذمہ داری سے دست کش ہو جانے کے نتیجے میں مدارس کی صورت میں دینی تعلیم کے جداگانہ اور مرکزی تعلیمی دھارے سے الگ نظام کو ایک عملی ضرورت کے طور پر ہمارے ہاں بالفعل قبول کر لیا گیا ہے جبکہ قومی سطح پر اس کے نقصانات اور مضمرات کا شاید اب بھی حقیقی معنوں میں اندازہ نہیں کیا جا رہا۔ اصولی طور پر ایک جامع قومی نظام تعلیم وضع کرنے کی ضرورت کا احساس خود دینی مدارس کے بعض نمایاں بزرگ دلا چکے ہیں، لیکن ایک مستقل سماجی طبقے کے طور پر مدارس اپنا تحفظ اسی میں محسوس کرتے ہیں کہ دینی اور دنیاوی تعلیم کی دوئی قائم رہے۔ مختلف حکومتیں بھی مضبوط قوت ارادی، ذہنی یکسوئی اور فکری وضوح کے فقدان کی وجہ سے اسی میں عافیت محسوس کرتی چلی آ رہی ہیں کہ یہ ذمہ داری اور بوجھ اپنے سر نہ لیا جائے۔ تاہم امر واقعہ یہ ہے کہ مذہبی انتہا پسندی اور 'طالبانائزیشن' کی صورت میں پوری قوم کو جس چیلنج کا سامنا ہے، اس کے پیش نظر اس طرز فکر پر نظر ثانی کی ضرورت جتنی اس وقت ہے، شاید پہلے کبھی نہیں تھی۔

مذہبی تعلیم کے نظام کی بہتری اور اصلاح کے ضمن میں ریاست کے کردار کے حوالے سے لبرل حلقوں کا ذہنی رجحان بھی غیر حقیقت پسندانہ اور اس ضمن کی رکاوٹوں میں سے ایک اہم رکاوٹ ہے۔ لبرل حلقوں کا عمومی زاویہ نگاہ یہ دکھائی دیتا ہے کہ قومی نظام تعلیم میں مذہب کے عنصر کو کم سے کم جگہ دی جانی چاہیے تاکہ مذہبی سوچ کو تعلیم کے راستے سے نئی نسل کے ذہن اور فکر ورجحان پر زیادہ اثر انداز ہونے کا موقع نہ ملے۔ تاہم اب تک کا تجربہ یہ بتاتا ہے کہ یہ طرز فکر غیر مطلوب نتائج پیدا کرنے کا ذریعہ بنا ہے۔ اگر قوم کی علمی، تعلیمی اور روحانی ضروریات سے متعلق ایک بے حد اہم شعبہ بالکل صحیح خطوط پر استوار کرنے کے بعد کسی ایک مخصوص طبقے کے سپرد کر دیا جائے اور معاشرہ اور ریاست اس سے اپنے آپ کو بالکل لاتعلق کر لیں تو اس سے احتساب اور جواب دہی کا احساس ختم ہونا شروع ہو جاتا ہے اور کچھ عرصے کے بعد جب وہ طبقہ اپنی سیاسی طاقت بھی پیدا کر لے تو پھر اس کی اصلاح کے لیے کوئی موثر کردار ادا کرنا ریاست اور معاشرے کے لیے بے حد مشکل ہو جاتا ہے۔ ہمارے ہاں دینی تعلیم کے نظام کے باب میں یہی ہوا ہے جو اس لحاظ سے زیادہ بگاڑ کا موجب بنا ہے کہ دینی تعلیم کا نظام سرے سے درست خطوط پر استوار ہی نہیں تھا اور نوآبادیاتی دور سے چلا آنے والا نظام نہایت بنیادی پہلوؤں سے اصلاح بلکہ تشکیل نو کا محتاج تھا۔ بدقسمتی سے اس اصلاح کے لیے مذہبی تعلیم کے نظام میں داخلی طور پر کوئی خاص داعیہ موجود نہیں تھا۔ اس پر جب ریاست اور معاشرے نے بھی اس ضمن میں کوئی مثبت کردار ادا کرنے سے دست کشی اختیار کر لی تو ان خرابیوں نے اپنی جڑیں مزید مضبوط کر لیں اور اب پینسٹھ سال کے بعد کیفیت یہ ہے کہ مذہبی تعلیم کے نظام کی اصلاح کا عزم تو دور کی بات ہے، ریاست اور معاشرہ ابھی تک اس کا کوئی واضح نقشہ بھی ذہن میں نہیں رکھتے۔

آج سب سے زیادہ ضرورت اس بات کی ہے کہ سیاسی، مذہبی، فکری، معاشرتی اور تہذیبی الجھنوں کے تناظر میں مذہبی تعلیم کے بنیادی رخ کا از سر نو تعین کیا جائے اور ایک بالکل نئے تعلیمی نظام کی داغ بیل ڈالی جائے۔ ظاہر ہے کہ اس کے لیے سیاسی و مذہبی قیادت اور اہل دانش میں جس فکری یکسوئی اور ہمت و حوصلے کی ضرورت ہے، وہ اس وقت مفقود ہے اور قومی سطح پر سخت نظریاتی اور سیاسی

تضادات کی وجہ سے مستقبل قریب میں بھی ایسے کسی جاندار اور موثر نظام تعلیم کا وضع کیا جانا ممکن دکھائی نہیں دیتا، لیکن پالیسی سازوں پر یہ بات بہر حال واضح رہنی چاہیے کہ قوم اور معاشرے کے نظریاتی تشخص اور اس کے وجود وبقا کا تحفظ اس کے بغیر ممکن نہیں۔ اس لیے کم سے کم یہ اہتمام تو ضرور کیا جانا چاہیے کہ نظری سطح پر نظام تعلیم کے خلا اور مطلوبہ اصلاحات کو زیر بحث لاتے وقت حقیقی مسائل کی نشان دہی کی جاتی رہے تاکہ اصل مسئلہ نظروں کے سامنے رہے اور قومی دانش اس پر توجہ مرکوز کر کے ایک تدریج کے ساتھ اسے حل کرنے کی پوزیشن میں آسکے۔

ہماری نظر میں اس سارے قضیے میں ریاست اور سول سوسائٹی میں سب سے بنیادی چیز جو پیدا کرنے کی ضرورت ہے، وہ فکری وضوح، احساس ذمہ داری اور اصلاح کا مخلصانہ عزم ہے۔ چنانچہ معاشرے کی تشکیل میں مذہب اور مذہبی تعلیم کی اہمیت کو پوری طرح تسلیم کرنے کے بعد پوری نیک نیتی، خلوص اور کھلے ذہن کے ساتھ ایک تدریج کے ساتھ حسب ذیل اقدامات کرنے کی ضرورت ہے:

۱۔ مذہبی تعلیم کی ضروریات، معیارات اور اہداف کا ایک واضح نقشہ تیار کیا جائے جو ان روحانی، علمی وفکری اور معاشرتی ضروریات کی تکمیل کا ضامن ہو جو مذہب اور مذہبی تعلیم سے وابستہ ہیں۔

۲۔ ریاست اور سول سوسائٹی اس نقشے کے مطابق مذہبی تعلیم کے انتظام کو اپنی توجہ کا مرکز بنائیں۔ اس کے لیے سرکاری نظام تعلیم سے جو کام لیا جا سکتا ہے، اس کا بھی گہرائی سے جائزہ لے کر اقدامات تجویز کیے جائیں اور سول سوسائٹی جو کردار ادا کر سکتی ہے، اس پر بھی گہرا غور وخوض کیا جائے۔

۳۔ حکومت اور سول سوسائٹی کی طرف سے مذہبی تعلیم کے موجودہ نظام کے کارپردازان کو ایک مثبت اور تعمیری مکالمے میں شریک کیا جائے اور انھیں اپنے نظام میں مطلوب اصلاحات کرنے پر آمادہ کیا جائے۔

مذہبی تعلیم کے موجودہ نظام کی اصلاح میں ریاست اور سول سوسائٹی اگر کوئی کردار ادا کرنا چاہتی ہے

تو اس حقیقت کو بنیادی نکتے کے طور پر تسلیم کرنا ہوگا کہ پاکستانی قوم اپنی روحانی و اخلاقی اقدار، خاندانی و معاشرتی زندگی کے اصول و ضوابط اور اپنی اجتماعی زندگی کی تشکیل میں مذہب یعنی اسلام کو راہ نمائی کا بنیادی سرچشمہ اور ماخذ تصور کرتی ہے اور اسلام کی تعلیمات سے ہٹ کر کوئی دوسری چیز یہاں حیات اجتماعی کی تشکیل میں بنیادی حوالہ نہیں بن سکتی۔ اس لحاظ سے مذہبی تعلیم کے مسئلے کو کسی ایک مخصوص طبقے کا نہیں، بلکہ ریاست اور معاشرے کی تعمیر و تشکیل سے دلچسپی رکھنے والے تمام سنجیدہ و فہمیدہ طبقات کے غور و فکر کا موضوع ہونا چاہیے اور تمام طبقات کو ایک مثبت اور تعمیری جذبے کے ساتھ مذہبی تعلیم کے نظام کو بہتر سے بہتر بنانے کے لیے اپنا کردار ادا کرنا چاہیے۔ یہ بنیادی ذہنی رویہ پیدا ہونے سے ہی وہ سنجیدگی، بصیرت اور عزم و حوصلہ پیدا ہوگا جو اس مقصد کے لیے درکار ہے۔ بصورت دیگر یہ معاملہ ایک طرف مذہبی طبقات اور دوسری طرف مذہبی نظام تعلیم کی اصلاح کی خواہش رکھنے والوں کے مابین ایک بے حاصل کشمکش کا عنوان بنا رہے گا جس میں واضح سوچ، خلوص اور عزم و حوصلہ مفقود ہونے کی وجہ سے ریاست اور سول سوسائٹی دن بدن اپنے مطالبات کا جواز کھوتے چلے جائیں گے اور مذہبی طبقات رفتہ رفتہ سماجی اور اخلاقی دباؤ سے آزاد ہوتے چلے جائیں گے۔

پاکستان میں دینی مدارس کے مسائل اور قابلِ اصلاح پہلو

سلیم منصور

عالم اِسلام میں پاکستان مدارسِ دینیہ کے حوالے سے اپنی الگ پہچان رکھتا ہے کیونکہ یہ مدارس دین کے فروغ اور احیاء کے لیے گراں قدر خدمات سر انجام دے رہے ہیں۔ان کے اس نمایاں کردار کے باوصف یہ بھی ناگزیر ہوجاتا ہے کہ وقت کے اعتبار سے جو تبدیلیاں اہم ہیں ان پر سوچ بچار کی جائے۔ مدارس کا مسئلہ صرف نصاب کا ہی نہیں ہے، بلکہ انتظامی،منہج تدریس،تحقیق اور تنقیدی شعور کے حوالے سے بھی کئی چیزیں قابل توجہ ہیں۔ اس مضمون میں اختصار کے تمام جزوی امور کا احاطہ کیا گیا ہے۔مضمون نگار ماہر تعلیم، مصنف اور کالم نگار ہیں۔

انتظامی حوالے سے مسائل اور مشکلات

ایسی انتظامیہ کسی بھی اعتبار سے کامیاب اور مؤثر انتظامیہ قرار نہیں دی جاسکتی جس کی بنیاد طلبہ پر محض دباؤ اور سختی پر ہو۔ مدارس کا انتظام وانصرام اور نظم وضبط ہی وہ بنیادی پہلو ہیں جو ان اداروں کی تعلیمی تدریسی اور سماجی فضا کو مستحکم اور بار آور بنا سکتے ہیں۔رسول اکرم ﷺ کی نرم خوئی، شگفتہ روئی، بچوں سے شفقت، احترام انسانیت حتیٰ کہ جانوروں تک سے صلہ رحمی کا رویہ ہیں یہ سبق دیتا ہے کہ عام انسان بہر حال نرمی کے حق دار ہیں، لیکن جو بچے دین حق کی خدمت اور اس کا فہم حاصل کرنے آئے ہیں وہ تو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے مہمان ہیں اور ان کے ساتھ عمومی رویوں میں مزید احتیاط اور توازن کی ضرورت ہے۔دینی مدارس میں انتظامی مسائل کے اہم پہلو درج ذیل ہیں۔

تدریسی عملے کے مسائل

دینی مدارس میں سب سے مرکزی عنصر اساتذہ کرام ہوتے ہیں جو اکثر اپنے آبائی علاقے سے دور، نہایت کم مشاہرے پر، سخت محنت اور بڑی باقاعدگی کے ساتھ طالب علموں کے سامنے دینی علوم کے رموز کھولتے ہیں۔ لیکن یہی تدریسی عملہ کچھ تو وسائل کی کمی کے باعث اور کچھ انتظامیہ کی پسند وناپسند

کے سبب، سخت معاشی افسردگی اور ذہنی دباؤ کا شکر رہتا ہے۔ان کے ماہانہ مشاہروں میں سالانہ ترقی یا اچھی کا کردگی پر کسی لگے بندھے اصول کے تحت رقم کے اضافے کا کوئی ضابطہ نہیں پایا جاتا۔ یہ چیزیں ان اساتذہ کرام کی بلند نگاہی کو مجروح کرتی اور عزم میں ضعف لاتی ہیں۔اس لئے مختلف وفاقوں کو اپنے اساتذہ کرام کے تعلقات کے حوالے سے ترقیاتی فارمولے کا تعین کرنا چاہیے۔

طلبہ کو گروہ بندی سے بچانا

وسائل کی کمی کی وجہ سے بہت سے مدارس، انتظامیہ اور اساتذہ کی ایک طرح کی چپقلش اور بعض اوقات گروہ بندی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ایسا ماحول مدارس کی مقدس اور علمی فضا کو زک پہنچانے میں خطرناک ثابت ہوتا ہے۔ مدارس میں طلبہ اپنے محبوب اور محترم اساتذہ کے زیادہ زیر اثر ہوتے ہیں۔ یوں افراط و تفریط کی فضا پیدا ہو جانے کا بہر حال امکان موجود رہتا ہے،اسی طرح انتظامیہ اور اساتذہ میں کچھ لوگ طلبہ کو حلیف یا حریف بنانے کا کام شروع کر دیتے ہیں۔ مدارس میں طلبہ کا اقامتی طالب علم ہونااور اس صورتحال کے پیدا ہونے کے امکانات کو بڑھا دیتا ہے۔

باہمی تعاون کی فضا کا قیام

بعض مدارس میں انتظامیہ اور مدرسین،اور طلبہ اور بعض جگہوں پر انتظامیہ ، مدرسین اور طلبہ تینوں کے باہمی تعلقات اس طرح استوار نہیں کہ تعلیم و تربیت کے مقاصد کو حاصل کرنا آسان ہو۔ مشکلات کی یہ وجہ بالکل ہی داخلی نوعیت کی ہے۔ اگر انتظامیہ ، مدرسین اور طلبہ تین ستونوں کی طرح مدارس کی بنیاد اور نشو و نما میں کردار ادا کریں تو مدارس کی صورتحال کی ہر لحاظ سے بہتری کی منزل دور نہیں۔

جمہوری روایات کی پاسداری

عام طور پر ایک دینی مدرسہ مشترکہ تعاون کی ایک تنظیم یا اجتماعی کاوش کا ایک مظہر ہوتا ہے جس میں کئی لوگ اعانت کرتے ہیں اور متعدد لوگ انتظام و انصرام کے علاوہ تدریسی فرائض سرانجام دیتے

ہیں۔ مدرسے کی دینی، تدریسی اور انتظامی فضا کو بہتر اسلوب پر نشو نما دینے کے لیے شورائی فضا کو بحال کرنے کی اشد ضرورت ہے۔ اس لئے ضروری ہے کہ متعلقہ امور میں ان سب لوگوں کو مشاورت میں رکھا جائے تاکہ مدارس پر ایک طرح کی آمریت زدہ معاشرے کی چھاپ نہ لگنے پائے۔

قدیم طلبہ کا مدارس سے عدم تعلق

جس طالب علم نے کسی مدرسے سے تعلیم حاصل کی ہوتی ہے، ان دیواروں، جائے نمازوں، الماریوں، اساتذہ کرام الغرض مدرسے کے کونے کونے سے انہیں ایک عقیدت اور وابستگی ہوتی ہے۔ عملی زندگی میں قدم رکھنے والے ان قدیم طلبہ کی انجمنیں مدرسے کی مالی، انتظامی اور سماجی مدد کے لئے معاونت میں ایک مددگار عامل بن سکتی ہیں اس لئے مناسب ہے کہ مدرسے کی انتظامی اور مالی حالت کو بہتر بنانے کے لئے متعلقہ مدارس کے قدیم طلبہ کی انجمن سازی کو رواج دیا جائے۔

تعلیمی مسائل و مشکلات

دینی مدارس کے مسائل میں تعلیمی مسائل کو اولین اہمیت حاصل ہے جن میں سے اہم درج ذیل ہیں:

کیریئر پلاننگ کی ضرورت

دینی مدارس میں فرد کی آئندہ زندگی کے بارے میں اکثر اوقات واضح تصور کی کمی ایک سنگین مسئلے کے طور پر سامنے آتی ہے۔ پہلے تو طالب علم اپنے اساتذہ کے اشارات اور احکامات کی روشنی میں طے کرتا تھا کہ اسے کہاں اور کس شکل میں خدمات سرانجام دینی ہیں لیکن اب پیشہ تدریس کے محدود امکانات اور مدارس کی گروہ در گروہ تقسیم نے ان امکانات کو بڑی حد تک کم کر دیا ہے۔ اس لئے جو طالب علم قدرے پختگی کی دہلیز پر قدم رکھتا ہے تو اسے روزگار کی فکر دامن گیر ہوتی ہے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ طالب علم کے آخری سالوں میں طلبہ کا رجحان دیکھ کر اس کے روزگار کے لئے اسے رہنمائی فراہم کی جائے، چاہے وہ باقاعدہ کسی منظم ادارے کے تحت ہو یا انفرادی طور پر ہو۔

نصاب تعلیم کا مسئلہ

لازمی طور پر نصاب ایسا ہونا چاہیے جس کا فارغ التحصیل طالب علم، دین اسلام کی تبلیغ کے جذبے سے سرشار اور حکمت تبلیغ کے رموز سے آشنا ہو، اسلامی علوم پر گہری بصیرت سے واقفیت ہو اور معاصر جملہ افکار سے اس حد تک واقف اور شناسا ہو کہ دین اسلام پر گفتگو کرتے وقت مخاطب کے ذہنی پس منظر کی رعایت سے ایمان، اعتماد اور دلیل سے بات کر سکتا ہو۔ درس نظامی بھی کسی نہ کسی شکل میں تبدیلی کے مرحلے سے گزرتا آیا ہے اب بھی درپیش چیلنجز سے نمٹنے کے لئے دور رس اور انقلابی تبدیلیوں کی ضرورت ہے۔

کتب کی بجائے فن پر توجہ

مدارس میں فن کی کتابوں پر اس طرح توجہ دی جاتی ہے کہ استاد کی تمام تر توجہ کتاب کے کچھ صفحات حل کرنی کی طرف ہوتی ہے۔ ادب، عربی، حدیث، فقہ اور کلام کو کتابوں کے متن کے ذریعے پڑھایا جاتا ہے، جبکہ قرآن کریم اس حق سے محروم رہتا ہے۔ ضرورت اس بات کی بھی ہے کہ طالب علم میں متعین کتاب کے پڑھنے کے ساتھ ساتھ اس فن کا ذوق بھی پیدا ہو، وہ مختلف کتابوں سے متعلقہ مواد کا تقابلی مطالعہ کرنے کے قابل ہو جائے اور آئندہ کے لیے مزید مطالعہ، تحقیق اور جستجو کی راہ آسان ہو جائے۔

طلبہ پر تشدد کا پہلو

دنیا بھر کی درس گاہوں میں رفتہ رفتہ طالب علم پر تشدد اور سزا دینے کا چلن اگر پوری طرح ختم نہیں ہوا تو اس میں بہت حد تک کمی ضرور آچکی ہے۔ اگر اکا دکا واقعات نظر آتے ہیں تو اس کے نتیجے میں بھی طالب علم کی نفرت کا ہدف استاد کے ساتھ خود تعلیم بھی بنتی ہے۔ ہمارے حفظ قرآن کے مدارس میں تشدد کا سہارا اب بھی لیا جاتا ہے۔ ان سزاؤں اور اس طریقہ کار کا اسلامی اخلاقیات کو مسلمہ اصولوں سے کوئی تعلق اور واسطہ نہیں ہوتا۔ دینی مدارس میں نظم وضبط کی آڑ میں اتنی سختی اور کھر درے پن کو رواج دیا گیا ہے جس سے خود طلبہ میں سختی اور اکھڑ پن جنم لیتا ہے اور ان کا مزاج خشک ہو جاتا ہے۔

خاص وضع کا التزام

مدرس میں طلبہ کی ظاہری وضع قطع کی ایک خاص نوع پر اصرار کیا جاتا ہے جس کی وجہ سے طلبہ خود کو معاشرے سے کٹا ہوا محسوس کرنے لگتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ طلبہ میں خود اعتمادی کا فقدان دیکھنے میں آتا ہے۔ لہذا، طلبہ کو لباس وغیرہ اور ظاہری وضع میں ایک مخصوص طرح کے طرز کا پابند کرنا ٹھیک نہیں ہے۔

اختصاص کی ضرورت اور مسائل

مدارس کے تعلیمی مسائل میں ایک بڑا مسئلہ طلبہ کے اختصاص(Specialization) کا ہے۔ یہ شعبہ اکثر مدارس میں موجود نہیں اور اگر ہے تو عدم توجہ کا شکار ہے۔ بڑے مدارس اگر مرکزی موضوعات (قرآن، حدیث، سیرت، فقہ، تقابل ادیان) میں سے ایک یا دو موضوعات کے مراکز اختصاص قائم کرلیں اور طلبہ کی رہنمائی کے لیے قدیم و جدید علوم کے ماہر، اہل اور لائق اساتذہ کی رہنمائی حاصل کریں تو امکانات کی ایک نئی دنیا پیدا ہو سکتی ہے۔ یوں اگر طالب علموں کو ان کے ذوق اور پسند کے مطابق تحقیق و مطالعہ کے مواقع فراہم کریں تو اس سے ٹھوس بنیادوں پر افرادی قوت کی تنظیم اور تیاری ممکن ہے۔

سطحیت سے گریز

مدرسے میں تعلیم و تعلم کی صحت مند فضا کو پراوان چڑھانے کے لیے ضروری ہے کہ مدرسے میں ٹھوس علمی ماحول کا چلن ہو۔ محض سرسری اخذ و اکتساب کے ذریعے روایتی مضمون نویسی یا خام صحافت کاری کے شوق کے پروان چڑھانے کی حوصلہ افزائی نہ کی جائے بلکہ اس کی جگہ ٹھوس علمی مواد پیش کرنے اور علمی ذوق پیدا کرنے کی کوشش کی جائے کیونکہ سطحی، سرسری اور عقبی دروازے کی صحافت کا فائدہ کم اور نقصان زیادہ ہے تاہم دور جدید کی واقفیت اور ابلاغ عامہ کے فکری اور عملی مظاہر پر خصوصی لیکچروں کا اہتمام ضروری ہے۔

تربیتی مسائل و مشکلات

دین میں تعلیم کا تصور محض معلومات کی منتقلی تک محدود نہیں، بلکہ یہ تصور تعلیم و تربیت سے موسوم ہے۔ یہ سمجھ لینا کم فہمی کی بات ہے کہ دینی مدارس چونکہ ہر وقت قال اللہ اور قال الرسول ﷺ کا ورد جاری رہتا ہے اور طلبہ ظاہر شریعت پر عمل کرتے دکھائی دیتے ہیں اس لیے انہیں کسی خاص تربیت کی ضرورت نہیں۔ ذیل میں دینی مدارس میں تربیت کے چند پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

نظافت و نظم

چیزوں کے رکھنے اور استعمال کرنے کے طریقے کے ساتھ ساتھ خصوصی نظم اور نظافت کا ذوق پیدا کرنا بھی اساتذہ اور مدرسے کے اجتماعی ماحول کا حصہ ہونا چاہیے۔ اس ضرورت کی تکمیل کے لیے محض وسائل نہیں بلکہ ایک منظم منصوبہ بندی اور توجہ و شوق کی ضرورت ہے۔

طرز خطابت میں اصلاح کی ضرورت

خاتم الانبیاء نبی کریم ﷺ پورے وقار کے ساتھ، سکینت اور پوری توجہ کے ساتھ، سامعین کی نفسیات اور ذہنی سطح کو ملحوظ رکھ کر بات سمجھایا کرتے اور آپ ﷺ کا انداز گفتگو ایسا تھا جیسے منہ مبارک سے موتی جھڑ رہے ہوں۔ مگر بدقسمتی کی بات ہے کہ عوام، جن میں سے بیشتر شریعت اور مزاج شریعت سے بے خبر ہوتے ہیں، صرف ایسے مقرر کی تقریر سننا پسند کرتے ہیں جو شعلہ بیان ہو، اور الفاظ کا جادو دکھا سکے۔ علماء کی ایک بڑی تعداد اپنے کلام و بیان میں شائستگی، حلم اور خدا ترسی کا بہترین نمونہ پیش کرتی ہے، یہی وجہ ہے کہ اس طرح کے علماء کی مقبولیت کا دائرہ وسعت اختیار نہیں کر پاتا۔ اس مسئلے کے حل کے لیے تمام مکاتب فکر کے علماء کو سوچنا چاہیے، طلبہ کی تربیت کی جانی چاہیے اور واعظین و خطباء کے ساتھ مذاکرہ جاری رکھنا چاہیے تاکہ ان کی تقریر کے نتیجے میں آخرت کی جواب دہی کا احساس پیدا ہو۔

ہم نصابی سر گرمیاں

عموماً دیکھا گیا ہے کہ دینی طلبہ اگر اسکولوں میں پڑھنے والے ہم عمر طلبہ سے ربط رکھنے کی کوشش کرتے ہیں تو اسے ناپسندیدگی سے دیکھا جاتا ہے۔ اسی طرح جدید تعلیمی اداروں میں پڑھنے والے طلبہ اگر دینی مدارس والے طلبہ کے ساتھ میل جول رکھیں تو اکثر والدین پریشان ہو جاتے ہیں کہ کہیں ہمارا بچہ مولوی نہ بن جائے حالانکہ دونوں اعتراف کا یہ رویہ درست نہیں۔ دینی مدارس کے طالب علموں کی متوازن ہم نصابی سر گرمیوں کو نصابی اور درسی مشغولیات سے کم نہیں سمجھنا چاہیے۔ ان ہم نصابی سر گرمیوں میں خطابت، تحریر، ورزش، کھیل کود اور مارشل آرٹس وغیرہ شامل ہیں۔ یہ چیزیں طلبہ میں مسابقت، ہمت، حوصلے اور جرات کی افزائش کے لیے اشد ضروری ہیں۔ اسی طرح بین المدارس مذاکروں اور مباحثوں کا اہتمام بھی طلبہ کی صلاحیتوں کی نشو نما میں معاون ثابت ہو سکتا ہے۔

کتب خانوں سے تعلق

طلبہ کی تعلیمی سر گرمیوں کے محور و مرکز کے طور پر سب سے اہم چیز لائبریری یا کتب خانہ ہے۔ اکثر دینی مدارس کی لائبریاں صرف اساتذہ کرام کی تدریسی ضروریات کو پورا کرتی ہیں اور انہیں اساتذہ کرام ہی استعمال کرتے ہیں۔ ہونا یہ چاہیں کہ ان لائبریریوں کو وسعت دی جائے، ان میں وہ تمام کتب مہیا کی جائیں جنہیں طلبہ اپنے میں گہرائی پیدا کرنے کے لئے پڑھیں اور ان میں ہم عصر زندگی کا فہم وادراک بھی پیدا ہو۔ دینی مدارس کے طلبہ کو اعلی درجے کی علمی اور دینی کتب کے مطالعے کے ساتھ ساتھ عمدہ سفر ناموں، تاریخ، سوانح، تذکرے، شاعری اور ناولز کا مطالعہ بھی کرلینا چاہیے۔ اس سلسلے میں طلبہ کو پبلک لائبریریوں کا رخ دکھانا بھی مفید ثابت ہو سکتا ہے، وہاں ان کے لیے اجرائے کتب کو یقینی بنایا جائے اور انہیں مراجع کی تلاش اور کتب سے استفادے کے طریقے بھی سکھائے جائیں۔

تحقیقی و تصنیفی میدان میں اصلاح

جہاں دینی مدارس تحقیق و تصنیف کے میدان میں بہت عمدہ اور نفع بخش خدمات انجام دے رہے ہیں وہاں گاہے بہ گاہے کچھ ایسی چیزیں بھی دیکھنے میں آرہی ہیں جنہیں تحقیق و تالیف کے میدان میں دینی مدارس کی کارکردگی کے منفی پہلو سے بھی تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ مولانا زاہد الراشدی نے اس موضوع پر تفصیلی بحث کی ہے اور مختلف تجاویز دی ہیں۔ ذیل میں ان کو مختصراً بیان کیا جاتا ہے۔

تحقیق و تصنیف کے میدان میں دینی مدارس کے لیے قابل اصلاح امور:

1. دینی مدارس میں تحقیق و مطالعہ کے حوالے سے مسلکی وابستگی اور شخصی عقیدت اور ترجیحات میں فیصلہ کن اولیت حاصل ہے، زیادہ تر وقت انہی دو ترجیحات میں وقف ہو جاتا ہے اور ترجیحات کے بعد کے مراحل کے لئے اکثر اوقات وقت اور صلاحیت دونوں میں گنجائش کم رہ جاتی ہے۔
2. فقہی اور مسلکی مباحث کے حوالے سے باہمی مناظرہ و مباحثہ میں افہام و تفہیم اور تطبیق و مفاہمت کے بجائے ایک دوسرے پر برتری حاصل کرنے کا ذوق غالب ہوتا ہے اور اس کے لئے طعن و تشنیع اور تحقیر و تمسخر کی زبان استعمال کرنے سے بھی بسا اوقات گریز نہیں کیا جاتا۔
3. تحقیق و مطالعہ کا جدید اسلوب، طریق کار، ذرائع اور بین الاقوامی سطح کی علمی و تحقیقی اداروں کے کام اور طرز سے استفادہ دنی مدارس کی ایک بڑی تعداد کے نزدیک ابھی تک ایک شجر ممنوع کی حیثیت رکھتا ہے اور اس کی وجہ صرف بین الاقوامی زبانوں سے ناواقفیت نہیں بلکہ اس کے ساتھ ساتھ یہ ذہنی اور نفسیاتی کیفیت بھی اس کا باعث ہیں کہ ہمیں دنیا کے تمام حلقوں پر علمی اور فکری برتری حاصل ہے اور ہمیں کسی دوسرے حلقہ کے علمی کام سے واقف ہونے اور اس سے استفادہ کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔
4. دینی مدارس میں عالم اسلام کے عامی حلقوں کی تحقیقات، دوسرے مسالک کے علمی کام اور غیر روایتی علمی مراکز کی تحقیقی مساعی سے استفادے کو اپنی نفسیاتی برتری کے منافی تصور کیا جاتا

ہے اور ان کے ساتھ بعد اور فاصلہ رکھنے کو بھی تحفظاتی حکمت عملی کا ناگزیر حصہ بنالیا گیا ہے۔

5. بڑے مدارس کو دیکھتے ہوئے بھیڑ چال کے معاشرتی مزاج کے باعث اب جگہ جگہ دار الافتاء قائم ہو رہے ہیں اور ان کا دائرہ ضرورت سے زیادہ پھیلتا جا رہا ہے جس سے فتویٰ کی اہمیت اور معیار دونوں متاثر ہو رہے ہیں حالانکہ اس کے لیے ایک مخصوص تعلیمی قابلیت، مبلغ علم اور ذہنی سطح کی ضرورت کو لازمی قرار دیا جانا چاہیے۔

6. اجتماعی اور قومی مسائل میں بھی تحقیق و مطالعہ اور علمی رائے کے اظہار کے لیے مسلکی دائرے میں پابند رہنے کو ضروری سمجھا جاتا ہے اور ایسی روایت ابھی جڑ نہیں پکڑ سکی کہ کسی اہم قومی مسئلہ پر مختلف مکاتب فکر کے ذمہ دار علماء کرام بیٹھیں، مشترکہ طور پر مطالعہ و تحقیق کا اہتمام کریں اور باہمی مشاورت کے ساتھ اجتماعی رائے کا اظہار کریں۔ اس سلسلے میں 3 علماء کرام کے 22 دستوری نکات اور عقیدہ ختم نبوت و ناموس رسالت ﷺ کے ناگزیر تقاضوں پر اتفاق کے سوا غیر سرکاری اور پرائیویٹ سطح پر کوئی اہم کام گزشتہ نصف صدی کے دوران میں ہماری دینی تاریخ کا حصہ نہیں بن سکا۔

7. دینی مدارس میں تحقیق و تالیف کے ذوق اور صلاحیت کی آبیاری کے لیے کوئی اجتماعی ادارہ جاتی نظم موجود نہیں۔ یہ کام زیادہ تر شخصی رجحان اور ذوق کا رکا مرہون منت ہوتا ہے اور اس کی حوصلہ افزائی، سرپرستی اور نگرانی بھی شخصی طور پر ہوتی ہے۔

8. دینی مدارس میں لائبریریوں کا نظام ناگفتہ بہ ہے۔ گنتی کے چند مدارس کے علاوہ اکثر مدارس میں یا تو لائبریریاں ہی موجود نہیں اور اگر موجود ہیں تو ان میں ضرورت کی اہم کتابیں، بالخصوص مختلف موضوعات پر حوالہ کی کتابیں میسر نہیں ہیں۔ کتابوں کے انتخاب میں شخصی اور مسلکی ذوق کا غلبہ ہوتا ہے اور اگر کسی مدرسہ کی لائبریری میں کچھ کتابیں پائی بھی جاتی ہیں تو ضرورت، وقت اور سہولت کے مطابق اساتذہ و طلبہ کی ان تک رسائی نہیں ہوتی۔

9. انسانی سوسائٹی کا معاشرتی ارتقاء، تاریخ، نفسیات، تعلقات عامہ، سیاسیات، معاشیات، تہذیب و ثقافت اور دیگر عمرانی نا صرف دینی مدارس کی تدریس، تحقیق اور مطالعہ سے خارج ہیں بلکہ کہ

ان کی اہمیت و ضرورت کا احساس ابھی تک اجاگر نہیں ہو سکا جبکہ خود دینی مدارس کے قیام کے مقصد اور ان کے اہداف کے حوالے سے یہ علوم انتہائی ضروری ہیں۔

10. زبانوں کا مسئلہ دینی مدارس میں سب سے زیادہ ناگفتہ بہ ہے۔ انگریزی اور دیگر بین الاقوامی زبانوں کی بات تو ایک طرف، عربی زبان بھی صرف کتاب فہمی تک محدود رہتی ہے اور دینی مدارس میں سال بہ سال تک پڑھائی جانے والی اس زبان میں فی البدیہ گفتگو، خطاب اور مضمون نویسی کی صلاحیت سے فضلاء کرام کی غالب اکثریت محروم رہتی ہے اور اس سے بھی زیادہ مظلومیت کا سامنا اردو زبان کو کرنا پڑتا ہے کہ وہ بطور زبان نہیں پڑھائی جاتی، اردو زبان کی اصطلاح، جدید علوم سے آشنائی، محاوروں، ضرب الامثال اور اشعار کے بر محل استعمال کی تربیت اور سلامت و شگفتگی کا ذوق بیدار کرنے کا کوئی نظم واہتمام موجود نہیں ہے۔ بالخصوص مروجہ صحافتی زبان اور اسلوب تو سرے سے دینی مدارس کے ماحول میں اجنبی ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ اچھی خاصی علمی صلاحیت رکھنے والے اساتذہ اور طلبہ بھی سادہ اردو میں مافی الضمیر کے اظہار کے لئے دو تین صفحات کا مختصر مضمون لکھنے سے قاصر رہ جاتے ہیں۔[1]

ڈاکٹر احسن اختر ناز (شعبہ ابلاغیات پنجاب یونیورسٹی) کی رائے میں دینی تعلیمی اداروں اور مدارس کو تحقیقی و تصنیفی میدان میں درج ذیل اصلاحات کی ضرورت ہے۔

1. دینی رسائل و جرائد کے ایڈیٹروں اور اہل قلم حضرات پر مشتمل ایک ایسا ادارہ تشکیل دیا جانا چاہیے جو انہیں وقت اور حالات کی نزاکت اور تقاضوں کو سمجھنے اور صرف قرآن و سنت کے مطابق رہنمائی فراہم کرنے میں مدد دے سکے۔ اس کے ساتھ ساتھ اتحاد ملت اسلامیہ پر عملاً زور دینا بھی ضروری ہے۔ ان کی ایک الگ مجلس بھی بنائی جاسکتی ہے۔
2. دینی رسائل سے مختلف فرقوں کی اجارہ داری ختم اور ان کا دائرہ اثر وسیع ہونا چاہیے۔
3. دینی رسائل کے معیار کو بہتر بنانے کے لئے پرچے کی متعلقہ انتظامیہ کو سفارش کی جائے کہ وہ

[1] - خالد رحمن، اے ڈی میکن، "پاکستان میں دینی تعلیم"، انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی سٹڈیز، اسلام آباد، ص:201-202 ملخصاً

اپنے عملے سے صرف تعلیم یافتہ صحافی اور تربیت یافتہ افراد ہی کو ملازم رکھیں تاکہ وہ ان رسائل کو مرتب کرتے وقت تکنیکی اور فنی پہلوؤں کو مد نظر رکھ سکیں۔ ہر رسالے کے سرپرست کو چاہیے کہ وہ ایم اے ابلاغیات (صحافت) عملہ رکھے یا اپنے افراد کو یہ ڈگری حاصل کرنے کا موقع اور وسائل فراہم کرے۔

4. نیشنل بک فاؤنڈیشن یا صحافتی تنظیموں کو چاہیے کہ وہ ان رسائل و جرائد میں کام کرنے والے عملے کے لیے مختلف تربیتی کورسز کا انعقاد کریں، جنمیں ایڈیٹروں، رپورٹروں اور مترجمین کو مزید تربیت دی جائے تاکہ وہ مجلاتی صحافت کے میدان میں اپنی صلاحیتوں کو بہترین انداز میں استعمال کر سکیں۔
5. دینی رسائل کی طباعت و اشاعت کے معیار کو بھی بہتر بنانے کی ضرورت ہے۔
6. دینی رسائل کے مواد کی ترتیب جدید صحافتی رجحان کے مطابق کی جانی چاہیے۔
7. دینی رسائل کو عوام الناس کے لئے زیادہ فائدہ مند بنانے کے لئے ضروری ہے کہ ان میں جزوی اور فروعی مسائل پر زور دینے کی بجائے مشترک قدروں پر ایک دوسرے سے تعاون کیا جائے اور مختلف پہلوؤں میں مثبت اور عدم جارحیت کا انداز اختیار کیا جائے۔
8. دینی رسائل کے مندرجات اور زبان کو جدید تعلیم یافتہ ذہن اور نوجوان نسل کے لئے پر کشش، آسان اور دلچسپ بنایا جائے۔
9. دینی رسائل میں ہمارے معاشرے کے حقیقی مسائل کا حل اسلامی تعلیمات کی روشنی میں پیش کرنے پر زور دیا جائے تاکہ عام قارئین ان کی ضرورت، اہمیت اور افادیت کو محسوس کر سکیں۔
10. حکومتی سرپرستی کے علاوہ ایڈورٹائزینگ ایجنسیوں کو بھی ان رسائل کو اشتہارات دینے چاہئیں تاکہ ان کی حالت بہتر ہو سکے۔[2]

---

[2] - خالد رحمن، اے ڈی میکن، "پاکستان میں دینی تعلیم"، انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی سٹڈیز، اسلام آباد، ص:218

ذہنی و فکری برتری کا ماحول

دینی مدارس میں اساتذہ و طلبہ میں ذہنی اور فکری برتری کا ایک خاص ماحول ہے جس نے دینی مدارس کے اساتذہ اور طلبہ کے گرد رکاوٹوں کی بہت سی بلند و بالا دیواریں کھڑی کر رکھی ہیں۔ دینی مدارس کو اس ماحول سے نکلنا ہوگا اور حقیقت پسندی سے کام لیتے ہوئے یہ تسلیم کرنا ہوگا کہ ان کے سوا اور لوگ بھی دنیا میں رہتے ہیں اور وہ بھی عقل اور علم تک رسائی کی صلاحیت سے بہرہ ور ہیں۔ ان کی رائے سے تو اختلاف ہو سکتا ہے لیکن سرے سے ان کے وجود سے انکار کر دینے کا حق دینی مدارس کو حاصل نہیں۔ دینی مدارس کو درج ذیل دینی سطح کے علمی کاموں تک رسائی کو اپنے اہداف و مقاصد میں ضرور شامل کرنا چاہیے اور ان کے طریق کار سے ستفادہ کرنا چاہیے:

1. بین الاقوامی سطح پر مسلم اور غیر مسلم تحقیقاتی ادارے جو دینی مدارس کی دلچسپی کے موضوعات پر کام کر رہے ہیں اور ان کی علمی کاوشیں مختلف حوالوں سے سامنے آ رہی ہیں۔
2. پاکستان اور دیگر مسلم ممالک کے علمی ادارے اور تحقیقاتی مراکز جو ان موضوعات پر کام میں مصروف ہیں۔
3. دوسرے مسالک اور مکاتب فکر کی علمی تحقیقات اور مساعی جو جدید پیش آمدہ مسائل پر علمی جدوجہد کر رہے ہیں۔

مشترکہ حکمت عملی کی ضرورت

دینی مدارس کے مختلف وفاقوں کو الگ الگ طور پر اور پھر مشترکہ فورم پر اجتماعی حیثیت سے بھی اس صورتحال کا جائزہ لینا چاہیے اور خود احتسابی کی جذبہ کے ساتھ ان خامیوں کو دور کرنے کے لئے مشترکہ حکمت عملی وضع کرنی چاہیے جن کے باعث آج ہمارے دینی مدارس علوم دینیہ میں گہرا رسوخ رکھنے کے باوجود تحقیقی و تصنیفی میدان میں معاصر اداروں سے بہت پیچھے دکھائی دے رہے ہیں۔

نظام تعلیم وتربیت کی اصلاح

یہ درست ہے کہ یہ دور Specialization یعنی تخصص کا دور ہے۔ ایک مدرسہ بیک وقت علوم دینیہ کے ماہرین اور جدید سائنس کے گریجویٹ پیدا نہیں کر سکتا جیسا کہ جدید یونیورسٹی کے سائنسدان سے ایک اچھا عالم دین ہونے کی توقع نہیں کی جاسکتی لیکن اس میں شک نہیں کہ آج مدرسے اور معاشرے میں رابطے کی کمی کا گھمبیر خلاء پیدا ہو گیا ہے۔ مدرسہ اپنی مخصوص فضا، زبان اور مسائل میں گھرا ہوا ہے اور معاشرہ اس ساری فضا سے لاتعلق ہے۔ لہذا ضرورت اس بات کی ہے کہ دینی مدرسہ اور معاشرہ ایک دوسرے کے قریب ہوں۔ دینی مدارس کے نظام تعلیم و تربیت کو زمانے سے پوری طرح ہم آہنگ کرنے کے لئے مناسب ہے کہ درج ذیل اقدامات کیے جائیں۔

1. مسلک پر زور دینے کی بجائے قرآن حکیم کی تعلیم وتدریس ایک عالمگیر کتاب ہدایات کی حیثیت سے کی جائے اور سنت اور سیرت یعنی آپ ﷺ کی شخصیت کا مطالعہ ایک عالمگیر ہادی کے طریق زندگی کے طور پر کیا جائے۔
2. فقہ اور اصول فقہ کے مضمون کے ساتھ مروج قوانین اور ان کے ارتقاء کا مطالعہ بھی کیا جائے تاکہ مدرسہ امانت دار وکلاء اور جج فراہم کر سکے۔
3. ان سب علوم کی تنظیم و ترتیب (Classification and Codification) اور ان مضامین میں نت نئی معلومات سے آگاہی کے لئے کمپیوٹر کا استعمال بھی دینی مدارس کے طلبہ کے لئے اعتماد کا باعث ہو گا لہذا یہ مضمون بھی داخل نصاب ہونا چاہیے۔
4. انگریزی زبان جو اب انگریز کی زبان نہیں رہی بلکہ عالمگیر زبان بن چکی ہے، لازمی مضمون کی حیثیت سے مدارس میں پڑھائی جائے۔
5. اسلامی معاشیات کو شامل نصاب کر کے جدید اصلاحات میں پڑھا اور سمجھا جائے یہ مقصد اسلامی اور جدید معاشیات کے تقابلی مطالعہ کے ذریعہ حاصل کیا جا سکتا ہے تاکہ مدارس کے گریجویٹ

غیر سودی بینکاری کے فروغ میں اپنا کردار ادا کر سکیں۔[3]

اس کے علاوہ دینی مدارس کے طلبہ کے ذوق، ضروریات اور نفسیات کو سامنے رکھتے ہوئے جس قسم کی اصلاح کی ضرورت ہے،اس کے اہم عنوانات یہ ہو سکتے ہیں:

- ترجمہ قرآن کریم اور تفسیر۔ خاص طور پر انہیں عوام میں درس قرآن کے طرز اور ذوق سے بہرہ ور کرنا۔
- غیر اسلامی ادیان اور فرق باطلہ سے تعارف اور ان میں مسائل میں مکالمہ سکھانے کے ساتھ ساتھ ان مذاہب کی تاریخ، مسلمانوں کے ساتھ ان کے تعلقات کی نوعیت، متنازعہ معاملات اور ان کی موجودہ پوزیشن سے متعارف کرانا بھی ضروری ہے، تاکہ باہمی معاملات کی صحیح پوزیشن سامنے آئے۔
- صرف، نحو، میراث اور دیگر فنون کے مطالعاتی اور تعارفی دورے۔
- موجودہ دور میں اسلامی کی دعوت و تعارف کی ضروریات اور تقاضوں سے آگاہی۔
- عربی بول چال اور تحریر و تقریر کی مشق اور اس کی اہمیت کا احساس دلاتے ہوئے عملی تربیت۔
- موجودہ فکری تحریکات کے فکری اور تاریخی پس منظر اور ان کے نقصانات سے آگاہی۔
- اصول فقہ، اصول تفسیر اور اصول حدیث کے تعارفی کورسز۔
- موجودہ بین الاقوامی ماحول، عالمی قوانین و نظام اور مسلمانوں پر ان کے اثرات سے آگاہی۔
- اسلام اور نبی کریم ﷺ کے بارے میں مغربی مفکرین بالخصوص مستشرقین کے اعتراضات کا جائزہ۔
- شریعت اسلامیہ کے احکام و قوانین پر جدید اعتراضات و اشکالات کا جائزہ۔
- پاکستان میں نفاذ شریعت کی جدوجہد اور اس کے تقاضوں سے آگاہی۔

ان مقاصد کے لئے اصل میں تو درس نظامی سے فراغت کے بعد یا دوران تعلیم ہی ایک منظم ترتیب

[3]- احسان الحق، ڈاکٹر، ''پاکستان میں دینی تعلیم''، انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی سٹڈیز، اسلام آباد، ص:58

کے ساتھ بڑے جامعات کو تفصیلی کورسز کا اہتمام کرنا چاہیے جو ان میں سے کسی ایک موضوع پر ہوں۔ لیکن تعارفی سطح پر سالانہ تعطیلات کے دوران مختصر کورسز بھی فائدہ مند ہو سکتے ہیں۔

طریقہ تعلیم میں اصلاح کی تجاویز

ڈاکٹر حافظ حقانی میاں قادری کے مطابق نصاب کے علاوہ مدارس کا نظام اور طریقہ تعلیم میں بھی اصلاح کی ضرورت ہے اور اس کے بغیر مدارس کی کارکردگی میں بہتری مشکل ہے۔ ذیل میں چند تجاویز دی جارہی ہیں جن سے نظام تعلیم اور طریقہ تعلیم میں بہتری آنے کی امید کی جاسکتی ہے۔

1. مدارس کے نظام میں عام طور سے ہر طالب علم کو ''مجموعہ علوم'' بنانے کی کوشش کی جاتی ہے جس کی وجہ سے وہ کسی ایک خاص فن میں مہارت حاصل نہیں کر پاتا۔ علوم وفنون نے بڑی ترقی اور وسعت حاصل کرلی ہے اس لئے ایک ہی شخص کے لئے جملہ علوم میں مہارت حاصل کرنا ایک دشوار کام ہے۔ لہذا اختصاصی طرز تعلیم کا طریقہ اپنانا چاہیے۔ ایک خاص مرحلے تک مختلف علوم وفنون سے ضروری واقفیت دینے کے بعد اختصاصی تعلیم کے مختلف شعبے اس سلسلے میں معاونت کر سکتے ہیں جن میں طلبہ اپنے ذوق ورجحان کے مطابق داخلہ لیں۔ یوں مختلف علوم میں ماہر حضرات کی پیداوار کی شرح بڑھنے کا امکان ہے۔
2. مدارس میں عام طور پر لڑکیوں کی اعلی تعلیم کی جانب کم توجہ دی جاتی ہے۔ تعلیم نسواں کی اہمیت کسی طرح بھی اہمیت میں کم نہیں ہے۔ خواتین ہمارے معاشرے کا نصف سے زائد حصہ ہیں اور نئی نسل کی پرورش و تربیت کا بھاری بوجھ بھی انہی کے کاندھوں پر ہے۔ اصلاح معاشرہ اور نئی نسل کی درست تربیت کے لئے یہ بات بہت ضروری ہے کہ خواتین کو بھی علم کے زیور سے آراستہ کیا جائے۔ مدارس کو اس سلسلے میں خصوصی توجہ دینے کی ضرورت ہے اور لڑکیوں کی تعلیم کا بندوبست کرنا ازحد ضروری ہے۔
3. مدارس میں طلبہ کی غیر درسی مصروفیات کی طرف بھی کم توجہ دی جاتی ہے اور اس کا کوئی مربوط نظام نہیں ہے اس کی وجہ سے طلبہ کی مختلف صلاحیتیں کھل کر سامنے نہیں آپاتیں۔

مدارس کے نظام میں ان ہم نصابی و غیر نصابی سرگرمیوں کا ایک جامع لائحہ عمل ہونا چاہیے تاکہ طلبہ میں تحریر و تقریر اور انتظام و انصرام کی صلاحیتوں کے علاوہ دیگر بہت سی صلاحیتیں پیدا ہو سکیں۔

4. مدارس کے طریقۂ تدریس کی ایک نمایاں شکل کتابی طریقہ تدریس ہے۔ اسلامی تاریخ کے مطالعہ سے یہ بات دیکھنے میں آتی ہے کہ عصر اول میں یہ طریقہ رائج نہیں تھا بلکہ املاء اور لیکچر کا طریقہ عام تھا۔ لیکچر کے طریقہ تدریس کے مفید اور کار آمد ہونے میں دو آراء نہیں ہیں۔ اس سے ایک طرف جہاں وقت کی بچت ہوتی ہے وہاں طالب علم بھی اپنے ذہن کے بند دروازے کھولنے کی کوشش کرتا ہے۔ لہذا ضرورت اس بات کی ہے کہ کتاب سے ماخوذ علوم کو ایک لیکچر کی صورت میں طلبہ کے سامنے پیش کیا جائے اور انہیں سوال کرنے پر ابھارا جائے۔

5. بہت سے فنون اگر مادری زبان میں سکھائے جائیں تو سیکھنا آسان اور سیکھ بہتر ہوتی ہے۔ اس لئے مناسب ہے کہ طلبہ کو ان کی اپنی اور آسان زبانمیں تعلیم دی جائے۔

6. قرآن، حدیث اور دیگر علوم کی تعلیم میں آزادانہ غور و فکر کی ضرور گنجائش رہنی چاہیے تاکہ طلبہ میں کسی طرح کی عصبت دیکھنے میں نہ آئے اور ان میں اس طرح کے اساسی علوم کی تدریس کے دوران مسائل حاضرہ پر انطباق کرنے کی صلاحیت بھی پیدا ہو سکے۔[4]

---

[4] - قادری، حقانی میاں، ڈاکٹر، ''دینی مدارس، نصاب و نظام تعلیم اور عصری تقاضے''، فضلی سنز پبلشرز، کراچی، ص:303-307

مدارس کے نصاب بارے مفکرین کی آراء

محمد اسرار مدنی

پاکستان کے مدارس میں رائج نصاب تعلیم بنیادی طور پر درس نظامی سے ہی اخذ شدہ ہے۔ یہ نظام وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ردو بدل کے ارتقائی عمل سے بھی گزرتا رہتا ہے۔ چونکہ بنیادی طور پر یہ طرز تعلیم ایک حکمت عملی تھی جو مسلمانان ہندے کے اکابر نے اپنائی تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی انگریزوں کے زمانے میں جب مسلمانوں سے مرکزی قیادت چھین لی گئی تو ان کے پاس اس بات کے سوا چارہ نہ تھا کہ وہ اسلامی علو م و فنون کے تحفظ کے لئے ایک خالص دینی نظام کے قیام پر اپنی توجہ مرکوز کرتے ضروری تھا کہ مسلمانوں کی مذہبی تعلیم کو زمانے اور ریاست کی دست برد سے بچایا جاتا۔لیکن اس کے ساتھ ہی اسے جامد نظام تسلیم نہیں کیا گیا، شروع سے ہی علماء اپنی اپنی آراء دیتے رہے ہیں۔ اس مضمون میں چند اہم آراء جمع کی گئی ہیں۔

استعماری عہد میں اکابر علماء نے دینی نظام اور دینی تعلیمات کو زندہ رکھنے کے لیے اور انفرادی حیثیت میں لوگوں کی مذہبی رہنمائی کے لیے مدارس قائم کیے تھے جو اصل میں استعماری تعلیمی نظام کا متبادل تھا۔ مدارس کے نظام کو باقی رکھنے کے لیے مختلف علمی تحریکیں بھی چلیں۔ متحدہ ہندوستان میں دارالعلوم دیوبند جامعہ ملیہ، علی گڑھ اور ندوۃ کا قیام اسی سوچ کا نتیجہ تھا۔ ڈاکٹر محمود احمد غازی کہتے ہیں:

> ”جن حالات میں ہمارے بزرگوں نے جدوجہد کی، وہ آئیڈیل صورت نہ تھی اور نہ ہی آئیڈیل حالات تھے۔ نہ وسائل دستیاب تھے نہ حکومتی سرپرستی حاصل تھی اور نہ وہاں کے فارغ شدہ حضرات کے لیے قیادت کے مناصب موجود تھے۔ معاشرہ ان کی قیادت کو ماننے اور ان سے رہنمائی کے لئے تیار نہ تھا۔ ان کی رہنمائی مسجد اور مدرسے کے خاص دائرہ تک محدود تھی۔ لیکن اب ضرورت اس بات کی ہے کہ جو دین موجود ہے اس کو موجودہ زندگی سے متعلق کیا جائے۔ اور اس کو معاشرہ میں

فعال کردار ادا کرنے کی پوزیشن میں لایا جائے"۔[1]

مدارس کے نصاب اور مدارس کے نظام میں تبدیلی کی یہ سوچ مثبت بھی ہے اور وقت کی ضرورت بھی۔ 1857ء کی جنگ آزادی کے بعد علماء اور فضلاء جو اس نظام سے کسی نہ کسی طرح وابستہ رہے، مدارس کی جوہری خاصیت کو برقرار رکھتے ہوئے اس میں مناسب تبدیلیوں اور جدت کے قائل رہے ہیں۔ ان میں سے بعض کا ذکر کرتے ہوئے، ان کی آراء کا جائزہ پیش کیا جاتا ہے۔

مولانا ابو الکلام آزاد

مولانا ابو الکلام آزاد نامور سیاسی اور مذہبی رہنما تھے۔ سیاسی بصیرت کے ساتھ ساتھ اعلی پائے کے مصنف اور علمی خانوادے سے تعلق رکھتے تھے۔ مولانا کے نزدیک مدارس کے طلبہ پر ایک ہی وقت میں تین مختلف زبانوں کے سیکھنے کا بوجھ حیرت انگیز ہے۔ ان کا خیال تھا کہ درس نظامی ہماری زندگی کی ضروریات کی ہر گز کفالت نہیں کرتا، ایک مکتوب کا جواب دیتے ہوئے انہوں نے کہا:

"ایک بچہ آٹھ برس کا عربی زبان کو شروع کرتا ہے، آپ میزان اور منشعب سے اسے شروع کرواتے ہیں، فارسی زبان اس کے لیے اجنبی زبان ہے۔ خود اس کی مادری زبان اردو ہے، آپ ایک ہی وقت میں اس پر تین بوجھ ڈالتے ہیں اس کی ساری دماغی قوت تین خانوں میں بٹ رہی ہے۔ حق تو یہ ہے کہ جتنے فنون آلیہ ہیں، ان کی پہلی کتاب مادری زبان میں ہونی چاہیے"۔

نصاب میں تبدیلی کے حوالے سے 194ء میں ان کا موقف یہ تھا کہ:

"لیکن اگر سو برس پہلے ہم نے یہ تبدیلی نہیں کی، تو کم از کم ہم کو یہ تبدیلی پچاس برس پہلے کرنا چاہیے تھی لیکن آج 1947ء میں ہم اپنے مدرسوں میں جن چیزوں کو معقولات کے نام سے پڑھا رہے ہیں، وہ وہی چیزیں ہیں جن سے دنیا کا دماغی کارواں دو سو برس پہلے گزر چکا۔ آج ان کی دنیا میں کوئی جگہ نہیں ہے"۔

---

[1] - بشیر احمد خان سواتی، دینی مدارس اور عصر حاضر، شریعہ اکیڈمی، گوجرانوالہ، 2007ء، ص:147

مولانا شبلی نعمانی

مولانا شبلی نعمانی ہندوستان کے محقق عالم ہیں، تاریخ، سیرت، علم الکلام اور رجدید فکر پر ان کو خصوصی دسترس حاصل تھی۔ ان کے خیال میں درس نظامی برصغیر کا کیمرج ہے، برصغیر میں آج کلکتہ سے پشاور تک جس قدر تعلیمی سلسلے پھیلے ہوئے ہیں، سب اس درس کی شاخیں ہیں۔ کوئی عالم عالم نہیں مانا جا سکتا، جب تک کہ ثابت نہ ہو کہ اس نے اسی طریقہ درس کے مطابق تعلیم حاصل کی ہے، جس طرح کھوٹہ سکہ ٹکسال سے باہر آجاتا ہے اسی طرح کسی کتاب کا درس نظامیہ سے خارج ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ وہ نصاب تعلیم میں داخل ہونے کی قابلیت کا دعوی نہیں کر سکتی۔[2]

مولانا شبلی نعمانی مدارس نظامیہ کے نصاب میں اپنی موافقانہ رائے رکھنے کے باوجود اس بات کے قائل تھے کہ اس میں ترامیم واضافہ جات کیے جائیں۔ ان کا خیال تھا کہ "ہمارے نزدیک ضروریات زمانہ کے باعث ہر لحاظ سے درس نظامی میں بہت کچھ ترامیم واضافہ کی ضرورت ہے"۔[3]

مولانا محمود حسن (مذہبی رہنما، صدر المدارسین دار العلوم دیوبند)

شیخ الہند مولانا محمود حسن ہندوستان کی معروف علمی درس گاہ دار العلوم دیوبند کے صدر مدرس تھے۔ دار العلوم دیوبند ہندوستان میں درس نظامی اور درس ولی الہی کا امتزاج تھا۔ مولانا موصوف اس کے صدر مدرس تھے لیکن درس نظامی کے ساتھ ساتھ جدید تعلیم خاص کر انگریزی زبان سیکھنے کے حامی تھے۔ مولانا عبید اللہ سندھی جو ان کے نامور نو مسلم شاگرد تھے کو ایک موقعہ پر کہا:

> "تمہاری عمر کے نوجوانوں کو ہماری نصیحت ہے کہ دورہ حدیث شریف کے بعد بی اے کے اسٹینڈرڈ تک، جب تک انگریزی زبان میں استعداد بہم نہ پہنچائیں، عملی زندگی میں قدم نہ رکھیں۔ ہمارا تجربہ ہے کہ یہ نصاب پڑھنے کے بعد نوجوانوں میں بے پناہ صلاحیتیں پیدا ہو جاتی ہیں اور وہ یونیورسٹی کے کسی تعلیم یافتہ سے کم نہیں ہوتے"۔

---

[2]- حقانی میاں، ڈاکٹر، دینی مدارس اور عصری تقاضے، فضلی سنز، کراچی، 2002ء، ص:548

[3]- مقالات شبلی، (تعلیمی) جلد نمبر 3

مولانا مناظر احسن گیلانی

مولانا مناظر احسن گیلانی بر صغیر پاک و ہند کے نامور محقق، ماہر تعلیم اور تاریخ نویس ہیں۔ پاک و ہند میں مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت کے موضوع پر ان کی باقاعدہ تصنیف ہے۔ جس میں مسلمانوں کے نظام تعلیم کے ماضی، حال اور مستقبل کے بارے میں تفصیل سے لکھا گیا ہے۔ مولانا گیلانی لکھتے ہیں:

> ''قرآن و حدیث، فقہ ان تین علوم کے سوا ہمارے مدرسوں کے سارے علوم نظر ثانی کے محتاج ہیں۔ صورت جسمیہ بدلتی رہتی ہے لیکن ہیولی ہر حال میں مشترک رہا ہے''۔[4]

مولانا گیلانی کا خیال تھا کہ علوم اصلیہ کی تین کتابیں (قرآن مجید، مشکوۃ (خلاصہ صحاح) اور فقہ میں شرح و قایہ باقی رہنے دی جائیں اور معقولات جو قدیم زمانے میں رائج تھیں ان کی جگہ علوم عصریہ (جدید علوم) اور فارسی کی جگہ انگریزی کو پڑھایا جائے۔ اس طریقہ کار سے ایسے افراد پیدا ہوں گے جو حالات و زمانہ کی سوجھ بوجھ رکھنے اور علوم قدیمہ اور جدیدہ سے کماحقہ واقفیت رکھنے والے ہوں گے)۔

مولانا ابوالاعلی مودودی

مولانا مودودی جدید دنیا کے نامور سکالر تھے، اگرچہ بذات خود مدارس کے نظام کا حصہ نہیں رہے لیکن ذاتی محنت اور لیاقت کے سبب بہت علمی شہرت پائی۔ مولانا کے خیال میں مدارس کے نصاب میں تبدیلی یا رائے کسی فرد واحد کا کام نہیں ہے، بلکہ یہ ایک پوری جماعت کی ذمہ داری ہے۔ ان کا یہ کہنا تھا کہ نصاب میں تبدیلی کی غرض سے معاصر تعلیمی اداروں کے نصابات کے مطالعہ سے کوئی سمت متعین نہیں کی جاسکتی۔ مدارس کے نصاب تعلیم کے متعلق ایک استفسار کے جواب میں انہوں نے لکھا:

---

[4] - دینی مدارس اور عصری تقاضے، ص:509

> ”کتابوں کے نصاب کی تفصیلات طے کرنا شخص واحد کا کام نہیں۔جماعت کی مقرر کردہ کمیٹیوں نے اپنا کام اب تک مکمل نہیں کیا، لے دے کر تعلیمی کانفرنس کی روداد اور اس کا طے کردہ تعلیمی لائحہ عمل ہے جس کی روشنی میں آپ خود اپنے حال کے لیے کتب نصاب متعین کر سکتے ہیں۔ اور شخصاً دوسرے دلچسپی رکھنے والے حضرات سے مشورہ کر سکتے ہیں۔ اگر ضرورت سمجھیں تو دیوبند، مدرستہ الاسلام، مظاہر العلوم سہانپور نیز پنجاب یونیورسٹی، دکن یونیورسٹی وغیرہ کے نصاب آپ مطالعہ فرمالیں“۔

مولانا سید محمد میاں(تاریخ نویس، محقق، مصنف)

مولانا سید محمد میاں برصغیر کے معروف علمی گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ مولانا موصوف درس نظامی کے بنیادی نصاب میں زیادہ تبدیلی کے قائل نہیں تھے، لیکن بااعتبار مجموعی اس میں مفید اصلاحات کے حق میں تھے، مولانا فضل محمد کے جواب میں انہوں نے لکھا:

> ”میں تبدیلی نصاب کے بارے میں زیادہ روشن خیال نہیں ہوں، بلکہ مقلد ہوں، اگرچہ موجودہ نصاب میں کچھ تبدیلی کی ضرورت محسوس ہوتی ہے، لیکن جزوی طور پر تنسیخ ٹھیک نہیں۔ مثلاً عربی کی ابتدائی کتابیں، فارسی کے بجائے اردو میں پڑھائی جائیں، شروع کی طوالت کو حذف کر دیا جائے۔ البتہ متون میں بعض مناسب اضافہ ضرور کر دیا جائے“۔

مولانا اعزاز علی(مصنف، مدرس)

مولانا اعزاز علی دارالعلوم دیوبند کے ادب کے استاذ اور کئی کتابوں کے مصنف اور شارح تھے۔ مولانا کے خیال میں حصول علم کے لیے جو محنت درکار ہے طالب علم اس سے تہی دست ہوتے جارہے ہیں اور ہمتیں پست ہوتی جارہی ہیں جس کا تدارک نصاب کی تبدیلی سے ممکن نہیں ہے۔ اگرچہ وہ کچھ تبدیلی وترمیم کے حق میں بھی ہیں۔ تاہم مکمل نصاب کی تبدیلی ان کے نقطہ نظر کے مطابق درست نہیں۔ نصاب کی تبدیلی کے حوالے سے انہوں نے مکتوب کے جواب میں لکھا ہے:

> ”سب سے پہلے اس بات کی ضرورت ہے کہ قومی مدارس میں ایسے اساتذہ رکھے جائیں جو خود ذی استعداد، محنتی، فرائض تدریس کے انجام دینے میں کوتاہی نہ کرنے والے ہوں۔ میری ہر گز رائے نہیں ہے کہ کنزالدقائق اور کافیہ جیسی کتابیں درس نظامی سے کم کی جائیں۔ درس نظامی کا اصل مقصد یہ ہے کہ ایسے افراد تیار کیے جائیں جو قرآن وحدیث کو اچھی طرح سمجھنے والے ہوں، نہ کہ اس کی غرض وغایت یہ ہے کہ اہل مصر کی طرح عربی بولنے والے بنیں۔ عصری علوم کا بھی درس نظامی میں پایا جانا ضروری ہے تاکہ کامل الفن لوگ پیدا ہوں“

مولانا سعید احمد اکبر آبادی (مصنف، محقق)

مولانا سعید احمد اکبر آبادی مشہور ماہر تعلیم اور استاد تھے۔ ہندوستان سے شائع ہونے والے ایک تحقیقی پرچے کے مدیر تھے۔ مولانا کا خیال تھا کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ مدارس کے نصاب میں اصلاح اور تبدیلی کی ازبس ضرورت ہے کیونکہ مدارس عربیہ کا نظام عمل صرف دینی اغراض تک محدود ہو کر رہ گیا ہے، اگرچہ اس کے اسباب طبعی اور قدرتی ہیں جن کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔ مولانا سعید احمد، مولانا ابوالکلام آزاد کی بنائی گئی تعلیمی اصلاحی کمیٹی کے ممبر بھی تھے، ان کے خیال میں ہندوستان میں مدارس میں رائج نصاب تعلیم (شاہ ولی اللہ) اور (فرنگی محل) کے خیالات سے مستعار شدہ ہے، جس کی وقت کے ساتھ ساتھ تبدیلی کی ضرورت ہے، منطق اور فلسفہ کی غیر اطلاقی ابحاث کی بھی فی نفسہ ضرورت نہیں ہے۔ اپنے ایک سلسلہ گفتگو میں انہوں نے اس بارے میں کہا:

> ”ہندوستان میں علوم وسط ایشیا کے راستے آئے، مختلف کتابیں داخل درس ہوئیں۔ یہاں دو گروپ بن گئے۔ ایک گروپ منقولی (شاہ ولی اللہ) اور دوسرا معقولی (فرنگی محل) جب بعض علماء نے دیکھا کہ یہ دونوں علیحدہ علیحدہ نہیں چل سکتے تو انہوں نے اسے یکجا کر کے ایک درس گاہ (دارالعلوم دیوبند) میں رائج کر دیا۔ یہ اس زمانے کے لحاظ سے بہت مفید چیز تھی۔ لیکن وہیں مضر بھی کہ وہیں قدیم طریقہ قائم ہے اور قوت اجتہاد و تفکر مفقود۔ اگر آپ واقعی اسلام قائم کرنا چاہتے ہیں تو آپ کو غور

کرناپڑے گا کہ درس گاہیں کیسے قائم رکھیں اوران میں کیاپڑھائیں"۔[5]

مفتی محمد شفیع عثمانی (بانی دارالعلوم، کراچی)

مفتی محمد شفیع عثمانی دارالعلوم کراچی کے بانی اور شیخ الحدیث تھے۔ آپ نے قرآن مجید کی مشہور تفسیر، معارف القرآن لکھی، علاوہ ازیں دیگر کئی کتابوں کے تحریر کنندہ ہیں۔ مفتی محمد شفیع نصاب میں تبدیلی کے حق میں نہیں تھے۔ ان کے خیال میں نامور علماء فضلاء اسی نصاب کے تیار شدہ تھے البتہ ایسے اساتذہ اور معلمین باقی نہیں رہے، جن کی محنت اور تدریس کی مہارت سے ذی استعدد طلباء تیار ہوں۔ ان کے بقول:

> "جتنے اکابر علماء اب تک پیدا ہوئے وہ اسی نصاب کے فاضل ہیں جس کو آج فرسودہ کہا جاتا ہے۔ مگر اساتذہ ماہرین و کاملین تھے، اسی لیے اسی نصاب سے سب کچھ حاصل ہو گیا، اور عام سکولوں اور کالجوں میں ہر تیسرے سال نصاب بدلنے والی کمیٹیاں بیٹھتی ہیں، مگر رجال کار کی طرف توجہ نہیں ہوتی، اس کے غلط نتائج کسی بصیر انسان سے پوشیدہ نہیں"۔

مولانا عبدالحق (بانی دارالعلوم حقانیہ، اکوڑہ خٹک)

مولانا عبدالحق مشہور دینی درسگاہ دارالعلوم حقانیہ کے بانی و مہتمم اور شیخ الحدیث تھے۔ آپ نے درس وتدریس کے ساتھ ملی، سیاسی اور سماجی خدمات میں بھی بھرپور حصہ لیا۔ سابق وزیراعظم خواجہ ناظم الدین نے اسلامی قوانین کے سلسلے میں جن آٹھ علماء کا مشاورت کے لیے انتخاب کیا تھا ان میں آپ کا نام بھی شامل تھا۔ 1952 میں دیگر علماء کے ساتھ مل کر جمعیت علماء اسلام کی بنیاد رکھی۔ تین مرتبہ قومی اسمبلی کے ممبر منتخب ہوئے۔ 1973 کے آئین کی تشکیل میں بھی حصہ لیا تھا اور دو سو سے زائد ترامیم پیش کیں۔ آپ دینی مدارس کے نصاب سے متعلق کسی بڑی تبدیلی کے حق میں نہیں تھے، البتہ کچھ اصلاحات کے حق میں تھے، مگر وہ جو خود علماء تجویز کریں، نہ کہ حکومتی مطالبات کی

---

[5] - دینی مدارس نصاب و نظام، ص: 183-184، نیز ملاحظہ ماہانہ "ترکھان" دہلی، اپریل 54، ص: 36

اساس پر۔ان کے بقول:

"تبدیل شدہ نصاب کو صرف اسی صوت قبول کیا جائے گا جب اس کے لیے اجتماعی کوشش کی جائے گی۔اس کام کے لیے جدید علوم کے ماہرین اور اسلامی علوم کے ماہرین کا باہمی تعاون از حد ضروری ہے۔ نئی اصلاحات میں عمرانیات کے علوم بھی شامل کیے جانے چاہئیں۔عالم اسلام کے مسائل،جدید دور کے حالات اور معاشرتی واقتصادی امور بھی زیر بحث لائے جانے چاہیئں تاکہ طلبہ میں دورِ جدید کے مسائل کا فہیم پیدا ہو سکے"۔

مولانا سید ابوالحسن علی الندوی

مولانا سید ابوالحسن علی الندوی نامور تاریخ نویس اور علمی گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔آپ دور جدید کے انتہائی معتبر سکالر اور مصنف کے طور پر جانے جاتے ہیں۔تاریخ دعوت و عزیمت،پرانے چراغ اور سید احمد شہید (سوانح) آپ کی تحریر کردہ معروف ہیں۔ مدارس کے نصاب کے حوالے سے ان کی رائے یہ تھی کہ علوم مقصودہ میں تبدیلی کی ضرورت نہیں،البتہ مدرسین اور طلبہ جدید زمانے کے اشکالات اور تقاضوں سے عموماً بے خبر ہوتے ہیں،اس لیے جدید علوم حاصل کرنا ضروری ہیں۔ان کا یہ بھی کہنا تھا کہ آخری درجات یعنی دورہ حدیث سے پہلے طلباء کو اخلاقیات کی کتابیں پڑھائی جائیں، ایک مکتوب کے جواب میں انہوں نے لکھا:

"علوم مقصودہ تفسیر و حدیث و فقہ میں کتابوں میں اتنی تبدیلی اور اضافہ کی ضرورت نہیں جتنی طرز تعلیم، مطالعہ اور استعداد آفرینی کے لحاظ سے ضرورت ہے۔ ہمارے مدارس میں ان فنون کے لیے جو مستند کتابیں داخل ہیں ان سے استثناء مشکل ہے اور ان کا بدل بھی آسان نہیں لیکن طرز تعلیم کی تبدیلی کی ضرورت ہے۔ اصل انحصار معلمین، ان کی تربیت، زمانہ کے فہم اور روح دعوت، جدید علم سے واقفیت پر ہے۔ طلباء کے لئے دورہ حدیث سے پہلے سب سے زیادہ اس کی ضرورت ہے کہ کوئی کتاب ایسی پڑھائی جائے کہ طالب علم کو روحانی اور اخلاقی فائدہ ہو"۔

ڈاکٹر رشید احمد جالندھری (ایڈیٹر، مصنف، تاریخ نویس)

ڈاکٹر رشید احمد جالندھری دور جدید کے معروف محقق ہیں، تاریخ دیوبند انہی کی تصنیف ہے، ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور سے شائع ہونے والے جریدے ''معارف'' کے ایڈیٹر تھے، درس نظامی کے نصاب میں چند تبدیلیوں کے ساتھ اس کو مفید قرار دیتے ہیں۔ ان کے خیال میں اگر کوئی طالب علم اس کو محنت سے پڑھے تو علمی صلاحیت حاصل ہو سکتی ہے۔ اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں:

> ''بے شک درس نظامی سے دقت نظر پیدا ہوتی ہے، بشرطیکہ طالب علم اپنا سفر جاری رکھے، لیکن یہ بھی حقیقت ہے اس میں بعض ضروری مسائل کا اضافہ نہ ہو سکا''۔

مولانا سلیم اللہ خان (سابق صدر وفاق المدارس، شیخ الحدیث)

مولانا سلیم اللہ خان وفاق المدارس العربیہ کے صدر تھے۔ زندگی کا ایک طویل عرصہ تدریس میں گزارا، مدارس کے اتحاد اور نصاب کے بارے میں ان کی طویل خدمات ہیں۔ مولانا سلیم اللہ خان کی رائے تھی کہ ایسے علماء تیار ہوں جو دور جدید کے ہر چیلنج کا مقابلہ کر سکیں۔ علماء کا صرف یہ کام ہے کہ وہ صرف قرآن پڑھائیں، حدیث یا فقہ پڑھائیں، یہ ضرور پڑھائیں لیکن اس کے ساتھ ساتھ جدید تعلیمی ادارے قائم کرنے کی بھی سعی کریں۔ مولانا کی یہ رائے ایک طرح سے وفاق والمدارس کے تعلیمی و نصابی منہج کی بھی عکاسی کرتی ہے، کہتے ہیں:

> ''آپ باقاعدہ ایسے انگریزی مدارس قائم کریں جس کے اندر اعلی درجے کی انگریزی زبان سکھائی جائے اور اعلی درجے کی ان کی تربیت بھی کی جائے اور ان کو ایسا بنایا جائے کہ وہ عصر حاضر کے چیلنج کا بھی مقابلہ کر سکیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ ہمارا یہ سمجھنا کہ صاحب ہمارا کام تو قرآن پڑھانا ہے، ہمارا کام تو حدیث پڑھانا ہے، ہمارا کام تو فقہ پڑھانا ہے، میں کب کہتا ہوں کہ یہ سب چھوڑ کر انگریزی پڑھائیں، لیکن متبادل انتظام یہ بھی کریں۔ میں نے عرض کیا تھا کہ آپ کے حلق سے یہ بات بہت مشکل سے اترے گی، لیکن یہ اتارنی ہے''۔

دینی تصورات اور سائنس کی تعلیم

ڈاکٹر سید محسن نقوی

کیا مذہب اور سائنس ایک دوسرے کی ضد ہیں؟مذہب اور سائنس کے بارے میں مباحثے کی تاریخ صدیوں پرانی ہے۔ مباحثہ کسی تکنیکی معاملے کے بارے میں نہیں بلکہ علوم کے دو جہانوں کے بارے ہے، یعنی ایک مذہبی اور دوسرا سائنسی علم۔تاریخ یہ بتاتی ہے کہ ٹکراؤ کی فکر کی یہ کشاکش دراصل اٹھارویں اور انیسیوں صدی میں پیدا ہوئی جب کلیسا نے سوچنے والوں کے خلاف سخت اقدامات کرنے شروع کیے۔ اسلامی تاریخ میں ایسا ٹکراؤ کہیں نہیں ملتا۔لیکن آج کل ہمارے ہاں بھی دونوں علوم میں تضاد کی فکر پائی جاتی ہے،جو غلط فہمیوں اور کچھ غلط مقدمات کی بنا پر قائم ہے۔ اِس دور میں اِس امر کی ضرورت گزشتہ صدیوں سے کہیں زیادہ بڑھ کر ہے کہ مُسلم معاشروں میں جدید سائنسی علوم کی ترویِج کو فروغ دیا جائے۔زیرنظر مضمون میں اسی موضوع پر بات کی گئی ہے۔ مضمون نگار آغاخان یونیورسٹی میں پروفیسر، اسلامی نظریاتی کونسل کے سابق رکن اور تاریخ و علم الکلام کے جید عالم ہیں۔کئی کتابوں کے مصنف ہیں اور رواداری ومکالمہ کے نقیب ہیں۔

مذہب اور سائنس کے ایک دوسرے کے مخالف ہونے سے قبل مذہب اور فلسفے کا ٹکراؤ شروع ہوا تھا۔ سائنس کی بنیاد کائنات کے مشاہدے اور اس کی عقلی و فلسفیانہ تشریح پر رکھی گئی تھی۔ سائنس کے لغوی معنی تو علم کے ہیں جو مشاہدہ کائنات سے حاصل ہوتا ہے، بعد ازاں اس کی تفہیم و تشریح کے طریقے اور اس کے نتائج کو بھی سائنس ہی کا جزو مانا جانے لگا۔ مذہب اور سائنس میں بنیادی فرق یہ سمجھ میں آتا ہے کہ "مذہبی علم" انسان کے لیے کسبی نہیں بلکہ وہبی ہے جو ابراہیمی مذاہب میں "نزول وحی" سے تعبیر کیا جاتا ہے،اور اسے حقیقی و قطعی سمجھا جاتا ہے۔ یہ علمیات کا ایک پہلو ہے۔ یہ علمیات حصول علم کی بجائے وصول علم پر مبنی ہے، جب کہ سائنس کی بنیاد حصول علم پر ہے جو ایک امکان سے چلتی ہے، پھر مشاہدہ اور تجزیے کے میدان میں قدم رکھتی ہے، بعد ازاں اسے تجربے کے مرحلے سے گزرنا پڑتا ہے اور بار بار کا تجربہ ایک ہی نتائج دے تو وہ اصول بنالیا جاتا ہے۔ سائنس میں جو

"اصول" قرار دیے جاتے ہیں وہ پوری دنیا میں ایک جیسے نتائج کے مرتب کرتے ہیں جیسے نیوٹن کے تینوں قوانین حرکت، یا نظریہ کشش ثقل وغیرہ۔ سائنس یہاں پر ٹھہر نہیں جاتی بلکہ مزید اکتشافات کے پیچھے لگی رہتی ہے اور اس کے مشاہدات تبدیل ہوتے رہتے ہیں۔ سائنس کی ایک اہم دریافت کائنات میں ریاضی کی زبان کو سمجھنا ہے جو ایک خاص نسبت و تناسب سے کام کررہی ہے اور اس کی مدد سے جدید ایجادات ہو رہی ہیں اور تشریح کائنات کی کوشش جاری ہے۔

ویل ڈیوراں کی ایک کتاب کی ابتداء ایک ایسے باب سے ہوتی ہے جس کا عنوان اس نے "ہیروز کی بے شرمی سے پرستش" رکھا ہے، اس کا خیال ہے کہ ہم نے اپنے ماضی کے ہیروز کی تحسین کرنے میں اپنے موجودہ مفکرین کو نظر انداز کیا ہے، حالانکہ یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے "علم" کو خدا کے ہاتھوں سے نکال کر "انسانی علم" پر زندگی استوار کی ہے[1]۔ بعض مفکرین کا خیال ہے کہ ابتداء میں انسان نے خدا کا تصور کائنات کی تشریح کے لیے اختیار کیا تھا اور اس کی پرستش اختیار کرلی تھی، کیوں کہ انسان اس کائنات میں کسی نظام کی دریافت سے قاصر تھا لہذا اسے متعدد خداؤں کا تصور اپنانا پڑا اور یہی اس کا مذہب ہوگیا۔ گویا یہ مذہبی طرز فکر کی بنیاد تھی، جہاں علم کا سرچشمہ ایک اعلی ذات کو قرار دیا گیا اور اسی کے ذریعے کائنات کی پیدائش و تشریح معتبر سمجھی گئی، جبکہ موجودہ سائنس اور فلسفے نے اسے انسانی دماغ، تجربے، اور تجزیے سے منسلک کردیا ہے۔ مغربی فلسفی وٹگنس ٹائین نے اپنی کتاب "تیقن" (Wittgenstein: Certainty, 1969) میں لکھا ہے کہ "انسان نے یہ فیصلہ کیا کہ ایک بادشاہ بارش برسا سکتا ہے، ہم یہ کہتے ہیں کہ یہ نظریہ سب ہی کے تجربے کے برخلاف ہے" یہ وہ بنیادی فرق ہے دو سوچوں کا جس پر مذہب اور سائنس کو ایک دوسرے کا مخالف سمجھا جاتا ہے، حالانکہ انسان اور کائنات کی تفہیم کے یہ دو مختلف زاویہ ہائے نظر ہیں جو صدیوں سے ساتھ ساتھ زندگیاں گزار رہے ہیں۔

کائنات اور اس کے مظاہر تو وہی ہیں جو آج سے ہزاروں برس قبل انسان نے اپنی برہنہ آنکھ سے

[1] - ویل ڈیورانٹ، دی گریٹسٹ مائینڈز، باب اول

مشاہدہ کیے تھے اور اس سے ایک "نظام کائنات" اپنی تئیں مرتب کیا تھا، اور اس کے مظاہر کی توجیہ میں کئی رویوں نے حصہ لیا۔ جس میں سے ایک مذہبی عقیدہ بھی ہے۔ یہاں مذہب سے ہماری مراد صرف وہ مذاہب نہیں ہیں جنھیں الھامی یا غیر الھامی مذاہب کے خانوں میں تقسیم کیا گیا ہے، بلکہ اس میں ہر وہ صورت شامل ہے جسے اوپر ویٹگنس ٹائن کے الفاظ میں بیان کیا گیا ہے، جس کا سادہ مطلب یہ ہے کہ مذہبی عقیدے کے مطابق جو کائنات پر حکومت کرتا ہے وہ بارش بھی برساتا ہے، اس سبب سے اسے قانون عطاء کرنے والا بھی سمجھا جاتا ہے جس سے انحراف "کفر" پر منتج ہوتا ہے۔ ان مفکرین کے مطابق حمورابی (1792-1750 ق م)، ابراہیم علیہ السلام، موسی علیہ السلام، حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم وغیرہ کو جو پہاڑی پر مقدس ہدایات دی گئیں وہ ایک ہی بات کی نشان دہی کرتی ہیں کہ "بادشاہ" ہی قانون بھی دے گا جس پر چلنا ہے اور اس عطاء کردہ علم کے مقابلے میں انسانی علم کی حیثیت نہیں ہے۔ گویا بنیادی مسئلہ "علمیات" کا ہے نہ کہ باہمی تردید و تنقیص کا۔

سائنس و فلسفہ اور یہودیت و مسیحیت کا آپس میں تعلق تاریخ میں واضح ہے۔ فیلو (15 ق م-45ء) کے زمانے میں یہودیت نے اپنی الھیات کو یونانی فلسفے کے ذریعے سے سمجھانے کی کوشش کی، اور کائنات کی وہی تشریح اس کے مد نظر رہی جو یونانیوں میں اس وقت درست سمجھی جاتی تھی، یہ چیزیں کتاب پیدائش پر اس کی تشریحات سے معلوم ہوتی ہیں۔ بعد میں اسی تھیالوجی میں ترقی ہوتی گئی اور یہ اسپین و اسکندریہ کے راستے مسیحی فکر میں آئی۔ چار بڑے کلیسائی باپوں نے مسیحی فکر اور الھیات کو تشکیل دینے میں اہم ترین کردار ادا کیا ان میں امبروز (340-397) جیروم (347-420ء)، آگسٹین آف ہپو (354-430ء) اور پوپ گریگوری (540-604ء) شامل ہیں یہی زمانہ ہے جب مسیحی حضرات میں فلسفہ اور سائنس سے متعلق نظریات مضبوط ہوئے۔ سائنس کے عھد جدید میں بڑے بڑے سائنسدان یہودی اور مسیحی ہوئے ہیں خود نیوٹن نے بائبل کے بعض حصوں کی شرح لکھی ہے۔

البتہ کائناتی ارتقاء اور حیاتیاتی ارتقاء کے نظریات، جو گیلیلیو (1564-1642) اور ڈارون (1809-1882) نے پیش کیے، انھوں نے سائنس اور مذہب کے درمیان دوریاں پیدا کیں۔

مشہور سائنس دان اور فلسفی جارڈانو برونو (1548-1600)، اور پروفیسر جان سکوپس کو 17 فروری، 1600ء کو چرچ کے حکم پر زندہ جلا دیا گیا، 1642 میں انتقال کر جانے والے مشہور سائنسدان گلیلیو کو یہ کہنے پر مجبور کیا گیا کہ سورج کی بجائے زمین کائنات کا مرکز ہے اور سورج زمین کے گرد گھوم رہا ہے اسے معافی مانگنے، اور اپنے نظریات سے توبہ کرنے پر مجبور کیا گیا اور پھر تادم آخر گھر میں نظر بند کر دیا گیا۔ کیا اس کے نتیجے میں سائنسی ترقی رک گئی، ٹیکنالوجی کو بریک لگ گیا، فکر و فلسفہ بانجھ ہو گئے؟ ایسا کچھ بھی نہیں ہوا اور نہ ہو سکتا ہے۔ امریکہ اور یورپ کے بعض حصوں میں آج بھی چرچ یہ بحث کرنے میں مصروف ہے کہ طالب علموں کو "حیاتیاتی ارتقاء" کا نظریہ نہ پڑھایا جائے لیکن سائنس کی دنیا میں نہ صرف یہ کہ ڈارون کا یہ نظریہ باقی ہے بلکہ اس کی بنیاد پر روز بروز نئے نئے حیاتیاتی مسائل کا حل نکالا جا رہا ہے جس سے اس نظریے کی مخالفت کرنے والے بھی مستفید ہو رہے ہیں۔ عملی طور پر اسی صورت کو اختیار کیا جا رہا ہے جس کی تردید کی جا رہی ہے۔

اب اس امر پر بھی نظر کر لیں کہ مسلمانوں کے سائنسی کارناموں پر، جو انہوں نے مختلف میادین میں انجام دیے، ہر مسلمان فخر کرتا ہے، نیز یورپ اسے تسلیم کرتا ہے کہ مسلمانوں کے علمی آثار سے یورپ نے بہت استفادہ کیا ہے، خاص کر سائنس کے میدان میں مسلمانوں نے جو ایجادات اور تحقیق کی اس پر موجودہ سائنس کی بنیاد رکھی گئی[2] اس سے قبل کے زمانے کو "ڈارک ایجز" یعنی (ازمنہ مظلمہ) کہتے ہیں۔ انگریزی اور اردو میں اس موضوع پر متعدد کتب موجود ہیں، سائنس یا فلسفہ کی تاریخ پر ہر کتاب میں مسلمانوں کے اس سنہری زمانے کا تذکرہ موجود ہے۔

غور کرنے کی بات یہ ہے کہ اس دور میں سائنس اور مذہب میں کوئی منافات اور تضاد و تصادم کی صورت کیوں نہیں سمجھی گئی، بلکہ وہ علماء قابل فخر مانے گئے جنھوں نے دونوں قسم کے علوم میں دستگاہ پیدا کی۔ صرف ابوالحسن علی ندوی کی کتاب "ما ذا خسر العالم بانحطاط المسلمين" ملاحظہ فرمائیں، جس کا ترجمہ مسلمانوں کے عروض و زوال کا مغرب پر اثر کے نام سے ہوا ہے، تو اندازہ ہوتا

---

[2]- Niall Ferguson, Civilization, pp. 50-52, David Wootton, The Invention of Science, p. 113

ہے کہ مسلم تھذیب و تمدن نے کس طرح طبعی علوم اور ان کی تحقیقات کو اپنے میں نہ صرف سمویا بلکہ بھرپور استفادہ بھی کیا۔ یہ علوم قرآن، حدیث، فقہ، اصول اور دیگر کے ساتھ مدارس میں پڑھائے جاتے تھے جن میں جغرافیہ، ریاضی، الجبراء اور طب وغیرہ بھی شامل تھے۔ اسلام اور طبعی علوم کے درمیاں کوئی لڑائی نہیں تھی۔

تین مسلمان مفکرین نے علوم کی طبقہ بندی پر بنیادی کام کیا ہے، ابو نصر الفارابی (258-339ھ)، ابو حامد الغزالی (450-505ھ)، اور قطب الدین الشیرازی (634-710ھ)۔ غزالی اور شیرازی نے اساسی طور پر فارابی کی درجہ بندی کو قبول کیا ہے لیکن جن نکات پر زور دیا ہے یا جن پہلوؤں کو اہم یا اہم تر قرار دیا ہے وہ ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ اس درجہ بندی میں یہ امر بھی اہم ہے کہ فارابی فلسفہ مشائیین کے ترجمان ہیں، اور غزالی یونانی فلسفے کے مخالف و ناقد (تھافۃ الفلاسفہ)، جبکہ فارابی سے چار سو سال بعد آنے والے الشیرازی اسماعیلی ہیں جنھوں نے سقوط بغداد کا بچشم خود مشاہدہ کیا تھا۔ چنانچہ (اہم، اہم تر، اہم ترین) کے حوالے سے ان کے نظریات میں تفاوت ہونا فطری تھا۔

فلسفیانہ بحثوں میں الجھنے کی بجائے سیدھی سادی بات کی جائے تو علوم اسلامی، قرآن، تفسیر، حدیث، فقہ، اصول، علوم عربیہ وغیرھا، کلام الھی کے مطالعے پر مشتمل ہیں، یا اس میں معاون ہیں اور آلات کا کام دیتے ہیں۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ ان علوم کا مطالعہ ان کے آئمہ کو مختلف نتائج تک پہنچاتا ہے جس سے مکاتب فقہ و حدیث تشکیل پائے ہیں۔ مسائل شرعیہ میں ایک کی رائے دوسرے سے مختلف ہے۔ اس کے باوجود ان سب کو برداشت بھی کیا جاتا ہے، پڑھایا بھی جاتا ہے اور ان کے دلائل بھی زیر بحث لائے جاتے ہیں، ان میں ترجیح بھی قائم کی جاتی ہے، کوئی کسی رائے پر اختلاف کے باوجود کفر کا فتوی نہیں لگاتا۔

کلام الھی کو جس طرح انسان کما کان حقہ اب تک نہیں سمجھ سکا اسی طرح کائنات جو "امر و تخلیق الھی" ہے اس کے عمل اور نظام کو بھی انسان ابھی پوری طرح نہیں سمجھ سکا۔ اس نظام پر غور کرنے اور اس کی لطافتوں کو دریافت کرنے کا نام سائنس ہے جو خود اپنی ایجاد سے لے کر آج تک مختلف تشریحات اور ان کے مکاتب فکر میں سفر کرتی رہی ہے اور یہ سفر جاری رہے گا۔ یہ سفر ختم نہیں ہو گا

کیوں کہ رب العالمین نے اسے انسانی مشاہدے اور تجربے کی نسبت سے لا محدود خلق کیا ہے اور کائنات توانسانی مشاہدے میں پھیلتی ہی جارہی ہے۔ مطالعہ کائنات کاایک چھوٹاسا حصہ حیاتیات کا بھی ہے۔ یہ سوالات کہ روئے زمین پر زندگی کی ابتداء کیسے ہوئی، پہلی جان دار چیز جو زمین پر نمودار ہوئی وہ کیا تھی، نباتی حیاتیات کا بحری، بری اور فضائی مخلوقات سے کیا ربط ہے، واحد خلیے (سنگل سیل) کیسے وجود میں آتے ہیں اور پھر ان میں بار آوری کیسے ہوتی ہے، زمین پر پیدا ہونے والا پہلا جان دار کون تھا اور پھر اس سے کس طرح جان دار مخلوق وجود میں آئی، انسان سے پہلے کی مخلوق کون تھی جس کا اشارہ فرشتوں کے اس بیان میں ہے کہ "کیا تو زمین پر ایسے کو خلیفہ بنائے گا جو اس پر فساد مچائے گا اور خون بہائے گا" (البقرہ،30)۔ یہ آیت انسان سے پہلے ایک ایسے "انسان نما" کی طرف اشارہ کررہی ہے جو خاصہ غیر متمدن تھا، جب کہ آدم کی تخلیق اور حضرت آدم علیہ السلام کے متعارف کیے جانے میں فرق کرنا چاہیے۔ آدم تو اپنے سے ماقبل مخلوق (ہوموار یکٹس) کی ترقی یافتہ شکل تھا، حضرت آدم علیہ السلام اس کی اعلی ترین سطح پر تھے جن کو علم حاصل کرنے (اللہ نے آدم کو سارے اسماء سکھادیئے) اور علم کو دوسروں تک پہنچانے، یعنی ابلاغ کی صلاحیتوں سے نوازا گیا تھا(اور جب آدم نے فرشتوں کو سارے اسماء بتادیے) گویا یہ تمدنی ارتقاء ہے جس کی وضاحت کی جارہی ہے۔ بعد میں اولاد آدم کی ساری ترقی علم کے ذریعے ہی ہوئی ہے۔

اس لحاظ سے دیکھیں تو سائنس کا نظریہ حیاتیاتی ارتقاء ایک تو اکتشافات کے تسلسل کی ایک کڑی ہے، ایک نقطہ نظر ہے، سائنس کے دیگر نظریات کی طرح، جب کہ تحقیق جاری ہے۔ قدیم انسانی ڈھانچوں کی دریافت میں سر اور جبڑے کی ہڈیوں، نیز ہاتھوں و پیروں کی بناوٹ، اور اس وجود کے کھڑے ہونے کی صلاحیت کے اعتبار سے ان باقیات کو مختلف مزعومہ درجات سے متعلق قرار دے کر ان کی وضاحت کی کوشش کی جاتی ہے اور کاربن ڈیٹنگ و ڈی این اے کے ذریعے کسی ڈھانچے کی قدامت کا تعین کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سائنسی بیانات کچھ اس قسم کے الفاظ پر مشتمل ہوتے ہیں: "سائنس دانوں کا خیال ہے کہ ملنے والا یہ ڈھانچہ تقریبا اتنے لاکھ سال پرانا ہے اور خیال ہے کہ یہ فلاں طفیلی طبقے سے تعلق رکھتا ہے" یہ محققین خود حتمی نتائج کی حیثیت سے اپنی

تحقیقات کو پیش نہیں کرتے، تحقیق ابھی جاری ہے۔ انسانی ذہن اپنی بھرپور کوشش کے باوجود کلام الٰہی کی تشریح میں بھی پوری طرح کامیاب نہیں ہو سکا کہ کوئی مسلک یہ دعوی کرے کہ بس مراد الٰہی وہی جو ہم سمجھے ہیں، اسی طرح خدا کے "کن فیکون" کو بھی انسان پوری طرح نہیں سمجھ سکا۔ دونوں طرح کی آیات، قرآنی اور تکوینی، کی تشریح جاری رہے گی۔ ان متعدد تشریحات کی اصل دین سے کوئی منافات نہیں اور نہ تضاد کا کوئی پہلو ہے۔

دینی مدارس کے نصاب میں ان نظریات کو آسانی سے سمویا جاسکتا ہے۔ یہ نظریات ایک متبادل بیانیے اور تشریح کے طور پر طلباء کو بتائے جاسکتے ہیں۔ سورہ مؤمنون، 14:23، نیز الزمر، 6:39، والعلق، -1 5:96 کے مطالعے سے شکم مادر سے لے کر انسان کی پیدائش و (خلق آخر) تک مراحل کو مذہبی اور سائنسی نقطہ نظر سے پڑھانے کی صورت میں طلباء متبادل بیانیوں سے روشناس ہو سکتے ہیں۔ سورہ مؤمنون کی آیت میں وارد خلقا آخر" کو طبّی تحقیقات کے ذریعے اچھے طریقے سے سمجھایا جاسکتا ہے اور اس میں مسلمان اطباء کے بیانات بھی شامل کیے جاسکتے ہیں۔ گو کہ مسلمان اطباء کی تحقیقات پرانی ہو گئی ہیں لیکن کسی بھی علمی ترقی کی تاریخ ماضی کے سنگ ہائے میل کا ذکر کیے بغیر مکمل نہیں ہوتی۔

یہی حال دوسرے شعبوں کا بھی ہے، مثال کے طور پر ہم سیاسیات میں ارسطو و افلاطون کے نظریات سے لے کر میکیاولی اور ہیرالڈ جے لاسکی اور مابعد کے مفکرین کو، جمہوریت، سوشل ازم، کیمونزم، یک ایوانی مقننہ اور دو ایوانی مقنن وغیرہ پڑھتے اور پڑھاتے ہیں تو اس کے ساتھ اسلامی نظریہ خلافت، ولایت فقیہ، حکومت از دست علماء یا کوئی اور نظریہ بھی پڑھا سکتے ہیں۔ معاشیات کے متوازی اسلامی معاشی نظام، سود اور بینک کاری، کے متبادل غیر سودی بیک کاری پڑھائی جاسکتی ہے۔ یہ متبادل و متوازی نظریات ہیں انھیں پڑھنے و پڑھانے میں اسلام نہ سد راہ ہے اور نہ ہو سکتا ہے۔

لہذا ضرورت اس امر کی ہے کہ ایسے علماء و فضلاء نیز علوم جدیدہ بشمول سائنس کے ماہرین ساتھ ساتھ بٹھائے جائیں اور نصاب میں ایسے مواد کو شامل کریں جو ان متعدد نظریات کو شانہ بشانہ پڑھانے میں ممد و معاون ہو۔

مدارس میں سائنسی وعقلی علوم کی تدریس کے امکانات

محبوب احمد

ایک وقت تھا کہ اسلامی تاریخ کے قدیم مدارس میں جس طرح مذہبی علوم پڑھائے جاتے تھے، اسی طرح فلکیات، فلسفہ اور طبعی علوم بھی زیرتدریس ہوتے تھے۔ مدارس ہی تعلیم کے واحد ایسے مراکز تھے جو علم سے جڑی تمام ضروریات کو پورا کرتے تھے۔یہی وجہ ہے کہ قدیم کتب میں مدارس کے تعلیمی نظام میں طبعی علوم پڑھائے جانے کے کثیر شواہد ملتے ہیں۔ مگر استعماری عہد کے بعد سے صورتحال کافی تبدیل ہوگئی۔ مدارس میں محدود انداز میں منطق و فلسفہ کی چند کتب تو شامل درس ہیں لیکن اس کے علاوہ کچھ خاص نہیں پڑھایا جاتا۔ حتی کہ علوم کی جو تقسیم کردی گئی ہے اس میں مدارس کے لیے صرف دینی علوم خاص کردیے گئے ہیں۔ مدارس میں سائنسی علوم پڑھائے جاسکتے ہیں یا نہیں، زیر نظر مضمون میں اس کا ایک تاریخی تجزیہ پیش کیا گیا ہے۔مضمون نگار ’انٹرنیشنل ریسرچ کونسل برائے مذہبی امور‘ میں تربیت کار اور منتظم ہیں۔

قدیم مدارس میں سائنسی وعقلی علوم

مسلم تاریخ میں قدیم زمانے سے ہی مدارس کا چلن تھااور ان میں تحصیل علم کے مضامین وسیع انداز میں دوانوع میں منقسم تھے۔ پہلی قسم مذہبی یاعلوم شریعہ ونقلیہ تھی، جو تعلیم کے ان شعبوں کاتعین کرتی جن کی اصل اور بنیاد کا تعلق اسلام سے ہے۔ مثال کے طور پر تفسیر، علم الحدیث، فقہ، علم کلام وغیرہ۔ تحصیل علم کے وہ شعبے جن کا تعلق عربی زبان، فلسفہ، صرف ونحو، فصاحت وبلاغت وغیرہ سے تھا۔ انہیں مذہبی علوم سے متعلق تصور کیا جاتا تھا۔ کیونکہ قرآن وحدیث کی تفہیم ان کے بغیر ممکن نہ تھی۔علوم کی دوسری قسم میں منطق، فلسفیانہ یا طبعی علوم جیسے مضامین تھے۔ان میں فلسفہ، حساب، علم الادریہ، فلکیات، طبعیات، جغرافیہ وغیرہ بھی شامل تھے۔ علوم دینی کو دیگر علوم کے مقابلے میں یقینی طورپر زیادہ قدرومنزلت حاصل تھی۔

بہرحال تحصیل علم کی تمام شاخیں اور شعبے مفید اور سودمند تصور کیے جاتے تھے۔ان میں سے بعض

زیادہ اہم تھے۔ مثال کے طور پر امام غزالیؒ نے ارشاد فرمایا:

"ان علوم کی تحصیل جو مسلمانوں کے دینی اور دنیوی فوائد کے لئے لازمی ہیں اجتماعی مذہبی فریضہ (فرض کفایہ) ہے"۔

مزید براں، انہوں نے علم کی تعریف وستائش کرتے ہوئے فرمایا:

"اس کی تحصیل اللہ تعالیٰ کی طرف سے عائد کردہ فریضہ ہے جو اللہ کا وصف ہے۔ یہ اس کے ساتھ منسوب ہے"۔ (احیاء العلوم، 223)

دنیائے اسلام کے یہ رجحانات قابل قدر ہیں کہ، دینی اور عقلی علوم دونوں ساتھ ساتھ نشوونما پاتے رہے ہیں۔

موجودہ روایتی مدارس

روایتی اسلامی نظام تعلیم تقریباً ایک ہزار سال بڑے اطمینان بخش انداز سے سرگرم کار رہا اور اپنی شمع روشن کیے رہا ہے۔ ہر خاص و عام کو تعلیمی سہولتیں مہیا کرنے، خواندگی کے تناسب کو بڑھانے اور معیار تعلیم کو بلند کرنے کا اعزاز اسی نظام تعلیم کو حاصل ہے۔ اس نظام نے اسلامی دنیا میں، خاص طور پر شہری علاقوں میں ابتدائی سطح پر مسلمانوں کو زیور تعلیم سے آراستہ کیا اور انہیں ایسا علم عطا کیا جس سے وہ اپنے خالق کے ساتھ رشتہ قائم کر سکیں اور جس کے مطابق انہیں اپنی زندگی بسر کرنی ہے۔ دوسری طرف اعلیٰ تعلیم کے اداروں نے فاضل مدرسہ، قانون دان، مصنفین اور انتظامی افسر پیدا کیے۔ خالص علمی ہدایات مہیا کرنے کے علاوہ اس اسلامی نظام تعلیم نے ان کی زندگیوں کو روحانی اور اخلاقی اقدار سے بھی آشنا کیا۔

علمی سطح پر اس علم نے انسانی علم کے تمام شعبوں میں نمایاں مفکر و دانشور اور محقق پیدا کیے ہیں۔ تخصص اور تخصیص کے مختلف شعبوں کے نقطہ نگاہ میں یکسانی اس نظام کا ثمرہ تھی۔

تقریباً سولہویں، سترھویں صدی میں مسلم تہذیب کے اندر زوال کے آثار ظاہر ہونا شروع ہو گئے

تھے۔اسے مختلف الفاظ میں بیان کیا جائے تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ، مغربی تہذیب دنیا کی تاریخ کے سٹیج پر نمودار ہوئی۔ یہ قوت کے نئے ذرائع اور وسائل سے لیس تھی۔اس نے مسلم تہذیب پر غلبہ حاصل کرنا شروع کر دیا۔جمود و زوال جلد ہی مسلمانوں کی علمی زندگی پر بھی طاری ہو گیا اور دینی اور عقلی علوم کے شعبوں میں مسلمان تخلیقی صلاحیت، جدت اور اختراع کے لحاظ سے کمزور ہو گئے اور نامعلوم سمت کے تعاقب اور تجسس کے لئے جس صبر و تحمل، استقلال اور صلاحیت کی ضرورت ہوتی ہے وہ اس سے محروم ہو گئے۔

اس زمانے میں سائنس اور عقلی علوم کی طرف مسلمانوں کی توجہ بہت کم ہو گئی۔ان علوم میں ان کے لئے کوئی دلکشی نہ تھی۔ علمی توجیہات، تنگ نظری اور تعصب کا شکار ہو گئیں اور ان کی نگاہیں کلی طور سے مذہبی علوم پر مرتکز ہو کر رہ گئیں۔ یہ صورت حال جس نے اسلامی تہذیب کی علمی روایت کو جمود کی طرف دھکیل دیا اس وقت وقوع پذیر ہوئی، جب یورپ علمی سرگرمیاں عروج پر تھیں اور اس کے علمی افق تیزیں سے وسیع ہوتے جا رہے تھے۔

سترھویں صدی میں بہت سے ذہین اور سلیم الطبع افراد پر یہ واضح ہو چکا تھا کہ مسلمانوں کا نظام تعلیم، تعلیمی عمل اور وہ تعلیمی ادارے جن کی بنیاد پر یہ نظام قائم کیا گیا تھا زوال پذیر ہو رہے ہیں۔نہ صرف یہ کہ، روایتی دینی نظام تعلیم انسانی علم کی نشو و نما اور ترقی کا ساتھ دینے میں ناکام ہو چکا تھا۔ بلکہ یہ اس علم کو جس کی دریافت اور اکتشاف ہو چکی تھی اور وہ ٹیکنالوجی جسے دوسری قوموں نے بہت ترقی اور نشو و نما دے دی تھی، اسے بھی اپنے اندر جذب کر لینے کی اہلیت سے محروم تھا۔

ممتاز و معروف ترکی مصنف کاتب چلپی (Katib Chelebi)(متوفی 1657) نے اپنی زندگی میں اس تشویشناک رجحان کو اپنی آنکھوں سے دیکھا اور اس المناک صورت حال پر دل سوزی سے اظہار خیال کیا:

> ”لیکن بہت سے ناسمجھ لوگ، چٹان کی طرح ساکن، جامد اور غیر متحرک رہے۔ وہ اپنے اسلاف کی اندھی تقلید میں جمود کا شکار رہے اور منجمد ہو کر رہ گئے۔انہوں نے نئے علوم کو بغیر کسی فکر و تدبر اور غور و خوض کے، تحقیر آمیز انداز سے ٹھکرا دیا۔ وہ

علماء کی اندھی تقلید کرتے رہے اور اس ترقی پذیر دور کے تقاضوں سے ناواقف اور بے خبر رہے، وہ ان علوم کے شائق رہے جنہیں وہ فلسفیانہ علوم کہتے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ زمین و آسمان سے بالکل بے خبر تھے۔ حالانکہ قرآن کی اس آیت کے مطابق انہیں غور وخوض اور فکر وتدبر سے کام لینا چاہیے تھا۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

"کیا ان لوگوں نے آسمان وزمین کے انتظام پر کبھی غور نہیں کیا اور کسی چیز کو بھی، جو خدا نے پیدا کی ہے نہیں آنکھیں کھول کر نہیں دیکھا (قرآن: 7:184)"

اس آیت اور اس کے مفہوم نے ان نے قلوب واذہان پر کوئی اثر نہ ڈالا۔ وہ خیال کرتے تھے کہ زمین و آسمان کے متعلق غور وفکر کرنے سے مراد یہ ہے کہ گائے کی طرح انہیں ٹک ٹک دیکھتے رہو اور اپنی جگہ پر جمود کی علامت بنے رہو"۔ (کشف الظنون)

دنیا کے مسلمانوں کی پسند و ناپسند اور ردو کد سے قطع نظر مغربی نظام تعلیم اور اس کے ضمن میں مغربی علمی اور تعلیمی روایت نے مسلم ممالک میں نفوذ کر لیا۔ اس نظام تعلیم اور تعلیمی روایت کو یا تو ان مسلم حکمرانوں نے اپنے ملکوں میں متعارف کروایا، جو اس کی افادیت پر پورا اطمینان محسوس کرتے تھے، یا پھر ان ملکوں میں مغربی نو آبادیاتی طاقتور نے اس نظام کو ان محکوم مسلمانوں پر ٹھونس دیا۔ یورپ کے جدید نظام تعلیم کے تعارف اور نفوذ کے وقت اسلامی تہذیب کی زوال پذیری کا یہ عالم تھا کہ مسلمان اپنی صلاحیتوں کے احساس وانتخاب کی اہلیت سے بھی محروم ہو چکے تھے اور تنقیدی نقطہ نگاہ کے ساتھ مفید عناصر کے ساتھ توافق پیدا کرنے کی صلاحیت بھی کھو چکے تھے۔

مدارس اور سائنسی علوم

آزادی کے بعد بدلے ہوئے حالات میں مدارس کے قیام کے اس مخصوص پس منظر کا تقاضا ہے کہ ان کا نصاب تعلیم معروف دینی علوم، قرآن وحدیث اور ان کے متعلقات تک محدود نہ رہے۔ مدارس کے نظام کے مطالعہ سے صاف پتہ چلتا ہے کہ نظری طور پر فلسفہ جدیدہ اور سماجیات و اقتصادیات ہی نہیں خالص سائنسی علوم (Pure Sciences) کو بھی ان کے اندر سمانے کی پوری گنجائش موجود

ہے۔ بلکہ جہاں تک دارالعلوم دیوبند کا سوال ہے وہ نظری سے آگے عملی طور پر اس کا تجربہ بھی کر چکا ہے۔ ''طب'' کا خالص سائنسی علم ہونا مسلم ہے۔ دارالعلوم کی 1895ء کی روداد سے پتہ چلتا ہے کہ، وہاں ''طب یونانی'' کی تعلیم کا باقاعدہ نظم قائم کیا گیا تھا۔ اور مولانا محمد یعقوب صاحب مدرس اول اس علم کی کتابیں پڑھاتے تھے۔ اس خالص سائنسی علم کو پوری وسعت دینا بھی پیش نظر تھا۔

حضرت علامہ انور شاہ کشمیری اپنے مخصوص تلامذہ کو جدید سائنس کی کتابیں پڑھاتے تھے تھے۔ مزید برآں آپ کا کہنا تھا کہ ''اب علماء کو قدیم فلسفہ و ہیئت کے ساتھ جدید فلسفہ و ہیئت کو بھی حاصل کرنا چاہئے۔'' دوسرے ذرائع سے پتا چلتا ہے کہ علامہ موصوف دینی نصوص کی توجیہ و تشریح میں بھی اپنی ان سائنسی معلومات سے فائدہ اٹھاتے تھے[1] جہاں تک ندوۃ العلماء کا سوال ہے، تو معلوم ہی ہے کہ، وہ '' بین القدیم النافع و الجدید الصالح''، کا علمبردار ہے۔ ظاہر ہے کہ نئے دور میں سائنس و ٹکنالوجی کے بغیر اسلام کی خدمت کا حق ادا نہیں کیا جا سکتا۔

اس کے علاوہ ندوۃ العلماء کے قیام کے جو اغراض و مقاصد بیان کیے گئے ہیں ان کے اندر صاف طور پر وہ دفعات موجود ہیں جن سے اس کے نصاب تعلیم کے لیے سائنس و ٹکنالوجی کی ضرورت کو آسانی کے ساتھ ثابت کیا جا سکتا ہے۔ ندوہ کے قیام سے مدارس عربیہ کے نظام کے جس خلاء کو پر کرنا پیش نظر تھا، اس کی اولین دفعہ میں اس کمی کا اظہار کیا گیا تھا کہ :

> ''جو طلبہ علوم عربیہ سے فارغ ہوتے ہیں وہ امور انتظامی دنیا اور معیشت سے محض ناواقف رہتے ہیں۔''[2]

مدرسۃ الاصلاح سرائے میر (اعظم گڑھ) کے دستور میں بھی ایسی دفعات موجود ہیں، جن سے اس کے نظام تعلیم میں سائنس و ٹکنالوجی کی پوری گنجائش نظر آتی ہے۔ دفعہ 4 میں مدرسہ کا مقصد ان لفظوں میں واضح کیا گیا ہے:

1- ڈاکٹر محمد فاروق بخاری ''علوم عقلیہ میں علامہ انور شاہ کاشمیری کی بصیرت'' (ماہنامہ ''برہان'' جون 1981ء)

2- سید محمد الحسنی ''سیرت مولانا سید علی مون گیری'' 1964ء، مکتبہ ندوۃ لکھنؤ، ص: 119

''اصلی مقصد اس مدرسے کا مسلمانوں کی مذہبی اور دنیوی تعلیم ہے، اور بوقت توسیع مذہبی تعلیم کو مقدم رکھا جائے گا۔''[3]

ظاہر ہے کہ جس مدرسہ کا مقصد مسلمانوں کی مذہبی اور دینوی تعلیم دونوں ہو، اس کے نصاب تعلیم سے سائنس و ٹکنالوجی کے علوم کو غیر متعلق کیونکر کہا جاسکتا ہے۔ دارالعلوم دیوبند میں آج بھی تعلیم کے علاوہ معاشی مقاصد کے لئے طلبہ کو خطاطی، خیاطی اور جلد سازی وغیرہ صنعتیں بھی سکھلائی جاتی ہیں۔[4] مدرسہ الاصلاح کے دور اول میں بھی وہاں اس طرح کی صنعتوں کو عملی طور پر (Practical) اختیار کرلیا گیا تو نظری (Theoretical) طور پر اسے اختیار کرنے میں تامل کیونکر ہو سکتا ہے۔

نئے علوم سے دوری کی بنیادی وجہ

مدارس کے نظام میں نظری طور پر سائنس و ٹکنالوجی اور نئے علوم کی پوری گنجائش کے باوجود عملی طور پر یہ علوم ان کے نصاب تعلیم کا جزو نہ بن سکے۔ اس کی وجہ کوئی ذہنی و فکری رکاوٹ نہیں۔ بلکہ اس کا تعلق خالص حکمت عملی اور لائحہ عمل سے ہے۔ اس کے لئے ہمیں خاص طور پر دارالعلوم دیوبند کے نصاب تعلیم کا مطالعہ کرنے کی ضرورت ہے۔ جس میں اس مسئلہ پر بڑی سیر حاصل گفتگو کی گئی ہے۔ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ، مدارس کے قیام سے مسلمانوں کی زندگی کے جس خلاء کو پر کرنا مقصود ہے، اصلاً توجہ اسی پر مرکوز رہنی چاہیے۔ مزید برآں ایک وہی وقت میں مختلف مقاصد کا حصول بسا اوقات شخصیت کو منتشر کرنے اور ''طلب الکل فوت الکل''، کا مصداق ہے۔

قابل عمل صورت

مدارس اور سائنسی تعلیم کی نسبت سے قابل عمل صورت یہی مناسب نظر آتی ہے کہ مدارس کا اصل موضوع اور مرکز توجہ تو خالص دینی علوم قرآن و حدیث اور فقہ و کلام وغیرہ کو ہی ہونا چاہئے۔ ضمنی

3- مدرسہ الاصلاح ''دستور العمل 31/دسمبر 1928ء''، سرائے میر، اعظم گڑھ

4- ''تاریخ دیوبند''، ص: 439

طور پر زمانہ کے رجحانات سے ہم آہنگ رکھنے کے لیے اگر مدارس کی ترجیحات اجازت دیں تو سائنس کے نظری مباحث کے لئے کچھ وقت مختص کیا جاسکتا ہے۔اس کا فیصلہ بھی حالات کے لحاظ سے ہی ہو گا کہ یہ تعلیم کتابوں کے ذریعہ ہو یا مختلف اوقات میں لیکچرز وغیرہ کے ذریعہ اس کی تلافی کی جاسکتی ہے۔

مدارس دینیہ کے ساتھ اصل خیر خواہی یہ ہے کہ ان کے جو اپنے موضوعات اور ترجیحات ہیں ان کی بہتری اوران کو زیادہ سے زیادہ مؤثراور مفید بنانے کی تدابیر اختیار کی جائیں۔اوراس کے لیے مدارس کے موجودہ نظام میں جزوی ترمیمات کافی ہیں۔ مرکز فروغ سائنس وغیرہ جیسے اداروں کو مدارس میں سائنسی تعلیم کے اجراء کے بجائے اردو زبان میں سائنس وریاضی وغیرہ کے نئے نصاب وغیرہ کی تیاری پر زیادہ کوششیں صرف کرنے کی ضرورت ہے۔

شاہ ولی اللہ اورینٹل کالج:

مذہبی و عصری علوم کا ایک ماڈل ادارہ جس پر پابندی لگادی گئی

پروفیسر سید محمد سلیم

مولانا شفیع محمد مرحوم ایک درد مند مسلمان تھے۔ خلافت تحریک، خاکسار تحریک اور پاکستان تحریک میں حصہ لے چکے تھے۔ آخر میں جماعت اسلامی میں شریک ہوگئے تھے۔ مولانا مرحوم نے چوہدر ی غلام محمد مرحوم (وفات:جنوری1970ء) کے ساتھ مل کر 1954ء میں "ادارہ تعمیر ملت" قائم کیا۔ اس ادارہ کو انہوں نے اپنی تین سو ایکڑ زمین دے دی۔ یہ زمین ہالہ(صوبہ سندھ) سے چھ میل کے فاصلہ پر ڈیپر نامی گوٹھ میں واقع ہے۔ وہاں ایک دارالعلوم قائم کیا گیا۔مگر چل نہ سکا۔ پروفیسر سید محمد سلیم نے 1961ء میں اس کا نام "منصورہ" کر دیا۔ پھر وہاں "شاہ ولی اللہ اورینٹل کالج " قائم ہوا(15 نومبر 1959ء)۔یہ کالج 13 سال تک بہار دکھا کر عوامی مارشل لاء ایڈمینسٹریٹر ذوالفقار علی بھٹو کے ظلم(1972ء) کا شکار ہوگیا۔ پروفیسر سید محمد سلیم اس کے پرنسپل رہےہیں۔اس مضمون میں کالج میں نافذ نظام تربیت کی تفصیلات پیش کی گئی ہیں۔یہ مضمون پہلے 'انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی سٹڈیز' میں شائع ہوا۔

اس کالج میں داخلہ کے لئے ضروری تھا کہ ،امیدوار طالب علم پرائمری پاس ہو اور قرآن مجید ناظرہ پڑھا ہوا ہو۔ بعض طلبہ یہ شرائط پوری نہیں کرتے تھے۔ ان کے والدین داخلہ پر بھی مصر ہوتے تھے۔ایسے طلبہ کو ابتدائیہ کی صف میں پڑھایا جاتا تھا۔ثانویہ درجات کا نصاب تعلیم، کالج انتظامیہ کا ساختہ پرواختہ تھا۔ ہر سال اس پر غور ہوتا تھا اور تغیر و تبدل ہوتا تھا۔اس طرح مسلسل کوششوں سے ایک موزوں اور مفید نصاب تعلیم تیار ہو گیا تھا۔

کالج میں عالیہ کے عربی اور انگریزی درجات دونوں درجات تھے اور دونوں کے نصابات بورڈ آف سیکنڈری انڈانٹر میڈیٹ ایجوکیشن اور سندھ یونیورسٹی، حیدرآباد کے منظور کردہ تھے۔ جن کو کالج نے قبول کر لیا تھا۔البتہ عربی نصاب میں ایک پرچہ فہم دین کا کالج نے اپنی جانب سے اضافہ کر دیا تھا۔وہ

طلبہ کو پڑھایا جاتا تھا۔ انگریزی نصاب میں صرف انگریزی کے دو پرچے پڑھ کر امتحان دینے پر سند مل سکتی تھی۔ مگر ہم نے اپنے طلبہ کو آرٹس کے تمام مضامین میں امتحان دلانا پسند کیا۔ اس طرح ہمارا کورس بھاری ہو گیا تھا۔

طلبہ کے والدین کا اصرار تھا کہ ،ان کے بچے عربی کے ساتھ انگریزی بھی ضرور پڑھیں۔ ان کے بچوں کے ساتھ میں سرکاری تسلیم شدہ اسناد ہونا چاہئیں تاکہ حصول ملازمت میں کوئی رکاوٹ نہ ہو۔ اس وجہ سے کالج انتظامیہ کو و سرکاری نصاب پورا کا پورا قبول کرنا پڑا اور وہ تعلیم کی دوئی کو ختم کر کے مربوط اور متحدہ نصاب پیش کرنے سے قاصر رہی۔ تاہم کالج نے دوسرے ذرائع سے نقائص اور خامیوں کو دور کرنے کی بھرپور کوشش کی گئی۔

مضامین تدریس:

"عالیہ" اور "ثانویہ" کے درجات میں درج ذیل مضامین کی تدریس ہوتی تھی:

1. قرآن مجید
2. حدیث شریف
3. عقائد و کلام
4. فقہ
5. فہم دین
6. منطق و فلسفہ
7. صرف و نحو
8. عربی ادب و انشاء
9. اردو-سندھی
10. انگریزی
11. ریاضی

12. جنرل سائنس

13. معاشرتی علوم

14. ڈرائنگ

15. ورزش

16. محنت کاری

تربیت گاہ

شاہ ولی اللہ اورینٹل کالج، منصورہ(سندھ) ایک ’’رہائشی اور اقامتی درس گاہ‘‘ تھا۔ جس کا آغاز(1960ء) میں 6 طلبہ سے ہوا تھااور آخر 1973ء میں طلبہ کی تعداد 300 کے قریب ہو گئی تھی۔ جن میں بعض طلبہ غیر ملکی بھی تھے۔

اقامت گاہ کو یہاں ’’تربیت گاہ‘‘ کہتے تھے۔ یہ اس لیے تھا کہ تربیت کا بلند مقصد ہر وقت اساتذہ اور طلبہ کے پیش نظر رہے۔اور غیر شعوری طور پر اذہان تربیت قبول کرنے پر آمادہ رہیں۔ یہاں اس امر کی تربیت دی جاتی تھی کہ طلبہ بامقصد زندگی گزارنے کی عادت ڈالیں۔ زندگی کی تمام جد وجہد کا مقصود اللہ تعالی کی رضا اور خوشنودی کو قرار دیں۔اس کے لیے اسلامی اعمال، اسلامی اخلاق اور اسلامی آداب اختیار کریں۔ یہاں کے منتظمین کے پیش نظر تربیت کا وسیع تصور تھا۔ جو زندگی کے تمام اعمال واحوال پر حاوی تھا۔ یہاں طلبہ کی ہمہ پہلو اور ہمہ جہت تربیت ر توجہ دی جاتیتھی۔ اس مقصد کے حصول کے لیے مختلف تدابیر اور مختلف طریقے اختیار کیے جاتے تھے۔ ترغیب اور مسابقت کے طریقہ کار کو اہمیت دی جاتی تھی، اس بات کو فوقیت دی جاتی تھی کہ، طلبہ خود اپنے جذبہ اور شوق سے کام کریں۔

تربیت گاہ کا ماحول

اس کے لیے یہ بات ضروری خیال کی جاتی تھی کہ طلبہ کا اپنی درس گاہ سے اور اپنے اساتذہ سے قلبی لگاؤ اور محبت ہو، تب ہی تو وہ درس گاہ کے پیش نظر مقاصد کو خوش دلی سے قبول کریں گے۔ اس طرح

یہ بات بھی ضروری خیال کی جاتی تھی کہ اساتذہ خوش اخلاق اور حسن کردار کے حامل ہوں اور ان کے طرز عمل میں کشش ہو۔ اس بات کو بھی اہمیت دی جاتی تھی کہ، درس گاہ کا ماحول ستھرا اور خوش منظر ہو۔ خوش منظر بنانے میں طلبہ کا اپنا فاضلانہ کردار بھی شامل ہو۔ تب ہی تو وہ اس سے محبت کریں گے۔ اساتذہ بھی طلبہ کے ساتھ برابر لگے رہتے تھے نہ تھکتے تھے اور نہ چھٹی لیتے تھے۔ سب ایک ہی نظریہ، ایک ہی سوچ اور ایک ہی ذہنیت کے حالم تھے۔ کھیتوں کے درمیان کالج کی عمارات دور سے نظر آتی تھیں۔ رہائشی کمروں کے سامنے کی تختے چمن کے تھے۔ چمن کی نگہداشت پر اگرچہ باغبان مقرر تھا، پھر بھی طلبہ باغبانی میں حصہ لیتے تھے۔ وسط میں مسجد نمایاں تھی۔ ساری عمارات کچی اور نیم پختہ تھیں۔ گاؤں کے ماحول سے کوئی تضاد نہیں تھا۔

فرائض اور ذمہ داریاں

تربیت گاہ میں رہنے والے ہر شخص پر یکساں فرائض اور پابندیاں عائد تھیں۔ خواہ اساتذہ ہوں، طلبہ ہوں یا ملازمین ہوں۔ نماز کے لیے مسجد میں آنا سب کے لیے ضروری تھا۔ بلتستان کے ایک شیعہ طالب علم نے وہاں داخلہ لے لیا تھا، وہ بھی مسجد کے ایک گوشے میں اپنے طریقہ پر نماز پڑھتا تھا۔ پان بیڑی، سگریٹ اور حقہ کی جو پابندی طلبہ پر عائد تھی وہی اساتذہ پر بھی عائد تھی اس لیے سارے ماحول میں یک رنگی کی فضا تھی، تضاد نہیں تھا۔

ارشاد و رہنمائی کے طریقے

تربیت و رہنمائی کے لیے تلقین و ارشاد کے طریقے اور کئی تدبیریں اختیار کی جاتی تھیں:

ا) خاموش تبلیغ: تربیت گاہ میں آیات قرآن، احادیث، آداب اسلامی، موزوں اشعار پر مشتمل خوش خط لکھے ہوئے طغرے، کتبے اور چارٹ، کمروں میں اور نمایاں مقامات پر آویزاں ہوتے تھے۔ آتے جاتے طلبہ کی نظریں ان پر پڑتی رہتی تھیں۔ غیر شعوری طور پر یہ تعلیمات ذہن میں نقش ہوتی رہتی تھیں۔ گویا کہ یہ خاموش تبلیغ تھی۔

ب)درس قرآن: روزانہ مغرب کی نماز کے بعد 15 منٹ کے لیے مسجد میں درس قرآن مجید ہوتا تھا۔ جس میں سارے طلبہ شریک ہوتے تھے۔ان کے سامنے عام فہم زبان میں قرآن کے مطالب بیان کیے جاتے تھے۔

ج)خطاب صباحی: کالج کی تدریس کا آغاز ہونے سے قبل تمام طلبہ ایک جگہ جمع ہو جاتے تھے۔عالیہ علیحدہ،ثانویہ علیحدہ۔ان کے سامنے ایک استاد دینی، دینوی، معلوماتی وغیرہ کسی موضوع پر مختصر تقریر کرتا تھا۔یہ گویا اس دن کی غذا تھی۔ثانویہ کے معیار کے لحاظ سے جداگانہ تقریر ہوتی تھی،اور عالیہ کے معیار کے لحاظ سے جداگانہ تقریر ہوتی تھی۔اساتذہ اپنے مطالعہ کا نچوڑ وہاں پیش کرتے تھے۔طلبہ ان خطابات کو بڑے شوق سے سنتے تھے۔

انتظامی صلاحیتوں کی جلابخشی

کام کرنے سے کام آتا ہے۔مختلف صلاحیتوں کو ابھارنے کے لیے ضروری ہے کہ ،انسان ہر قسم کے کام کرے۔اس لیے تربیت گاہ میں طلبہ ہر قسم کے کام کرتے تھے۔اس سے ان کے اندر نہ صرف خود کام کرنے کی صلاحیت پیدا ہوتی تھی، خود اعتمادی پیدا ہوتی تھی، بلکہ قائدانہ صلاحیت بھی ابھرتی تھی۔ مستقل مزاجی، صبر و تحمل کی صفت پیدا ہوتی تھی۔ طلبہ تمام کام کرتے تھے اور بڑے ذمہ دارانہ انداز میں انجام دیتے تھے۔ذیل کے انتظامی امور طلبہ سرانجام دیتے تھے۔

- **عریف کمرہ**: ایک کمرہ میں چار پانچ طالب علم رہتے تھے، ان میں سے ایک طالب علم ''عریف'' مقرر کر دیا جاتا تھا۔وہ کمرہ میں صفائی ستھرائی، نظم وضبط اور خاموشی کو قائم رکھتا تھا۔صفائی کے لیے باریاں مقرر کرتا تھا، باہمی جھگڑے طے کرتا تھا۔ معاملہ زیادہ بڑا ہو تو پھر ناظم تربیت گاہ کے سامنے پیش کرتا تھا۔
- ناظم صلاۃ: ناظم صلاۃ مسجد اور نماز سے متعلق تمام ذمہ داریاں ادا کرتا تھا۔ مختلف کاموں کے لیے مختلف طلبہ مقرر کرتا تھا۔ان کے درمیان باریاں مقرر کرتا تھا۔وضو خانہ کے حوض کو پانی سے بھرنے کے لیے ہینڈ پمپ چلانے کے لیے دس دس لڑکوں کی باریاں مقرر کرتا تھا۔ بجلی

آجانے کے بعد (1968ء) یہ باریاں ختم ہو گئیں تھیں۔ حفاظ طلبہ کی باریاں مقرر کرتا تھا کہ وہ ایک ایک ہفتہ کے لیے پنج وقتہ امامت کے فرائض انجام دیں۔ ختم نماز کے بعد وہ طلبہ کی حاضری لیتا تھا۔ ناظم صلاۃ جب یہ جملہ زبان سے ادا کرتا تھا کہ، ثبت الا جر انشاءاللہ (اجر انشاءاللہ متعین ہوا۔ حدیث) تب طلبہ مسجد سے باہر جاتے تھے۔

- ناظم خوراک: باورچی خانہ کا عملہ کھانا تیار کر دیتا تھا۔ اب کھانا کھلانا طلبہ کی ذمہ داری ہوتا تھا۔ ناظم تیرہ، چودہ لڑکوں کی ٹیم کے ساتھ دارالطعام میں جاتا۔ کھانا میزوں پر لگواتا۔ تب گھنٹی بجائی جاتی۔ طلبہ اپنی اپنی جگہ بیٹھ کر کھانا کھاتے۔ کھانا سب کو کھلا دینے کے بعد ناظم خوراک اپنے خادموں کے ساتھ آخر میں کھانا کھاتا تھا۔ وہ لوگ کھڑے رہ کر کھانا کھلاتے تھے۔
- ناظم روشنی: تربیت گاہ میں طلبہ لالٹین جلاتے تھے۔ ناظم روشنی ان کو روزانہ تیل تقسیم کرتا تھا۔ (1968ء کے بعد بجلی آگئی تھی)۔
- ناظم صحت و صفائی: سارے تربیت گاہ کی صفائی اس کی ذمہ داری ہوتی تھی۔ بھنگی اس کی نگرانی میں صفائی کرتا تھا۔ گندے مقامات پر اور جہاں پانی جمع ہو جاتا ہے وہاں فنائل اور ڈی ڈی ٹی پاؤڈر چھڑکواتا تھا۔ بیمار بچوں کے لیے پرہیزی کھانا تیار کراتا تھا، تربیت گاہ میں دو بستروں کا بیمارستان (ہسپتال) تھا، جہاں زیادہ مریض طلبہ رہتے تھے۔ ان کی نگہداشت کرتا تھا۔ ان کے لیے تیماردار طلبہ مقرر کرتا تھا۔
- ناظم تعلیم: ظہر کے بعد اور عشاء کے بعد طلبہ اپنے اپنے کمروں میں مطالعہ کرتے تھے۔ ناظم تعلیم چکر لگا کر دیکھتا تھا کہ، طلبہ پڑھائی میں مشغول ہیں؟ تعلیم میں کمزوری دور کرنے کے لیے ایک اتالیق (ٹیوٹر) مقرر تھا۔ ناظم تعلیم دیکھتا تھا کہ، کمزور طلبہ اتالیق کے پاس جاتے ہیں؟ تقریری مقابلے؛ معلوماتی مقابلے اور بیت بازی کی محفلیں منعقد کرانا بھی ناظم تعلیم ہی کا کام ہوتا تھا۔
- ناظم کھیل: طلبہ کھیل ایک استاد کی رہنمائی میں کھیلتے تھے۔ ناظم کھیل استاد کا معاون ہوتا تھا۔ کھیل کا سامان رکھتا تھا۔ منصورہ میں فٹ بال، ہاکی، کبڈی، کشتی وغیرہ کے کھیل کھیلے جاتے

تھے۔ چھوٹے بچوں کے کھیل دوسرے ہوتے تھے۔ ہر طالب علم سے توقع کی جاتی تھی کہ، وہ کھیلوں میں حصہ لے۔

- **ناظم محنت کاری:** مختلف صفوں کے طلبہ باری باری چمن میں پودوں اور درختوں کی صفائی اور نگہداشت کرتے تھے، باغبانی کرتے تھے۔

اتنے سارے مختلف کام طلبہ چلاتے تھے۔ اساتذہ محض ان کی نگرانی کرتے تھے۔ اس طرح ان کی صلاحیتیں جلا پاتی تھیں۔ ان کے اندر خود اعتمادی کی صفت پیدا ہوتی تھی۔ قائدانہ صلاحیت پروان پڑھتی تھی۔ استقلال اور صبر و تحمل کی عادت نمو پاتی تھی۔

علمی ذوق کی آبیاری

مختلف نوعیت کی علمی سرگرمیاں سارا سال جاری رہتی تھیں۔ طلبہ ان میں حصہ لیتے تھے۔ اس سے ان کی صلاحتیں پروان چڑھتی تھیں۔ علمی ذوق بیدار ہوتا تھا۔ پھر بعض ان میں سے نمایاں مقام حاصل کر لیتے تھے۔

- **خطابات:** باہر سے اگر کوئی اہل علم کالج آتا تو اس سے درخواست کی جاتی تھی کہ وہ طلبہ کو خطاب کرے اور اپنے علم ے فائدہ پہنچائے۔
- **تقریری مباحثات:** ایک موضوع پر طلبہ موافق اور مخالف فریق بن کر تقریریں کرتے تھے۔ مشق بہم پہنچاتے تھے۔ ایک استاد رہنمائی کرتا تھا۔
- **بیرونی مباحثات میں شرکت:** دوسری تعلیم گاہوں سے مباحثات میں شکت کی دعوتیں آتی تھیں۔ اکثر طلبہ ان میں شرکت کرتے تھے۔ استاد تقاریر تیار کرانے میں رہنمائی کرتے تھے۔ پھر ان کو لے کر دوسرے کالجوں میں جاتے تھے۔ بسا اوقات کامیاب ہو کر آتے تھے۔
- **مقابلہ معلومات:** یہ اس کالج کی جدت تھی، اور ٹی وی میں از قسم نیلام گھر و ذوق آگہی کے اجراء سے پہلے یہ مقابلہ اس کالج میں جاری تھا۔ دو پارٹیوں کے درمیان معلومات کا مقابلہ ہوتا

تھا۔ ہر فریق کو تین تین سوالات پوچھنے کی اجازت ہوتی تھی۔ سوالات نگران کو پیشگی پہنچانا ضروری تھا۔ جواب کے لیے صرف تین منٹ کا وقفہ ہوتا تھا۔ اس طریقہ کار سے طلبہ میں ذوق مطالعہ کو فروغ دینا مقصود تھا۔

- بیت بازی: طلبہ میں صحیح تلفظ، درست ادائیگی اور شعر فہمی کا ذوق پیدا کرنے کے لیے بیت بازی کو فروغ دیا گیا تھا۔ اس میں اساتذہ بھی شریک ہوتے تھے۔ اس کی محفلیں اکثر رات کو منعقد ہوتی رہتی تھیں۔ یہ اس بزم کا فیضان تھا کہ جو لوگ اردو زبان کا ایک لفظ نہیں جانتے تھے، وہ بعد میں فصیح اللسان مقرر ہو گئے اور سینکڑوں اشعار ان کو یاد ہو گئے۔
- مشاعرہ: گاہے گاہے مشاعرہ بھی منعقد ہوتا تھا، جس میں بیرونی شعراء بھی شرکت کرتے تھے۔
- شام منصورہ: جب کوئی علمی یا ادبی معروف شخصیت کالج میں آتی تھی، تو طلبہ اس کے ساتھ ایک شام مناتے تھے جس میں بے تکلف گفتگو ہوتی تھی۔ یہ طلبہ کے علم میں اضافہ کا سبب بنتی تھی۔
- دار المطالعہ: تقریباً ہر رواق (بلاک) میں طلبہ نے اپنے لیے ایک لائبریری قائم کر رکھی تھی جہاں سے دوسرے طلبہ کو مطالعہ کے لیے کتابیں اجراء ہوتی ہیں۔ رواق کے مابین یہ صحت مند مسابقت تھی۔
- ریڈیو: خاص خاص خبریں اور تعلیمی پروگرام طلبہ کو سنائے جاتے تھے۔ حرمین شریفین کی کی قرات طلبہ بڑے شوق سے سنتے تھے۔

دیوار گیر صحافت

طلبہ میں تحریر کا ذوق پیدا کرنے کی ہر طرح ہمت افزائی کی جاتی تھی، اس کے وہاں کئی مظاہرے تھے۔ طلبہ اخبارات اور رسالے نکالتے تھے۔

دیوار گیر اخبار: طلبہ کاغذ کے پورے تختہ پر اخبار تیلار کر کے دیوار پر ایک مخصوص جگہ چسپاں کر دیتے تھے۔اخبار کا نام مستقل نام ہوتا تھا۔ سرخیاں لگائی جاتی تھیں، خبریں ہوتی تھیں اداریہ لکھا جاتا تھا۔ صحافت آزاد تھی ہر شخص جس زبان میں چاہے اخبار نکال سکتا تھا اردو، سندھی، پنجابی، پشتو، انگریزی اور عربی زبانوں میں اخبارات نکلتے تھے۔ سال بھر طلبہ پرچے نکالتے رہتے تھے۔ کبھی کم کبھی زیادہ۔ مدیر اپنے پرچے جمع رکھتا تھا۔ سال کے آخر میں تقریبات کے موقع پر صحافت کا نگران استاد ان پرچوں کو دیکھتا تھا۔ نمبر دیتا تھا جس کو سب سے زیادہ ملتے تھے وہ انعام کا مستحق قرار پاتا تھا۔

رسالہ: بعض دو دو تین تین طلبہ مل کر رسالہ بھی نکالتے تھے۔ عام طور پر یہ ایک کاپی پر مشتمل ہوتا تھا۔

مضامین نویسی: اس اخبار نویسی سے حوصلہ پاکر بعض طلبہ ملکی رسالوں میں لکھنا شروع کر دیتے تھے۔ان پرچوں کی بدولت بعض طلبہ صحافی بن گئے۔

طلبہ کی انجمنیں

طلبہ کی اپنی انجمنیں تھیں، جن کو وہ خود آزادانہ طور پر چلاتے تھے۔

اسلامی جمعیت طلبہ (قائم شدہ، دسمبر 1947ء): کالج میں یہ سب سے اہم انجمن تھی۔اس کا وسیع کام تھا۔اس کے پاس دفتر تھا۔اس کے اجتماعات باقاعدگی سے ہوتے تھے۔

النادی العربی: عربی زبان میں گفتگو کرنے کی مشق کرنے کے لیے یہ انجمن قائم کی گئی تھی۔ طلبہ خود ہی اس کو چلاتے تھے۔

بزم ادب: طلبہ کی یہ انجمن ادبی مشاغل کے لیے تھی۔

طلبہ کے مشغلے

بہت سے طلبہ تفریحی مشغلے رکھتے تھے۔ بعض ٹکٹ(Stamps) جمع کرتے تھے۔ بعض

سکے (Coins) جمع کرتے تھے۔ ماچس کے لیبل جمع کرتے تھے۔ خوبصورت پتھر جمع کرتے تھے۔ خوبصورت پر (Feather) جمع کرتے تھے۔ مختلف ملکوں کے جھنڈے (Flags) جمع کرتے تھے۔ مختلف رسائل جمع کرتے تھے۔ اس سے ذوق جستجو کو تقویت ملتی ہے۔ کالج ان کی ہمت افزائی کرتا تھا۔ ایسے طلبہ اپنی اپنے نوادرات کا اہتمام کرتے تھے۔ سب لوگ اس کو دیکھتے تھے۔

تفریحی اور تاریخی سفر

نوخیز طلبہ کے لیے تفریح بہت ضروری ہے۔ تفریح سفر میں صرف فرصت و مسرت ہی نہیں مشاہدہ اور معلومات میں اضافہ ہوتا ہے۔ اس لیے گاہے گاہے کالج انتظامیہ اس قسم کے تفریحی پروگرام طے کرتی تھی۔ استاد ساتھ ہوتے تھے۔

پکنک: سہانے موسم میں طلبہ نہر کنارے یا کسی باغ میں جاکر پکنک مناتے تھے۔ کھانے کا انتظام بھی وہیں کیا جاتا تھا۔

تفریحی سفر: بعض اوقات طلبہ استاد کی نگرانی میں ہوائی اڈوں، کارخانوں اور ملوں کا مشاہدہ کرنے جاتے تھے۔

تاریخی سفر: بعض اوقات طلبہ تاریخی مقامات کی سیر کے لیے جاتے تھے جیسے موہن جوداڑو، دیبل، منصورہ، ٹھٹھہ وغیرہ۔

تربیتی سوالنامہ

اصلاح و تربیت کی مختلف کوششیں اور سرگرمیاں سارا سال جاری رہتی تھیں۔ ان کوششوں کے نتیجے میں طلبہ نے جو اثرات قبول کیے ہوں، ان کو معلوم کرنا اور ان کا جائزہ لینا ایک مشکل کام ہے۔ سالوں غور و خوض کے بعد کالج انتظامیہ نے اس کے لیے تربیتی سوالنامہ مرتب کیا تھا۔ ایک سوالنامہ درجات ثانویہ کے طلبہ کے لیے تھا۔ اور دوسرا سوالنامہ درجات عالیہ کے طلبہ کے لیے تھا۔ یہ کھے سوالنامے تھے، جو سارا سال درس گاہ کے مختلف مقامات پر آویزاں رہتے تھے۔ یہ طلبہ کو یاد دہانی کراتے رہتے

تھے کہ، کن کن اوصاف میں ان کا جائزہ لیا جارہا ہے، جس کی انہیں تیاری کرنی چاہیے۔اس طرح ایک لحاظ سے سارا سال طلبہ اپنا احتساب خود ہی کرتے رہتے تھے۔ اور اپنا طرز عمل زیادہ سے زیادہ ان سوالناموں کی روح کے مطابق بناتے رہتے تھے۔ذاتی اصلاح کا یہ بھی ایک خاموش اور مؤثر ذریعہ تھا۔سوالنامے یہ تھے:

عبادات

- کیا آپ مسجد میں اقامت سے پہلے پہنچتے ہیں؟
- کیا سنتیں پابندی سے پڑھتے ہیں؟
- کیا نماز سکون اور اطمینان سے ادا کرتے ہیں؟
- کیا باقاعدگی سے قرآن مجید کی تلاوت کرتے ہیں؟

آداب معاشرت

- کیا سلام کرنے میں سبقت حاصل کرتے ہیں؟
- کیا استادوں اور بڑوں کا ادب کرتے ہیں؟
- کیا کھانے پینے، نشست و برخاست، گفتگو اور معاملات میں ضروری آداب کا خیال رکھتے ہیں؟
- کیا اسلامی وضع قطع اور لباس کی پابندی کرتے ہیں؟
- کیا مختلف مواقع کی ضروری دعائیں یاد کرتے ہیں؟

اخلاق وعادات

- کیا ہم جماعت طلبہ اور تمام ساتھیوں سے اچھا برتاؤ کرتے ہیں؟
- کیا دوسرے کے کاموں میں ہاتھ بٹاتے ہیں؟
- کیا اپنے ساتھیوں کو نیکی پر ابھارتے اور برائی سے روکتے ہیں؟

- دوست احباب کن کن عادات واطوار کے حامل ہیں ؟
- فراغت کے اوقات میں کیا کرتے ۃیں، کیاپڑھتے ہیں ؟
- کیا جھوٹ، چوری، بدکلامی اور ضد سے پرہیز کرتے ہیں ؟

احساس ذمہ داری

- کیا پابندی سے سبق اور آموختہ دیکھتے ہیں اور درسی کام پورا کرتے ہیں ؟
- کیاصباحی خطبات میں وقت پر حاضر ہوتے ہیں ؟
- درجہ میں بلاوجہ تو غیر حاضر نہیں ہوتے ؟
- کیا تعطیلات کے بعد وقت پر درس گاہ میں پہنچ جاتے ہیں ؟
- کیا غیر نصابی مشغولیات میں شوق سے حصہ لیتے ہیں۔ مثلاً تقاریر، اجتماعات، کھیل وغیرہ؟
- کیا دوسروح کی اشیاء بلا اجازت تو استعمال نہیں کرتے ؟

صفائی اور سلیقہ

- کیا وضو اور طہارت کے ضروری احکام پر عمل کرتے ہیں؟
- کیا جسمانی صفائی کرتے ہیں؟ مثلاً غسل کرنا، بال ترشوانا، ناخن ترشوانا، دانت صاف رکھنا۔ بالوں میں تیل ڈالنا کنگھا کرنا وغیرہ۔
- کیا لباس، صاف ستھرا اور معقول پہنتے ہیں؟
- کیا اپنا سامان ترتیب سے رکھتے ہیں؟ ماحول کو صاف ستھرا رکھنے کی کوشش کرتے ہیں؟

سال کے آخر میں ناظم تربیت گاہ، استاد درجہ، استاد کھیل اور دوسرے متعلقہ استذہ جمع ہو کر ایک ایک طالب علم کا سال بھر کا کردار سامنے رکھ کر اس سوالنامے کے مطابق اس کو نمبر دیتے تھے۔ کم از کم چالیس فیصد نمبر حاصل کرنے والا طالب علم پاس ہوتا تھا، ورنہ فیل۔ اور اس پرچہ میں فیل طالبعلم کو اگلے درجہ میں ترقی نہیں دی جاتی تھی۔ درجہ اول میں پاس ہونے والے کو 'جید'، درجہ دوئم میں پاس

ہونے والے کو 'حسن'، درجہ سوم میں پاس ہونے والے کو 'مقبول' اور ناکام ہونے والے طالب علم کو 'ردیء' کہتے تھے۔

سالانہ تقریب

سال میں ایک مرتبہ موسم بہار میں ایک ہفتہ تک سالانہ تقریبات منائی جاتی تھی، ہفتوں پہلے اس کی تیاری شروع کی جاتی تھی۔ کالج کے مختلف ادارے صفائی اور آرائش میں مشغول ہو جاتے تھے۔ طلبہ کی ورزشی کھیلوں میں اور تقاریروں کے مقابلے ہوتے تھے۔ تقریریں اردو، سندھی، انگریزی اور عربی زبان میں کی جاتی تھیں۔ باہر سے اہل علم کو صدارت کے لیے مدعو کیا جاتا تھا۔ سال بھر کی کارگزاری ایک نظر میں دیکھنے کا اچھا موقع ہوتا تھا۔ لڑکوں کے والدین اور سابق طلبہ کثیر تعداد میں آتے تھے۔ سال بھر کی ہر نوع کی سرگرمیوں کا انعام اس موقع پر دیا جاتا تھا۔

- علم کا تمغہ زریں (نصف تولہ سونا) ''چوہدری غلام محمد مرحوم'' سے موسوم تھا۔ وہ تعلیمی کاموں میں امتیازی حیثیت حاصل کرنے والے طالب علم کو دیا جاتا تھا۔
- کردار کا تمغہ زریں (نصف تولہ سونا) ''مولانا شفیع محمد نظامانی'' سے موسوم تھا۔ یہ تمغہ کردار اور سیرت کے اعتبار سے کالج کے مقبول ترین طالب علم کو دیا جاتا تھا۔
- تمغہ ورزش۔ بہترین کھلاڑی کو دیا جاتا تھا۔

اس موقع پر مولوی فاضل میں کامیابی حاصل کرنے والے طلبہ کو کالج کی جانب سے اسناد تقسیم ہوتی تھیں۔ جو عربی زبان میں دیدہ زیب طبع شدہ ہوتی تھیں۔

دار الکتب

کالج میں دو چیزیں قابل دید تھیں۔ ایک دار الکتب دوسرا دار الآثار۔ کالج کے مکتبہ میں بارہ ہزار کتابیں تھیں۔ عربی، فارسی، اردو، سندھی اور انگریزی زبانوں میں۔ 450 کے قریب قلمی مخطوطے (Manuscripts) تھے۔ جن میں بعض بڑے نادر تھے۔ کتب خانے میں اخبارات اور

رسائلو غیرہ کا عمدہ ذخیرہ تھا۔ بعض سو سو سال پرانے تھے۔ کتب خانے میں تحریک مجاہدین خلافت تحریک، خاکسار تحریک، مسلم لیگ، جمعیت العلماء، احرار "تحریک پاکستان" اور جماعت اسلامی سے متعلق کتابوں کا بڑا قیمتی ذخیرہ تھا۔ یہ کتب خانہ احباب اور کرم فرماؤں کا عطیہ تھا۔ ایک ایک ذرہ جمع کیا گیا تھا۔

دارالآثار

کالج میں دارالآثار کے نام سے ایک مختصر سا دارالنوادر عجائب خانہ تھا، جس میں ہزاروں سکے، آثار قدیمہ کی اشیاء اور اسلحہ وغیرہ، بہت سی اشیاء تھیں جن میں خصوصی اہمیت کی قابل ذکر یہ ہیں۔

- عباسی خلیفہ بغداد منصور (772ء/158ء) کا دینار۔
- پرتھوی راج (581ء/1193ء) کا سکہ جو تانبہ اور چاندی کا ملا جلا تھا۔
- بابر بادشاہ کا فرمان جو 1537ء/933ء کا ہے۔
- زرہ بکتر اور تلواریں۔

یہ واحد کالج تھا جس میں ایک دارالآثار تھا۔ یہ ملک کا واحد دارالآثار تھا جو پرائیویٹ ذرائع سے قائم کیا گیا۔ اور بیشتر احباب کے عطیات پر مشتمل تھا۔ جن کو بڑی محنت اور جستجو سے جمع کیا گیا تھا۔

دلی جو اک شہر تھا عالم میں انتخاب
رہتے تھے منتخب ہی جہاں روزگار کے
اس کو فلک نے لوٹ کے ویران کر دیا
ہم رہنے والے ہیں اسی اجڑے دیار کے

'مدرسہ ڈسکورسز' کا تعارف واہداف

حافظ محمد رشید

'مدرسہ ڈسکورسز' پاکستان اور بھارت کے روایتی دینی مدارس کے منتخب طلبہ کے لیے شروع کیا گیا ایک پروگرا م تھا جس کی قیادت دونوں ممالک میں معتبر علمی شخصیات کر رہی تھیں۔ جب یہ پروگرام شروع ہوا تو اِس پر بہت زیادہ اعتراضات کیے گئے،تنقید کا نشانہ بھی بنایا گیا اور اور یہاں تک کہہ دیا گیا کہ یہ مغربی فکر کی ترویج کا راستہ ہے۔مگر اس کورس کا حصہ بننے والے شرکاء سمیت درجنوں مستند علمی شخصیات نے اس پر اعتماد کا اظہار کیا اور اس سے بخوبی استفادہ کیا گیا۔فی الحال تو اس پروگرام کی نئی کلاسز نہیں ہو رہیں، البتہ یہ پلیٹ فارم علمی حوالے سے اب بھی کچھ نہ کچھ سرگرم ہے۔مدرسہ ڈسکورسز کیا ہے اور اس کے کیا اہداف ہیں، اس مضمون میں بتایا گیا ہے۔حافظ رشید احمد اس پروگرام کے انتظامی معاون ہیں۔

مدرسہ ڈسکورسز ممتاز مسلم اسکالر ڈاکٹر ابراہیم موسیٰ کا مرتب کردہ ایک تعلیمی پراجیکٹ ہے۔ڈاکٹر ابراہیم موسیٰ کا تعلق جنوبی افریقہ سے ہے۔وہ بھارت کے مختلف دینی اداروں کے علاوہ دار العلوم دیوبند میں زیر تعلیم رہے اور دار العلوم ندوۃ العلماء سے فارغ التحصیل ہیں۔آج کل نوٹرے ڈیم یونیورسٹی (انڈیانا، امریکا) کے کیو اسکول آف گلوبل افیئرز کے ذیلی ادارے Contending Modernities کے شریک منتظم (Co-director) ہیں اور اس پلیٹ فارم پر مسیحی ویہودی جدیدیت کے پہلو بہ پہلو اسلامی جدیدیت کے خط وخال کی توضیح میں مصروف کار ہیں۔اسلامی جدیدیت کا بنیادی نظریہ یہ ہے کہ جدیدیت نے انسانی تاریخ میں جو افکار واحوال پیدا کیے ہیں،ان کی ایک سے زائد تعبیرات ممکن ہیں۔جدیدیت کی مروج اور غالب تعبیر سیکولر جدیدیت کی ہے،لیکن اس کے متوازی ایسے سانچے بھی بنائے جاسکتے ہیں جو مختلف مذہبی روایتوں پر مبنی اور مذہبی افکار وعقائد سے ہم آہنگ ہوں۔نیز یہ کہ جدیدیت کی ان مختلف تعبیرات کے مابین مکالمہ بھی ممکن ہے۔مدرسہ ڈسکورسز اسی وسیع تر ہدف یعنی سیکولر جدیدیت کے متوازی مذہبی جدیدیت کی تشکیل اور جدیدیت کی مختلف تعبیرات کے مابین مکالمہ کی طرف پیش قدمی کا ایک حصہ ہے اور اس کا مقصد

برصغیر کے دینی مدارس کے فضلاء کو اس بحث میں شریک کرنا ہے۔

یہ سہ سالہ تعلیمی و تربیتی منصوبہ تاریخ، سائنس، فلسفہ اور اسلامی دینیات کے باہمی تعلق کو موضوع بناتا ہے اور اس کا بنیادی مقصد مدارس کے فضلا کے اندر تخلیقی فکر کی افزائش ہے تاکہ وہ اپنی روایت کو زندگی کی حقیقت اور مقصد کے تعلق سے وسیع انسانی اور بین تہذیبی مکالمے کا حصہ باور کر سکیں۔ وہ اس حقیقت کا ادراک کر سکیں کہ تاریخ کے مختلف مراحل میں اسلامی علمی روایت کی تشکیل تخلیقی فکر کے حامل علماء و مفکرین کے ذریعے ہوئی ہے جنھوں نے اپنے وقت کے ترقی یافتہ علمی و فکری ذرائع کو استعمال کرتے ہوئے معاصر افکار و رجحانات کے تناظر میں دینی حقائق کو سمجھنے اور ان کی تعبیر و تشریح کی کوشش کی۔ توقع کی جاتی ہے کہ اس کورس کی تکمیل کے ذریعے سے فضلائے مدارس میں اندر تخلیقی فکر پیدا ہو گی اور وہ معاصر افکار و رجحانات کو پیش نظر رکھتے ہوئے اسلامی فکر کی تشکیل و تعبیر میں مطلوب کردار ادا کر سکیں گے۔

آن لائن کلاسز اور تربیتی ورکشاپس

مطالعاتی مواد، تدریسی کلاسز اور تربیتی ورکشاپس میں مختلف طریقوں سے فضلائے مدارس کی انگریزی زبان کی استعداد کو اس سطح تک بلند کرنے کی کوشش کی جاتی ہے کہ وہ انگریزی میں علمی مواد تک رسائی حاصل کر سکیں اور انگریزی میں مختلف موضوعات کے اساتذہ اور اہل علم کے لیکچرز سے استفادہ کرنے کے ساتھ ساتھ حسب استعداد ابتدائی یا متوسط سطح پر زبانی یا تحریری طور پر مافی الضمیر کے اظہار کی صلاحیت پیدا کر سکیں۔

مدرسہ ڈسکورسز میں شرکاء کو دیگر مذہبی ثقافتوں سے تعلق رکھنے والے طلبہ واساتذہ کے ساتھ ملاقات اور تبادلہ خیال کے مواقع بطور خاص فراہم کیے جاتے ہیں تاکہ انھیں یہ سمجھنے میں آسانی ہو کہ فکری مسائل سادہ نہیں بلکہ پیچیدہ ہوتے ہیں اور مختلف طرح کے تاریخی سیاق میں مختلف اور متضاد استدلالات بھی قابل فہم ہوتے ہیں۔ نیز یہ کہ مختلف نظریات وعقائد رکھنے والے افراد تمام تر اختلافات کے باوجود مشترک طور پر انسانیت اور اچھائی کے اوصاف کے حامل ہو سکتے ہیں۔

اہداف ومقاصد اور توقعات

مدرسہ ڈسکورسز اسلامی فکر کے طلبہ کو دعوت دیتا ہے کہ وہ ذات باری، مذہبی متون، الہیات اور اخلاقیات سے متعلق روایتی مناہج استدلال کو فلسفہ، تاریخ، انسانی فطرت اور کائنات سے متعلق نئے علمی نظریات کے حوالے سے بروئے کار لائیں۔ کورس طلبہ کو چیلنجز اور سوالات کی طرف متوجہ کرتا ہے اور ان چیلنجز سے نبرد آزما ہونے کے لیے ممکنہ فکری وسائل فراہم کرنے کی کوشش ہے۔ نئے سوالات اٹھانے اور علمی وسائل کی فراہمی سے مقصود یہ نہیں کہ اس کے جواب میں کوئی ایک مخصوص اور متعین مذہبی فکر وجود میں لائی جائے، بلکہ مقصد یہ ہے کہ مذہبی علماء کے مابین علمی وفکری مباحث کی علمی سطح بلند ہو اور مسائل کی پیچیدگی کو سمجھتے ہوئے گہرے استدلال کے ساتھ مختلف اور متنوع عقلی ودینی مواقف پیش کر سکیں۔ ہماری توقع ہے کہ علماء کے انداز فکر میں مثبت تبدیلی مسلم معاشروں کے عمومی ذہنی وفکری اور اخلاقی رویوں میں بھی مطلوبہ تبدیلیوں کا ذریعہ اور محرک ثابت ہوگی۔

مدرسہ ڈسکورسز میں حساس اور نازک نوعیت رکھنے والے الہیاتی مباحث چھیڑے جاتے ہیں اور ان پر بہت ہی کھلے ماحول میں گفتگو ہوتی ہے۔ مدرسہ ڈسکورسز کا بنیادی مقصد ان مباحث پر کوئی فکری اجارہ داری قائم کرنا یا ایک فریق کے طور پر کوئی پوزیشن لینا نہیں، بلکہ دینی علوم کے مراکز کو متوجہ کرنا ہے کہ وہ ان مباحث کو سنجیدگی سے اعلیٰ علمی سطح پر اپنا موضوع بنائیں اور مباحث کو پورے مالہ وماعلیہ کے ساتھ سمجھ کر اپنی دینی وفکری ترجیحات کے مطابق علمی مواقف کی توضیح کے عمل کا حصہ بنیں۔ اس سیاق میں مدرسہ ڈسکورسز کی بنیادی حکمت عملی یہ ہے کہ سوالات کے کوئی متعین اور حتمی جوابات پیش کرنے کے بجائے روایتی مذہبی فکر کے وابستگان کو ان مباحث میں شرکت پر آمادہ کیا جائے جس کے نتیجے میں علم جدید کے سوالات کے تناظر میں اسی طرح ایک گہری علمی وعقلی روایت جڑ پکڑ سکے جیسی دور قدیم میں یونانی فلسفے کے سوالات ومباحث کے حوالے سے ہمارے متکلمین نے قائم کی تھی۔

مدرسہ ڈسکورسز کی بنیادی حکمت عملی یہ ہے کہ سوالات کے کوئی متعین اور حتمی جوابات پیش کرنے کے بجائے روایتی مذہبی فکر کے وابستگان کو ان مباحث میں شرکت پر آمادہ کیا جائے جس کے نتیجے میں علم جدید کے سوالات کے تناظر میں اسی طرح ایک گہری علمی و عقلی روایت جڑ پکڑ سکے جیسی دور قدیم میں یونانی فلسفے کے سوالات و مباحث کے حوالے سے ہمارے متکلمین نے قائم کی تھی۔

ان مباحث سے اعتنا اور ایک اعلیٰ علمی و عقلی ڈسکورس کو وجود میں لانا دینی لحاظ سے ایک فرض کفایہ کی حیثیت رکھتا ہے اور اس عمل میں کئی طرح کے عقلی رجحانات کا سامنے آنا اور کم و بیش اسی طرح کی ایک کلامی تقسیم کا پیدا ہونا ناگزیر ہے جیسی ہماری روایت میں مسلمان فلاسفہ، معتزلہ، اشاعرہ، ماتریدیہ اور سلفیہ کی صورت میں پیدا ہوئی۔ یہ تقسیم انسانی فکر کے رجحانات و میلانات کے لحاظ سے آفاقی ہے اور ہر کلامی روایت میں اس کا ظہور ناگزیر ہے۔ان میں سے ہر رجحان روایت کی مجموعی تشکیل میں ایک منفرد کردار ادا کرتا ہے،اس لیے ہر رجحان اپنی جگہ اہم اور افادیت کا حامل ہے۔

علم جدید کے چیلنج کا سامنا پوری فکری جرات کے ساتھ کرنا اس پرخطر راستے کا انتخاب کیے بغیر ممکن نہیں۔ اس وجہ سے مدرسہ ڈسکورسز میں مختلف کلامی پوزیشنز کے امکانات اور ان کے لیے میسر استدلالات تو زیر بحث لاتے ہیں، لیکن کسی ایک خاص پوزیشن کی ترویج پروگرام کا مقصد نہیں، اگرچہ مختلف اساتذہ یقیناً اپنے اپنے فکری رجحانات رکھتے ہیں اور وہ بحث و مباحثہ میں ظاہر بھی ہوتے ہیں۔ اس پلیٹ فارم کو ایک وسیع تر اور فکری تنوع رکھنے والی علمی روایت کا محرک بنانے کے لیے کوشش کی جاتی ہے کہ متنوع مذہبی رجحانات کے شرکاء اس کا حصہ بنیں تاکہ وہ اپنا اپنا دینی پس منظر اور اپنے اپنے فکری وسائل لے کر آئیں اور غور و فکر اور بحث و مباحثہ میں زیادہ وسعت اور گہرائی پیدا کرنے کا ذریعہ بنیں۔

اس ضمن میں ایک اہم اقدام مدرسہ ڈسکورسز کی طرف سے یہ کیا جا رہا ہے کہ مجوزہ نصاب کا پورا خاکہ، مطالعاتی مواد کی تفصیل، جہاں ممکن ہو، اس مواد کے آن لائن روابط اور مواد کی تدریس کے لیے مجوزہ ترتیب ایک مستقل ویب سائٹ پر اس طرح مہیا کی جا رہی ہے کہ جو حضرات اپنے طور پر ان مباحث کا مطالعہ کرنا چاہیں، وہ کر سکتے ہیں۔ اسی طرح مدارس یا جامعات جو اس کورس کی افادیت کو

محسوس کریں، وہ اس نصاب پر مبنی کورسز اپنے ہاں جاری کر سکتے ہیں اور اس میں حسب ضرورت حک واضافہ بھی کر سکتے ہیں، خاص طور پر جامعات کے شعبہ ہائے اسلامیات ایم فل اور پی ایچ ڈی کی سطح پر جبکہ دینی مدارس، تخصص کی سطح پر کورسز بنانے میں اس محنت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ان اہم ترین مباحث کے حوالے سے ایک اعلی علمی و عقلی روایت کی تشکیل میں اپنا کردار ادا کر سکتے ہیں۔

سال 2023ء کے چند نمایاں اقدامات

مذہبی سفارت کاری: انڈونیشیا کا دورہ

’مذہبی سفارت کاری پروگرام‘ کے تحت انڈونیشیا کی وزارت خارجہ کے تعاون سے ’انٹرنیشنل ریسرچ کونسل برائے مذہبی امور‘ کا ایک وفد 26 نومبر کو دس روزہ دورے کے لیے انڈونیشیا کے لیے روانہ ہوا، جہاں سیاسی و مذہبی تنظیموں اور ملک کے بڑے مذہبی اداروں کی نمائندہ شخصیات سے ملاقاتیں ہوئیں اور وہاں کے نظام کا جائزہ لیا گیا۔

Pakistan
Indonesia
Religious Diplomacy Program
Enhancing Understanding of Democracy and Religious Freedom in Muslim World
Pakistani Delegation Visit to Indonesia
International Research Council for Religious Affairs, Pakistan
EXIT

rs. FARKHANDA MANSOOR
HID UL HAQ

ISLAM
AND
DEMOCRACY

آزادی فیلوشپ پروگرام

'انٹرنیشنل ریسرچ کونسل برائے مذہبی امور' کے زیر اہتمام دعوہ اکیڈمی اسلام آباد میں انصاف، آزادی اور جمہوریت کے موضوع پر سات روزہ فیلوشپ پروگرام کا انعقاد کیا گیا جو 22 مئی سے 28 مئی تک جاری رہا۔ انٹرنیشنل ریسرچ کونسل برائے مذہبی امور نے پاکستان کی تاریخ میں پہلی بار بین الاقوامی معیار کے فیلوشپ کا انعقاد کیا جس میں خیبر پختونخوا اور سابقہ فاٹا سے تعلق رکھنے والے مختلف مکاتب فکر کے نوجوانوں نے شرکت کی۔ یہ فیلوشپ پروگرام 'آزادی فیلوشپ' کے نام سے منسوب کیا گیا۔

Azadi
Freedom

IRCRA
Azadi FELLOWSHIP

بین المذاہب افطار پروگرام

6اپریل کو ماہِ رمضان المبارک میں ایک بین المذاہب افطار پروگرام کا انعقاد کیا گیا، جس میں مختلف ممالک کے سفارت کار، سیاسی رہنماؤں، مذہبی اور سول سوسائٹی کی نمائندہ شخصیات نے شرکت کی۔

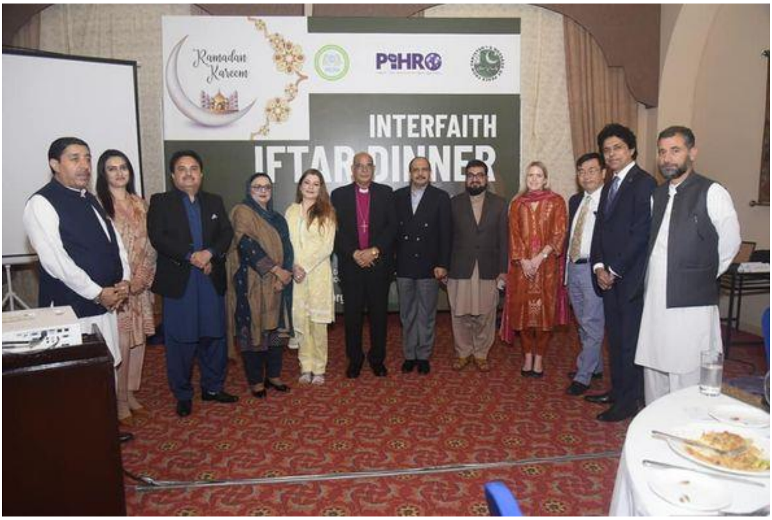

FAITH
NER
tel, Islamabad
April 5, 2023

- The First Muslim Education Scheme of the Pakistan Movement.. Dr. Ikram ul Haq 187
- Prevailing courses of comparative religions in Modern Universities and a New Initiative .... Shamsuddin Hassan Shigri 237
- The Need for Reevaluation of Islamic Studies Curriculum and Teaching Methods in Schools....... Editorial Team 250
- Curriculum and Education Reforms for Peace Promotion .... Editorial Team 256

Chapter: 5

The system of religious education in Pakistan

- Some ideological aspects related to religious education ....Dr. Maulana Ammar Khan Nasir 273
- The issues in Pakistani religious schools and the aspects of reform/ areas for improvement..... Saleem Mansoor 280
- The opinions of intellectuals regarding the curriculum of Dini Madaris........................Muhammad Israr Madani 296
- The religious beliefs and science education ....Dr. Mohsin Naqvi 305
- Opportunities for the Teaching of Scientific and Rational Sciences in Dini Madaris .... Editorial Team 312
- Shah Waliullah Oriental College: A model institution for religious and modern sciences where restrictions have been imposed ....Prof. Syed Muhammad Saleem 319
- Introduction and Objectives of Madrassa Discourses .... Hafiz Muhammad Rasheed 333

- Religious Institutions and Education in Tunisia and Egypt: A Comparative Analysis................. Shafique Mansoor 104
- The Role of Hawzas in Iran's Religious Scholarly Tradition..Mujtaba Ali Shaja'I 112
- Indonesian religious institutions and their role in the national mainstream .... Editorial Team 123
- Malaysia: The nature of religious education in a diverse society ....Rashad Bukhari 129
- The Bangladeshi Model of Religious Education ....Tahmeed Jan 137

Chapter: 3
Women's Religious Education: Trends and Experiences

- Women's Education in the Muslim World: In the perspective of Literacy and Societal Development .... Shafique Mansoor 147
- Religious seminaries and NGOs side by side in promoting women's education: A unique model of Bangladesh ....Rubab Zainab 155
- Women's Religious Education in Turkey: Trends and Contributions ....Bushra Ali 160
- Religious Schools and Women's Education in Indonesia: A Lesson for the Taliban .....Muhammad Niaz Asadullah 166
- Women's Education in Indonesia: Some Observations from the Visit to Indonesia .... Haya Hareem 170

Chapter: 4
Religious Education in Contemporary Institutions

- Religious Education in Pakistani Madrassas and Modern Universities: A Comparative Analysis with International Islamic Universities............. Maulana Dr. Nisar Akhtar 179

Table of Contents

- **Preface** .... Prof. Dr. Qibla Ayaz 7
- **Foreword**
  Muslim World, the 21st Century, and
  Religious Education .... Muhammad Israr Madani 11

Chapter: 1
Religious Education: Introduction and History

- The Beginning and Development of Religious Schools in Muslim History .... Editorial Team 19
- History of Islamic Education in the Subcontinent .... Dr. Qasim Zaman/Muhammad Jan Akhunzada 30
- The Educational System of the Muslim World and the Commencement of Reforms during the Colonial Era .... Muhammad Israr Madani 37
- The Rise of Colleges: Institutions of Learning in Islam and the West .... George Makdisi 49

Chapter: 2
Religious Education in the Muslim World

- Religious Education and Harmonized Curriculum in the Muslim World: Government Efforts for Minority Communities...................... Muhammad Israr Madani 55
- Saudi Arabia: Vision 2030 and Reforms in Religious Education.. Editorial Team 71
- The Rise and Characteristics of Religious Education in Modern Turkey .... Editorial Team 82
- Academic Specializations and Departments at Al-Azhar University........................ Hafiz Ghulam Anwar Azhari 91

The Muslim World and Religious Education

Trends and Reforms

Abstract

The third issue of the annual journal "Tahqiqaat" carries significant research articles explaining the state of religious education in the 21st century within the Muslim world. The contributing scholars have examined crucial aspects of religious education, from historical perspectives to contemporary situation and trends, to reform strategies adopted by different Muslim countries.

The publication encourages and promotes informed discussions within diverse Muslim religious and ethnic communities and makes valuable recommendations for religious institutions [madaris] in the overall context of educational development in the modern world. The question of educational reforms has been thoroughly explored by reviewing the reform efforts taken in different regions and signifying the need for an evolutionary and futuristic approach. The articles included in this special issue of 'Tahqiqaat' create a nuanced understanding of specific and general contexts with a comparative analysis of religious education in the contemporary world. The articles also respond to the questions asked with regard to spreading fundamentalism and extremism, the issue of women's education, need for the preservation of transmitted knowledge and continuity of the tradition to solidify the true Islamic character, if there is one.

This special edition also focuses on religious education development in Middle East, South Asia, South East Asia and other Muslim majority areas. Detailed reviews of successful models of religious education are presented, along with discussions regarding incorporating minorities and marginalized groups in the religious education, with an exploration of the initiatives taken. We hope that this special edition of 'Tahqiqaat' will be a valuable resource for our esteemed readers.

اس شمارے میں

مسلم دنیا اور مذہبی تعلیم کے موضوع پر اس شمارے میں مذہبی تعلیم کے مختلف پہلوؤں کا جائزہ لیا گیا ہے۔ مسلم دنیا کے متنوع مناہج، نصاب اور اصول تدریس کے ساتھ حالات اور زمانے کے بدلتے ہوئے رجحانات و اصلاحاتی مساعی کو موضوع بحث بنایا گیا ہے۔اس کے ساتھ مذہبی تعلیم کے حوالے سے مختلف مسلم ریاستوں کی پالیسوں سمیت ان کے رویے اور اقدامات پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔اس ضخیم شمارے میں پرانے موضوعات کے ساتھ کئی نئی جہات پر کام کرنے کی کوشش بھی ہے، خصوصا عملی سطح پر جو تعلیمی پہلو زیادہ اہم اور ناگزیر ہیں، ان پر خاص توجہ دی گئی ہے۔جیساکہ مذہبی تعلیم کا شرح خواندگی اور ترقی کے ساتھ تعلق،خواتین کی مذہبی تعلیم کے مناہج و اثرات،مذہبی تعلیم کے نصاب میں اقلیتی و پسماندہ طبقات کے لیے فکری بیداری، تعلیم کے ذریعے مقامی تنازعات کو حل کرنے کے لیے کاوشیں اور مذہبی تعلیم کا سماجی ہم آہنگی ، کردار سازی اور امن کاری، ایسے پہلو ہیں کہ پاکستان سمیت مسلم دنیا کے تناظر میں ان کی بہت اہمیت ہے۔اس تعلیمی نظام کے اثرات اور مروجہ طریقہ کار سے جو ذہن سازی ہوتی ہے وہ ایک معاشرتی چیلنج ہے۔اس لیے تعلیم کے اس مخصوص رجحان کا تجزیہ کرنا اور وقت کے ساتھ اس پر نظرثانی ہونا انتہائی ضروری ہے۔

پاکستان میں مذہبی تعلیم پر عمومی بحث یا نظرثانی کی جو کوشش ہوتی ہے وہ انتہائی محدود تناظر میں یا عموماً نصاب کی حد تک ہوتی ہے جبکہ مذہبی تعلیم سے متعلق بحث کا جامع اور وسیع تناظر مفقود ہوتا ہے۔

مسلم دنیا کے تناظر میں اس بحث کا مقصد ارباب فکر کو اس طرف توجہ دلانا بھی ہے کہ مسلم دنیا جدید چیلنجز کو سامنے رکھ کر کن اصلاحاتی عمل سے گزر رہی ہے۔ جس کے ذریعے وہ ترقی یافتہ ہونے کے ساتھ ساتھ اپنی مضبوط مذہبی اور قومی ساخت بھی قائم کر رہے ہیں۔

ضروری نہیں کہ باقی دنیا کا نظام من و عن قبول کیا جائے لیکن تجربات سے استفادہ کرنے کی اہمیت سے انکار نہیں کیاجاسکتا۔یہ غور کرنا چاہیے کہ باقی مسلم ممالک کے مناہج نے معاشرے پر کیا اثرات مرتب کیے،وہ اپنے مقامی تنازعات و مسائل کو بھی کس طرح جزوی طور پہ مذہبی تعلیم کا موضوع بنارہے ہیں۔خصوصا نوجوانوں کی ذہنی تشکیل اور ان کے مسائل کی حساسیت کواس ضمن میں کیسے سنجیدہ لیا جا رہا ہے۔

ہمارے مخاطب صرف اہل مدارس نہیں ہیں،بلکہ مذہبی تعلیم اور اس سے جڑے سب ادارے ہیں، چاہے وہ ریاستی شکل کے ہوں یا نجی نوعیت کے۔

اس مشکل اور حساس موضوع پر بلاشبہ مزید بہت سا کام کرنا باقی ہے۔امید ہے کہ اردو زبان میں یہ اپنی نوعیت کا پہلا مجموعہ ہوگا۔

SPECIAL EDITION

YEARLY ISLAMABAD

TAHQIQAAT

2023

3

MULIM WORLD

AND

RELIGIOUS EDUCATION

Trends and Reforms

تحقیقات

TAHQIQAAT.PK

INTERNATIONAL RESEARCH COUNCIL FOR RELIGIOUS AFFAIRS

IRCRA Publications

+92 311 02 99 995, +92 51 22 25 650
Islamabad, Pakistan

ircra.org IRCRA ircra3 IRCRA3